تحقیقی اور تخلیقی ادب کا ترجمان

سہ ماہی

عالمی فلک

گوشۂ ڈاکٹر ثروت خان

مدیر
احمد نشار

معاون مدیر
آفرین فاطمہ

سہ ماہی ۔ کتابی سلسلہ۔۵

جلد : ۲ شمارہ : ۵

اکتوبر تا دسمبر ۲۰۲۱ء

ISBN 978-81-947181-2-3

مدیر : احمد نثار

معاون مدیر : آفرین فاطمہ

e-mail : aalamifalak@gmail.com
Contact No. : 8409242211

خط و کتابت اور ترسیلِ زر کا پتہ :

عالمی فلک، کڈس کیمپس، محمد علی روڈ، سیٹی کالونی، پوسٹ 'بی' پولی ٹیکنک، ضلع دھنباد، جھارکھنڈ-828130 (ہندوستان)
Aalami Falak, Kids Campus, Mohammad Ali Road, City Colony
Post : 'B' Polytechnic, Dhanbad, Jharkhand--828130 (India)

ازراہِ کرم چیک یا بینک ڈرافٹ پر صرف Aalami Falak ہی لکھیں۔
Uco Bank, Branch Code : 000997 (Bhuli Branch)
A/c. No. : 09970210001349
IFSC Code : UCBA0000997 (For Money Transfer within India)
MICR Code : 826028008
SWIFT Code : UCBAINBB (For International Banking)
GooglePay, PhonePe : 8409242211

رقم ٹرانسفر کرنے کے بعد درج ذیل وہاٹس ایپ نمبر پر اپنا مکمل پتہ اور موبائل نمبر ضرور ارسال کریں۔

وہاٹس ایپ نمبر : 8409242211

AALAMI FALAK

Urdu Book Series - **5**

October to December - 2021

ISBN 978-81-947181-2-3

Editor : **Ahmad Nesar** (8409242211)

Sub-Editor : **Aafreen Fatma**

اشاعت	:	اکتوبر تا دسمبر ۲۰۲۱	
ہندوستان	:	زرِ تعاون فی شمارہ	چار شمارے (رجسٹرڈ ڈاک سے)
		-/300 روپے	-/1200 روپے
امریکہ	:	45 ڈالر	180 ڈالر
برطانیہ	:	15 پونڈ	60 پونڈ
سعودی عرب	:	60 ریال	240 ریال
عرب امارات	:	60 درہم	240 درہم
یورپ	:	12 یورو	48 یورو

خصوصی معاونین/ادارہ جات سے دو ہزار روپے (سالانہ)

کمپوزنگ : پرنٹ ہٹ، واسع پور، بھولی روڈ، دھنباد، جھارکھنڈ-826001

موبائل : 9852391575

طباعت : مرکزی پبلی کیشنز، نئی دہلی۔۲۵

- عالمی فلک کے مشمولات سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔
- عالمی فلک سے متعلق تنازعات کی قانونی چارہ جوئی صرف دھنباد کی ہی عدالتوں میں کی جا سکتی ہے۔
- عالمی فلک ایک ادبی اور غیر کاروباری رسالہ ہے جس سے منسلک افراد بغیر معاوضہ کے اپنی خدمات انجام دیتے ہیں۔
- ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر، نثار احمد نے مرکزی پبلی کیشنز، نئی دہلی۔۲۵ سے چھپوا کر محمد علی روڈ، سیٹی کالونی،
- دھنباد-828130 سے شائع کیا۔

مشمولات

گوشۂ ڈاکٹر ثروت خان

مضامین

فکشن

منظومات

طنز و مزاح

اور زبانوں کا ادب

مضمون

کہانی

فارسی غزل

نظمیں

تبصرے

مکتوبات

حمد باری تعالیٰ

افتخار عارف

حجابِ شب میں تب و تابِ خواب رکھتا ہے
دُرونِ خواب ہزار آفتاب رکھتا ہے
کبھی خزاں میں کھلاتا ہے رنگ رنگ کے پھول
کبھی بہار کو بے رنگ و آب رکھتا ہے
کبھی زمین کا منصب بلند کرتا ہے
کبھی اسی پہ بنائے عذاب رکھتا ہے
کبھی یہ کہتا ہے سورج ہے روشنی پہ گواہ
کبھی اسی پہ دلیلِ حجاب رکھتا ہے
کبھی فغاں کی طرح رئیگاں اثاثۂ حرف
کبھی دعا کی طرح مستجاب رکھتا ہے
کبھی برستے ہوئے بادلوں میں پیاس ہی پیاس
کبھی سراب میں تاثیرِ آب رکھتا ہے
بشارتوں کی زمینیں جب آگ اُگلتی ہیں
اس آگ ہی میں گُلِ انقلاب رکھتا ہے
میں جب بھی صبح کا انکار کرنے لگتا ہوں
تو کوئی دل میں مرے آفتاب رکھتا ہے
سوال اٹھانے کی توفیق بھی اسی کی عطا
سوال ہی میں جو سارے جواب رکھتا ہے
میں صابروں کے قبیلے سے ہوں مگر میرا رب
وہ محتسب ہے کہ سارے حساب رکھتا ہے

ہدیۂ نعت

عزیز بلگامی

موبائل نمبر: 9845291581

ایک سَمت کرم والے ، ایک سَمت ستم والے
توحید کی دعوت پر برہم تھے صنم والے

اُمّی کا لقب لے کر اُمّت کی قیادت کی
حیران ہیں ششدر ہیں قرطاس و قلم والے

کہسارِ یتیمی سے ٹکرا کے بکھرنا تھا
مضبوط اگرچہ تھے سب جاہ و حشم والے

تابندہ عقیدے کی تلوار تھی ہاتھوں میں
ٹکرا گئے باطل سے یوں خالی شکم والے

گر اہلِ عرب سن لیں، ممکن ہے تڑپ جائیں
وہ ڈوب کے پڑھتے ہیں ہم نعت عجم والے

اک نعت عزیزؔ اب کے ، محشر میں سنانی ہے
محرومِ سماعت ہوں کیوں باغِ اِرم والے

اداریہ

سہ ماہی ’عالمی فلک‘ کا پانچواں شمارہ اس وقت جب آپ کے ہاتھوں میں ہے ہمیں خوشی ہو رہی ہے کہ ہم نے اپنے جریدے کی اشاعت کا ایک سال مکمل کرلیا ہے۔اس دوران ہم بے شمار تجربات و مشاہدات سے گزرے جو تلخ بھی رہے اور شیریں بھی۔اگر ایک طرف معیاری رشحات کی دستیابی، لاک ڈاؤن کے سبب آمد و رفت اور رسل و رسائل میں تعطل، وقتِ مقررہ پر ہر شمارے کی اشاعت کے علاوہ مالی وسائل تک رسائی جیسے مسائل ہمارے پیشِ نظر رہے تو دوسری طرف ہمارے ادیبوں اور لکھاریوں کا تعاون اور قارئین ادب کی داد و تحسین ہماری حوصلہ افزائی میں معاون بھی ہوئی۔لیکن ان دشواریوں اور خوشگوار تجربات سے قطع نظر جو بات ہمارے لیے فکر کا باعث ہے وہ ملک میں اردو کے قاری کی گھٹتی ہوئی تعداد ہے۔جب کہ واقعہ یہ ہے کہ کسی رسالے کے وجود اور کامیابی کا دارومدار اس کے قاری کی دلچسپی اور ذوق پر ہی منحصر ہوتا ہے۔بظاہر اردو بہار اور جھارکھنڈ کی دوسری سرکاری زبان ہے لیکن اسکولوں اور کالجوں میں اردو کے طلباء کی تعداد میں جو گراوٹ دیکھی جارہی ہے وہ خوش آئند قطعی نہیں کہی جاسکتی۔نئے تعلیمی نظام میں مادری زبان کی تدریس کے حوالے سے جو ہدایت نامہ جاری کیا گیا ہے وہ دھیرے دھیرے اردو کے خاتمے کی راہ ہموار کرے گا۔جب سرکاری اسکولوں میں اردو کی یہ حیثیت ہوگی تو پرائیویٹ اسکولوں کا کیا پوچھنا۔اس وقت بھی شمالی ہند کے تمام پرائیویٹ اسکولوں میں جہاں انگریزی اور ہندی کی تعلیم لازمی قرار دی گئی ہے اردو کی تعلیم کا کوئی نظم نہیں ہے۔کالجوں سے بھی شکایتیں موصول ہو رہی ہیں کہ اردو کے طلباء کی ایک قابلِ لحاظ تعداد اگر داخلہ نہیں لیتی تو اردو کا شعبہ بند کیا جاسکتا ہے۔

یہ واقعہ ہے کہ بہار اور جھارکھنڈ میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے لیکن عملی طور پر یہ اب بھی کاغذی خانہ پُری تک ہی محدود ہے۔اردو ملک کے بے شمار لوگوں کی مادری زبان ہے یہ حقیقت ہے۔لیکن اردو دشمنوں کی طرف سے اسے محض مسلمانوں کی زبان ہونے کی دانستہ تشہیر کی جاتی رہی ہے تا کہ قومی سطح پر اس کے عملی نفاذ کی راہ کو مسدود کیا جاسکے۔بدقسمتی سے مسلمانوں کا ایک تنگ نظر حلقہ بھی اس نظریے کی تبلیغ و اشاعت میں پیش پیش رہا ہے۔اردو بلاشبہ ایک شیریں زبان ہے۔اس کی سحر انگیزی کے قائل ہمارے وہ پارلیمانی اراکین بھی ہیں جو پارلیامنٹ میں اپنی تقریروں میں اردو کے اشعار پڑھ کر سامعین سے داد و تحسین وصول کرتے ہوئے فخر محسوس کرتے ہیں۔لیکن وہ بھی اسے مسلمانوں کی ہی زبان سمجھتے ہیں۔تاہم ہمیں سمجھنا ہوگا کہ محض مسلمانوں کی

زبان ہو کر اردو سرکاری زبان نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا عملی طور پر اس کے سرکاری زبان ہونے کے لیے مسلمانوں کی زبان کے لیبل سے نجات حاصل کرنا ضروری ہے۔ اور یہ تب ہی ممکن ہے جب ہندی کی طرح ہی بلا تخصیص مذہب و ملت عام لوگوں تک اردو کی رسائی لازمی بنائی جائے۔ اس وقت ضرورت اس بات کی ہے کہ دوسری سرکاری زبان کے طور پر اس کی تعلیم تمام اسکولوں میں پرائمری سطح سے بلا تخصیص مذہب و ملت لازمی قرار دی جائے نیز ایک مخصوص مدت کے لیے سرکاری ملازمتوں میں اردو جاننے والوں کو ترجیح حاصل ہو۔ جس کا اس وقت کوئی امکان نظر نہیں آتا۔ ایسی صورت میں کسی اردو رسالے کی اشاعت کا کام مالی منفعت کی بجائے خونِ دل جلائے جانے کے مترادف ہے۔ جو ہوش والے کی بجائے کوئی جنونی ہی کر سکتا ہے۔ ان حالات میں بہتر سے بہتر رسالے میں بعض خامیوں اور کمیوں سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ شاید رسالوں میں کمیاں اور خامیاں تلاش کرنے والوں کے پیش نظر یہ حقائق نہیں ہوتے۔ پھر بھی صحت مند تنقید کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کسی رسالے کے معیار کو قائم کرنے اور اسے برقرار رکھنے کے لیے وقت اور تجربے کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور وہ ماحول اور فضا بھی جو شعر و ادب کے مطالعے کا ذوق پیدا کر کے قارئین کی کثیر تعداد کو مطالعے کی طرف راغب کر سکے۔ ایک اچھے رسالے کی یہ خوبی ہوتی ہے کہ وہ اس مقصد کی تکمیل میں سنجیدگی سے ہاتھ بٹائے۔

زیرِ نظر شمارے میں معروف افسانہ نگار ڈاکٹر ثروت خان پر ایک گوشہ شامل کرتے ہوئے ہمیں مسرت ہو رہی ہے۔ ثروت خان اردو کی معروف خواتین افسانہ نگار ہیں جو عصری معاشرتی زندگی کے حوالے سے خواتین کے ردِ عمل اور نفسیات کی ترجمانی کرتی رہی ہیں۔ اس حوالے سے اُن کی شخصیت و فن پر اصحابِ قلم کے تاثرات و خیالات کی اہمیت بھی ہم پر روشن ہوتی ہے۔ چنانچہ ان پر جو مضامین ہمیں اب تک موصول ہو سکے ہم نے انھیں شاملِ اشاعت کرنے کی سعی کی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ قارئین کرام انھیں پسند کریں گے اور اپنی رائے سے آگاہ کریں گے۔

ہم اپنے قارئین کا ایک بار پھر شکریہ ادا کرتے ہوئے ان کے گوش گذار کرنا چاہیں گے کہ 'عالمی فلک' صرف اُن کے ذوقِ مطالعہ اور مالی تعاون سے ہی زندہ رہ سکتا ہے۔

احمد نثار

گوشۂ ڈاکٹر ثروت خان

ثروت خان سے ڈاکٹر نثار احمد فاروقی کی بات چیت

ڈاکٹر نثار احمد فاروقی

س: اپنی زندگی کے ذاتی وادبی کوائف بتائیں؟

ج: خاندان: میرا تعلق، افغانستان کے بُنیر علاقے سے علاؤالدین خلجی کے دور میں سنبھل (یوپی) محلّہ سرائے ترین میں آکر مقیم ہوگئے سالارزئی قبیلے سے ہے۔ میرے اجداد، امیؔر خاں (۱۷۶۸ء تا ۱۸۳۴ء) بانئ ریاست ٹونک (راجستھان) تھے۔ میرے جدِ امجد دلیؔل خاں، امیر خاں کے بڑے بہنوئی تھے۔ دلیؔل خاں سنبھل کے زمیندار تھے۔ سنبھل کے سرائے ترین محلے میں آج بھی ہماری حویلی ہے جو میرے پردادا صاحبزادہ محمود علی خاں (جاگیردار کرودیہ، پاٹن، ضلع جھالاواڑ) نے کامداروں کو رہنے کے لئے دے دی ہے۔ پردادا صاحبزادہ محمود علی خاں محمؔود کی طبیعت میں موزونیت تھی۔ کلام پختہ تھا۔ سیمابؔ، جگر صاحب کا گھر آنا جانا رہتا تھا۔ جگر صاحب کا قیام تو سنبھل ہاؤس میں ہی رہتا تھا۔ زمینداری، نہرو جی کی زرئی اصلاحات کی وجہ سے ختم ہوگئی تھی۔ بانئ ریاست ٹونک، نواب امیؔر خاں کے ہمراہ دلیؔل خاں بھی ٹونک آ گئے تھے۔ چوتھے نواب، نواب سعادت علی خاں میرے پرنانا تھے۔ ان کی بہن میرے پردادا صاحبزادہ محمود علی خاں کے گھر میں تھیں۔ ہمارا پورا خاندان اب تک ٹونک میں ہی مقیم ہے، جہاں ہمیں "سنبھل والوں" کے نام سے جانا جاتا ہے۔ میرے دادا صاحبزادہ محبت علی خاں محبتؔ بھی شعر کہتے تھے۔ کلام اپنے بہنوئی ساحلؔ ٹونکی کو دکھاتے تھے۔ یہ وہی ساحلؔ ٹونکی ہیں جو اخترؔ شیرانی کے جگری دوستوں میں سے تھے۔ جب ساحلؔ ٹونک سے لاہور آگئے تو اخترؔ نے ساحلؔ سے مخاطب ہوکر اپنی شاہکار نظم "او دیس سے آنے والے بتا، کس حال میں ہیں یارانِ وطن، لکھی تھی۔ میرے والدِ محترم جناب ثروت علی خاں ہیں (ہمارے خاندان میں پہلا پال لڑکی

ہوتی ہے تو خوشی میں باپ کے نام پر نام رکھ دینے کا رواج رہا ہے۔ چنانچہ میرے والد کے نام پر میرا نام ثروت النساء رکھ دیا گیا تھا۔) اور یہ رکھا تھا روس، امریکہ میں رہے پاکستان کے سابق صفیر سلطان محمد خاں کے بڑے بھائی سلطان حامد خاں جو میرے دادا جان کے چچا زاد بھائی تھے انہوں نے سلطان محمد خان کی کراچی میں سکونت تھی۔ کراچی ہی میں گلنار آفریں بھی رہتی ہیں جو وہاں کی انقلابی شاعرہ (بقول محمد علی صدیقی) ہیں۔ وہ صاحبزادہ متین اللہ واثق صاحب کی دختر ہیں۔ واثق ٹونکی بھی ہمارے قریبی عزیزوں میں سے تھے۔ گلنا آفریں اور سلطان محمد خاں، دونوں سے ملاقات کی تھی، جب میں ہندوستانی دفد کے ہمراہ پاکستان گئی تھی، سجاد ظہیر کی صد سالہ سالگرہ کے موقع پر ۲۰۰۵ء میں۔ (سلطان محمد خاں کا اب انتقال ہو چکا ہے) بہر حال میرے والد ثروت علی خاں ''اکاؤنٹ آفیسر' سے سبکدوش ہوئے تھے عربی، فارسی، انگریزی اور اردو کے عالم تھے۔ تاریخ اور شاعری میں مخصوص دلچسپی تھی اور غضب کی ناک تھی۔ میرے والد نے ''امیر خاں اور ان کے حالات'' کتاب کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ NCPUL نے اسے شائع کیا ہے۔ والدہ سلیم النساء عربی اور اردو ہندی زبانیں جانتی ہیں۔ میلاد شریف کی ''نثر'' اپنے مخصوص لہجہ اور قرأت میں اس طرح پڑھتی ہیں کہ محفل پر روحانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ میں نے بچپن سے انہیں غریبوں، بے سہارا اور ضعیف لوگوں کی ہر طرح سے مدد کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ بہت چپکے سے یہ کام کرتی ہیں۔ لاوارث میت کو غسل دینا ان کا پسندیدہ شغل ہے۔ ناول بہت پڑھتی ہیں اور ''پاکیزہ آنچل'' کی بہترین قاری ہیں۔ آج کی اردو تحریروں کے لئے بے اطمینانی جتاتے ہوئے کہتی ہیں۔ ''جیسے سمجھنے والے ہیں، ویسے ہی لکھنے والے'' اور ناگواری کا سامنہ بنا کر پان لگانے لگتی ہیں۔ میں ان کے جملے پر غور کرتی رہ جاتی ہوں۔ میری شادی ۱۹۷۷ء میں، جب میں گیارہویں کلاس میں (سائنس کی طالبہ) تھی، جودھپور کے کرنل فتح محمد خاں کے پوتے امداد اللہ خاں سے کر دی گئی۔ مردانہ حسن سے پُر میرے شوہر نے مجھے علم کی دولت سے بھر پور نوازا M.Phil,PH.D تک پڑھوایا۔ راجستھان کے سابق وزیر اعلیٰ مرحوم برکت اللہ خاں رشتے میں میرے چچا سسر تھے۔ جودھپور کے دربار نے کرنل فتح محمد خاں کو رامپور سے بلایا تھا اور فوج کی کمان سونپی تھی۔ اودے پور ہماری رہائش گاہ اس لئے رہی کہ یہاں معاش کے ساتھ خوبصورت مناظر اور جھیلیں ہیں۔ اس خوبصورت شہر نے من موہ لیا۔ اس لئے یہیں

۴۰/ برسوں سے مقیم ہیں۔ ہمارے ایک بیٹی اور ایک بیٹا ہے بڑی بیٹی صباناز نے بینکنگ میں PH.D کی ہے۔ شادی جے پور سید گھرانے میں ہوئی ہے۔بیٹاعمران خاں ہے۔ انہوں نے .I.I.M کلکتہ سے ایم۔بی۔اے کیا ہے اور ICICI میں ریجنل چیف منیجر کے عہدے پر فائز ہیں۔درس وتدریس میرا پیشہ ہے۔یہاں گورنمنٹ میرآ گرلس کالج میں شعبۂ اردو میں ایسوسیٹ پروفیسر ہوں۔شوہر ایک فرم میں مارکیٹنگ منیجر کے عہدے پر ہیں۔گھر اور نوکری سے وقت نکال کر ادبی سرگرمیوں،سوشل ورک (دیہات) میں مشغول رہتی ہوں۔اودے پور کے قلمکاروں کی ایک انجمن ''ادبی سنگم'' کی صدر ہوں۔ماہ میں دوتین نشستیں اس انجمن کے زیرِاہتمام کرائی جاتی ہیں۔انجمن ترقی اردو،اودے پور کی صدر ہوں۔ ہربرس اس بینر کے باہم 45 دن کا ورک شاپ کرتی ہوں جس میں اہلِ اودے پور کو بغیر کسی فیس کے اردو پڑھاتی ہوں۔اب تک 86 لوگوں کو اردو زبان سکھا چکی ہوں۔سوشل ورک سے خوش ہوکر راجستھان کی صوبائی حکومت نے "Best Programme Officer 2002" کا ایورڈ بھی دیا ہے۔لائنس کلب نے بلڈ ڈونیشن کے کنٹریبوشن کے عیوض اعزاز سے نوازا ہے۔اودے پور کی ہی ایک تنظیم ''تعمیر سوسائٹی'' نے سرسید ایوارڈ'' اور یہاں کی دوسری سنستھا نے ''کتھاشرومنی'' کے لقب سے نوازا ہے۔اس کے علاوہ APWA کیا صوبائی سطح کی جوائنٹ (راجستھان) سکریٹری کے لئے بھی انتخاب کیا گیا ہے۔اردو کے نیشنل،انٹرنیشنل سیمیناروں میں شرکت کرچکی ہوں۔تقریباً 55 ریسرچ پیپر شائع ہوچکے ہیں۔ارتقاء سرخ پرچم (کراچی) جدید ادب (جرمنی) صدا (لندن) شہرزاد(لندن)، نیاورق، نیاسفر،آج کل، ایوانِ اردو، ادب ساز، انشاء،شاعر، فکروتحقیق (NCPUL) نخلستان (جے پور) جرنل (APRI TONK)، جرنل خدا بخش لائبریری (پٹنہ)،جرنل راجستھان یونیورسٹی، جے پور وغیرہ میں کہانیاں،مضامین شائع ہوتے ہیں۔پہلی کہانی ''سمرپن'' کے نام سے علی گڑھ میں ایک ریفریشر کورس کے دوران لکھی۔2001ء میں پہلی کہانی ''شکست وریخت'' نخلستان (جے پور) میں شائع ہوئی۔راجستھان اردو اکادمی جے پور نے اردو نثر کی خدمت کے لئے ''مولانا احترام الدین شاغل ایورڈ'' سے نوازا ہے۔اسی برس بہار اردو اکادمی پٹنہ نے میرے ناول ''اندھیرا پگ'' پر ایوارڈ دیا ہے۔

س: جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے نام پر جو کہانیاں، شاعری ہو رہی ہے، اس سے آپ کہاں تک متفق ہیں؟

ج: میں سمجھتی ہوں کہ دورِ حاضر کا تخلیق کار کسی اِزم کو لے کر نہیں چل رہا۔ وہ اس سے پرے ہے۔ ماضی میں اس طرح کے رجحانات اور روشوں کے زیرِ اثر جو ادب رچا گیا ....وہ وقت کا تقاضہ تھا.........لیکن آج یکسر صورت حال اور معنی بدل گئے ہیں۔ ادبی فضاء کو تعمیر کرنے میں، ادیب، شاعر، فکشن نگاری کو مرکزیت حاصل ہے۔ عہد ساز بننے کی حرکتوں کا پردہ فاش ہو گیا ہے۔ اور ویسے بھی آج ہم گلوبل ولیج میں سمٹ گئے ہیں۔ مغرب کی پرانی دھرائی تھیوریز اور نظریوں پر بحث کر کے، ہمارے مشرقی تقاضے کیا پورے ہو سکیں گے۔ سروکار سب سے رکھنا چاہیے اور ہے بھی ....لیکن ہماری زندگی، معاشرہ، کلچر، تہذیب و تمدن اور انسانی رشتوں کی بنت ....مغرب سے بالکل علیحدہ ہے۔ اس لئے ہمارے تقاضے، ہماری فکر، ہمارے مسائل، ہماری زمینی حقیقتیں، ہمارے ادب میں جلوہ گر ہیں۔ ہمارا ادب اس کی ترجمانی کرتا ہے۔ نقاد ہے جو اِدھر اُدھر جھانکتا ہے، جھانکتا ہے، جھانکنا بھی چاہیے...... عالمی منظرنامہ پر جب تخلیق کار کی جذباتی اور حساس فکر منڈراتی رہتی ہے، معائنہ کرتی رہتی ہے، تو نقاد جب تک اس فکر کا پارکھی نہیں ہوگا، اسے جانے گا کیسے؟ پہچانے گا کیسے؟ اس لئے یہاں نقاد کی ذمہ داریاں بہت بڑھ جاتی ہیں.....لیکن پھر کہتی ہوں کہ اصل تخلیق کار کبھی کسی دباؤ میں آکر تخلیق کر ہی نہیں سکتا۔ جو کرتے ہیں، ان کی چغلی ان کا فن کر دیتا ہے، جس میں اسٹرکچر تو جیسے تیسے تعمیر ہو جاتا ہے، لیکن تاثیر کا فقدان ایسے ہوتا ہے جیسے بغیر کساؤ کا ڈھول، جو ڈھم ڈھم بج کر ٹوٹ جاتا ہے۔

لیکن کسے ہوئے ڈھول کی تھاپ کی کھنک وہ اُمنگ جگاتی ہے کہ کب سحر ہو جاتی ہے، پتہ ہی نہیں چلتا۔ ایسے باکمال قلم کار کلاسکیت، ترقی پسندی اور جدیدیت، اور پھر دیگر نظریات سب کا پاس رکھتے ہوئے تمام مشاہدات اور تجربات کو اپنے لاشعور کا حصہ بنا کر، عصری حسیت اور فنی رچاؤ کے باہمی اشتراک سے استحصال اور ناانصافی کے خلاف اپنے قلم کو سرگرم رکھتے ہیں ....انسانیت کی بقا کی فکر کی آنچ میں تپتے ہیں اور اس تپش سے جب تک کورے کاغذ کو رنگ نہیں دیتے، انہیں نہ تو چین پڑتا ہے اور نہ ہی دنیا کی خبر ہوتی ہے..........اب بھلا تخلیق کے اس پیچیدہ اور نازک عمل میں ذہن

میں کسی ازم کا گزر کیسے ہوسکتا ہے.......... ممکن ہی نہیں آمداورآورد کاامتیاز یہیں پر ظاہر ہوجاتا ہے۔پھر کیوں ہم ادب پر لیبل لگاتے رہتے ہیں.......... یہ ترقی پسندی، جدیدیت ،مابعد جدیدیت اب مجھے پرانا فیشن لگتا ہے۔بچپن سے سُنتی آرہی ہوں۔ ہمارے دوراورآنے والے دور کے ادیب ان چیزوں سے واقعی بیزار ہوگئے ہیں۔یہ اور بات ہے کہ جتنی باتیں میں نے آپ سے کی ہیں ان میں کم وبیش ان تمام نظریات، رجحانات کی تمام مثبت فکر سمائی ہوئی ہے۔جو تخلیق کار ہونے کے ناطے فطری ہے۔لادی ہوئی، تھوپی ہوئی نہیں ہے..........Creation اس آلودگی سے پاک ہوتا ہے.......... آلودگی سے مراد ادب کی فرقہ واریت ہے۔خانوں کی تقسیم.......... میرؔ و غالب کے زمانے میں ادب پر اس طرح کے لیبل لگادیئے ہوتے تو پکڑ کر مارتے اور اب بھی خیر نہیں.......... اگر جنت میں انہیں ازم کا راگ الاپنے والے کہیں نظر آگئے تو ہڈی بھی نہیں ملے گی۔

یہ تو ہوا میرا غم وغصہ.......... ادب کو لے کر میرے دل میں جو مثبت پہلو ہے وہ اس کی Positive thinking کو لے کر ہے دراصل یہ جذبات اس کی ترجمانی کرتے ہیں۔لیکن حقیقت اس کے برعکس نہیں تو قریب ضرور ہے۔بنیادی بات یہ ہے کہ تخلیق کار پر کسی نہ کسی نظریے کا اثر اس وقت پڑتا ہے جب اس کی اس سے ذہنی مناسبت ہوتی ہے۔ہر رجحان نے چار پانچ تخلیق کاروں کو اپنی طرف کھینچا ہے۔انہیں میں سے آج کچھ باقی ہیں۔اور یہی اثر ایک تخلیق کار کو دوسرے سے الگ بھی کرتا ہے۔تحریکات نے ٹھپا لگا کر شناخت بتانے والے تخلیق کار خلق کئے۔اوراسی شناخت کی بنیاد پر وہ رومان پسند، ترقی پسند کہلائے.......... علامت پسند، اشکال پسند، ابہام پسند کہلائے۔ جدیدیت میں بلراج مینرا کے افسانے لے لیجئے۔ دراصل ہے تو علامتوں کا Universal Fenamina ہے۔ جب علامتی نظام آیا.......... فرانس میں، انگلینڈ میں اور بھی جگہ.......... قاری کو ابہام اتنا مشکل لگا کہ سمجھے نا سمجھا گیا۔اس دور کے ادب میں اشکال، علامتوں کا طریقۂ اظہار کا ذریعہ تھا جو آج بھی نئے قاری کو الجھاتا ہے۔اس لئے اسے مدد لینی پڑتی ہے کنجیوں سے؟ شرحوں سے ٹی۔ایس۔ ایلیٹ کی نظموں کی معنویت کو سمجھنے کے لئے اس پر لکھی گئی تنقیدی کتب کو کیوں پڑھنا پڑتا ہے۔ یہ فنکار عوام پسند نہیں ہیں۔ رامبو کو، ایلیٹ کو، راشد کو بچاس مرتبہ پڑھیں، ردم کا حسن تو اپنی طرف کھینچتا ہے جو بیحد اچھا لگتا ہے، لیکن سمجھ میں نہیں آتا۔ کافکا کے افسانے کتنے لوگ

سمجھ پاتے ہیں۔ نیر مسعود سمجھ میں نہیں آتے ۔ان کے افسانے چیلینجنگ ہوتے ہیں۔ جدید افسانہ ایسا ہی ہے،لیکن پھر بھی بہت بڑے حصے کو قبول کیا گیا ہے۔ حالانکہ It is Obscuret, Is defficult things............جدید شاعری بھی مشکل ہے۔اشکال،مبہم،علامتی نظام کی وجہ سے آسانی سے گرفت میں نہیں آتی ۔ حالانکہ اظہار میں مذہب،تصوّف کا پٹ زیادہ ہے۔ بقول وارث علوی............''راشد کی نظم:

ابولہب کی دلہن جو آئی......سمجھ میں ہی نہیں آتی،خوب پڑھتا ہوں مطمئن ہی نہیں ہوتا۔ محنت آج تک جاری ہے۔''............

جدیدیت کی اس طرز کو سمجھنے کے لئے ہمیں نقادوں کا ممنون تو ہونا پڑے گا...... جو محنت سے شرحیں لکھ کر مشکل کو آسان بنادیتے ہیں۔ گویا وہ قاری کو ٹارچ دکھا کر راستہ دکھادیتے ہیں۔

رہا مابعد جدیدیت کا سوال..........تو ایسا ادب تخلیق ہی نہیں ہوا یا ہو رہا ہے جسے خالص مابعد جدیدیت کہا جائے۔اس تنقیدی Discourse پر اردو میں سب سے پہلے گوپی چند نارنگ نے توجہ دلائی۔لیکن یہ کبھی تحریک تھی نہ تحریک کی صورت میں نظر آئی۔ کیونکہ نہ تو اس کا کوئی واضح منشور ہے،نہ نظریہ اور نہ کوئی نئی بات۔ بلکہ تحریکات کے لیبل کو رد کرتے ہوئے یہ رجحان کسی بھی ادعائیت کو سرے سے خارج کرتا ہے۔اردو میں گوپی چند نارنگ کے علاوہ وزیر آغا اور دیگر اور مغرب میں لاکاں،تادارؤف،رولاں،بارتھ،لیوی اسٹرائس وغیرہ نے اس فکر کو فروغ دینے میں اہم رول ادا کیا ضرور،جس کے تحت ردِ تشکیلی مطالعہ کے رجحان پر متن،قاری اور مصنف کے باہمی ربط اور توازن کی تلاش کی گئی............

گویا نئی بوتل میں پرانی شراب والا معاملہ تھا۔ادب کے مطالعے میں ثقافتی پہلو ان کے حوالے اور اساطیر کے تفاعل کی اہمیت پر زور دیا گیا۔ادب پارہ کو پرکھنے کا یہ رجحان جدیدیت اور دیگر تحریکات کے شور میں کہیں دب سا گیا تھا۔جس کی طرف پہلا خیال گیا گوپی چند نارنگ کا۔اب آپ شہپر رسول کا یہ شعر بھی سن لیجئے۔..........شرارت اور حقیقت دونوں اس شعر میں موجود ہیں۔ ؎

جدید کیسے تھے، مابعد کے جدید ہیں کیا
کہاں کے بیج یہ کن مٹیوں میں بوتے ہیں

س: ہندوستانی والدین جنسی تعلیم پر واویلا مچاتے ہیں۔اس لئے آج کا افسانہ نگار یا شاعر اس موضوع پر قلم نہیں اٹھاتے ایسا کیوں؟

ج: یہ سوال ہماری تہذیب سے جڑا ہوا ہے۔افسانہ نگار یا شاعر کی شعوری کوشش کا اس میں کوئی عمل دخل نہیں ہے۔تخلیق کار دباؤ یا روک میں کبھی نہیں لکھ سکتا، نہیں رہ سکتا.......... وہ لکھتا بھی نہیں۔لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ اس موضوع پر ہمارے یہاں کچھ ہے ہی نہیں.......... لکھنے والے لکھ ہی رہے ہیں.......... واویلا مچانا، ہندوستانی تہذیب اور اس کی اقدار؟ کو مترشح کرتا ہے۔اور اب تو کون واویلا مچاتا ہے؟ ٹی۔وی، کیمرے نے بیڈروم کو اچھی طرح تو دکھا ہی دیا ہے، اور خاندان کا ہر فرد ساتھ بیٹھ کر ذرا کسمساتے ہوئے بلکہ اب تو کسمسانا بھی چھوڑ دیا ہے۔اسے دیکھ ہی لیتا ہے۔پھر اردو پڑھنے اور ادب پڑھنے والے ہیں ہی کتنے، جو واویلا مچائیں گے۔بات دراصل موضوع کی نہیں ہوتی۔بات ہوتی ہے اسے فن بنا کر پیش کرنے کی۔منٹو روک پائے اپنے قلم کو، انہوں نے جنس کو فن بنا کر پیش کیا۔فحاشیت، عریانیت اور جنسی ہیجان کو مرکزیت دینا ویسے بھی ادب کے لئے مضر قرار دیے گئے ہیں۔معاشرہ کو اس سے فائدہ بھی نہیں ہوتا سوائے بے راہ روی یا گھٹن کے اور ادب کی سرشت میں رومانیت، جمالیات، تاثرات کا اپنا اہم رول ہوتا ہے۔حظ وانبساط ادب کے لئے لازمی جزو قرار دیئے جا چکے ہیں۔اس لئے یہ الزام کہ والدین واویلا مچاتے ہیں اور قلمکار بچتے ہیں، بے بنیاد اور طفلانہ بیان ہے۔

س: آپ شاعری، مضمون نگاری اور افسانہ نگاری (آپ نے ناول کو شامل کیوں نہیں کیا؟ مجھے کرنا ہے: ثروت) تینوں اصناف پر طبع آزمائی کر چکی ہیں۔لہذا ان تینوں اصناف میں سب سے زیادہ کس صنف سے دلچسپی ہے اور کیوں ہے؟

ج: کہا جاتا ہے اور یہ بات مسلم بھی ہے کہ میدانوں کو پہاڑ زیادہ نہیں سہاتے.......... نہ ہی سنکری گلیاں اور کنکریٹ کے جنگل پسند آتے ہیں.......... لمبی ریس کے گھوڑے کو تو کائنات کی وسعت درکار ہوتی ہے.......... لیکن ناول نگار کو شاعری، مضمون نگاری اور افسانہ نگاری سیراب نہیں کر سکتے.......... مجھے بھی میدانوں کی وسعت اور کشادگی پسند ہے۔

اب رہی بات یہ کہ وہ کون سے محرکات ہیں جو میدانوں کی وسعت ناپنے کی سعی میں پیہم سرگرداں

رہنے پرآمادہ کرتے رہتے ہیں؟............دراصل دنیا کا ہرادیب چاہے کسی بھی صنف میں لکھے،داخلیت وخارجیت کے باہمی اشتراک سے اپنے تخلیقی عمل کوپیش کرتا ہےاوراس کی تحریروقت کی رومیں آگے بڑھتی چلی جاتی ہے، جسے ہم معاشرہ سے علیحدہ نہیں کرسکتے۔کیونکہ زندگی کی تب وتابش میں حقائق کے انکشافات آپ میں ہیجان پیدا کرتے رہتے ہیں۔خیالات پر تلاطم برپا کردیتے ہیں،اوروہ انکشافات،جواحساسات وجذبات کے دھاروں کوسرے سے موڑ دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں............تخلیق کا سبب بنتے ہیں............آج ایک طرف مغربی ثقافت کی یلغار ہےتودوسری طرف مقامی کلچرکی ترجمانی یعنی Folk Culture ہےاورتیسری طرف ریگ Pop Culture ہے۔یعنی اپنے اپنے دائروں سے باہر ہونے کا چیلنج ہرطرف نظرآرہاہے............

انسان کاتعلق سیدھےمشین سے جڑنے کے سبب ادب اس سے متصادم ہونے لگا ہے۔میڈیااورکمپیوٹر کی وجہ سے معصومانہ جذبوں سے ہماری نسل یکسرمحروم ہوگئی ہے......فنونِ لطیفہ کواسکولوں سے ہی غائب کردیا گیا ہے۔ ایثاروقربانی کے جذبے نئی نسل کے لئے آثارِ قدیمہ ہوتے جارہے ہیں............صبر طلبی جیسےلفظ ان کی لغت سے خارج ہوگئے ہیں............لیکن پھربھی ہم تہذیب وکلچر کی دہائی دے دے کراپنے آپ کوفریبوں کے جال میں پھنساتے چلے جارہے ہیں............اوراس منہدم نظام کے آثاروں سے الجھتے سلجھتے انسانوں کی روداداورمعنی وحقیقت کی کشاکش میں گرفتارانسانی بقاءکی شناخت کے مسئلے............اوراس نظام اوران مسائل سے پرمعاشرہ سنوارنے کی سعی اورمثبت نتائج کی کھوج میں ادیبوں کی قلم بھرکوششیں............کتنی کامیاب ہورہی ہیں............یہ علیحدہ مسئلہ ہے۔لیکن یہ وہ منظرنامہ ہے جو مجھے ناول نگاری کےقریب لے آتا ہے............اورناول میں مجھے بھرپور زندگی کے مکمل درشن ہونے کے قوی امکانات نظرآتے ہیں۔کیونکہ اس کا کینواس بڑاہوتا ہے............پھربولیوں ٹھولیوں،زبان وبیان،ان کی ساخت وپرداخت،علاقائیت،ثقافت اورشہری ودیہی زندگی کی ترجمانی کا نیا اورانوکھاانداز، پیش کرنے کی متوازن ترجمانی یعنی ترسیلی تقاضوں کا بھرپورلحاظ رکھتے ہوئے ناول نگار بڑے وژن کے ساتھ فنی لوازم کی شدبداوراس کا بخوبی اہتمام کرکےفنی تکنیک کےتنوع اوراس کے مراحل سےاپنی تحریرکوگزارتا ہےتوبلاشبہ وہ اپنے قلم،اپنے ذہن اوراپنے وژن کا کافی حدتک حق اداکرسکنے کی حالت میں ہوتا ہے۔کھرٹ پٹرزندگی کوسمت ورفتار،

مناسب روش اوررویہ پر چلنے کی فہم اورفکر میں اپنا تعاون بذریعہ ناول بخوبی دیا جا سکتا ہے۔
جہاں وہ اشارۃً وکنایۃً نہیں بلکہ تفصیل کے ساتھ وسیع عالمی تناظر کے پس منظر میں تخیل ومحاکات کی فراوانیوں، جمالیاتی حس کی موشگافیوں سے حقیقی دنیا کا رشتہ استوار کرنے کی کوشش کرتا ہے............
اوراس طرح اپنی بات کو، اپنی فکر کو، اپنے نظریہ اپنی دانش اوراپنے پیغام کو زندگی کی رگ رگ تک پہنچانے کی کوشش کرتا ہے۔
اس طرح اس صنف میں ترسیل وابلاغ کے دشوار مرحلوں سے گزرنے میں کامیابی حاصل کرنے کی اسے پوری جگہ اور گنجائش مل جاتی ہے۔ گویا یہ فن بالکل ایسا ہے کہ گرہستی کی تمام چیزیں ایک چھت کے نیچے ایک Mall میں ملنے کا پختہ انتظام کردیا جائے .... میں سمجھتی ہوں ذہنی رویوں کا یہی وہ استحکام ہے.......... جس کی وجہ سے ایک تخلیقی ذہن افسانہ (کم) یاناول کی طرف رجوع کرتا ہے.......... دراصل سب کچھ فنکار کے ذہن کی کشادگی، اس کے وژن اوراس کی تحریری صلاحیتوں پر منحصر ہوتا ہے۔ طبیعت کی موزونیت، جذبے کی رَو، رومان سے ہجرت کر کے حقیقت تک آنے کی اتنی صلاحیت کہ جس میں کلاسیکیت کا پاس بھی ہو، جمالیاتی احساس بھی ہواور مختلف نظریات پر دزدیدہ نگاہیاں بھی ہوں اور ساتھ ہی ادب کے نئے تقاضوں کو پیوست کر کے فنی اظہار کے نئے اورمنفرد اسلوب کی تکنیک سے خود بخود، خداداد اور برجستہ واقفیت کا ہنر بھی ہو.......... تو ایسا ذہن، ایسا دل، بے ساختہ فکشن میں طبع آزمائی کرنے کے لئے آمادہ ہوجاتا ہے۔ وہ بے چین ہوتا ہے اپنی بات کووضاحت سے رکھنے کے لئے۔ ایسا ذہن شاعری کے لئے موزوں نہیں ہوتا.......... اسے تو کھلا میدان چاہئے .... ہرڈل کے دوڑ کے مراحل طے کرنے ہی میں اسے لطف آتا ہے .... زندگی بھی تو اسی میدان اسی ہرڈل کی طرح ہے۔ کوئی ایک لمحہ، ایک پل، ایک جذبہ، ایک احساس، ایک تصور، ایک آرزو کا سوال نہیں جو شعر یا ایک نظم کے پیکر میں ڈھل جائے.......... بلکہ ناول میں اس بیکراں زندگی کی وسعت، اس کے لوازمے کو مخصوص تانے باتے میں پروکر اس وضاحت کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے کہ زندگی کے رموز، اس کے محرکات، اس کا شعور، اس کی فہم، اس کا تجسس پڑھنے والے کو اُس منزل تک لے جاتا ہے کہ جہاں زندگی اس کے روبروآ کر ذوق شوق کی پھلجھڑیاں روشن کردیتی ہے۔ اورقاری کے وجدان میں ننھی ننھی چنگاریوں کی رنگین ضیاء اپنا کمال دکھانے لگتی ہے

............گویاناول نگاری ایک ایسی ٹارچ ہے جوظلمت کدہ میں روشنی کا ادبی انتظام ہے۔تخلیقیت کاحسن پوری طرح جلوہ گرہوجائے............اس کے لئے مجھے اسی ادبی انتظام کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

س: آپ بحیثیت شاعرہ یہ بتائیں کہ آج کی شاعری کی روح تک پہنچنے کے لئے نیزان کی بے نواعلامتوں کو سمجھنے کے لئے کیا کرنا ہوگا؟

ج: اول تو ایک بات واضح کردوں کہ میں شاعرہ نہیں ہوں۔لیکن شاعری کی روح میں اترنے اورعلامتوں کی بھول بھلیوں سے باہر آنے یا سمجھنے کی کوشش میں چند باتیں ضرور کہوں گی............سب ہی جانتے ہیں کہ زندگی کے حقائق تغیر وتبدل سے وابستہ ہیں .... چنانچہ اذہان خود بخود انہیں اپنے اپنے طور پر دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش میں منہمک ہوجاتے ہیں۔تبدیلی ،زندگی میں نئے تجربوں کی آمد کا سبب بنتی ہے اوریہی تجربے جدید طرزِفکر اور طرز احساس کو جنم دیتے ہیں۔فن اور شاعری میں بھی یہی عناصر کارفرمارہتے ہیں جو یقیناً ماضی کے تجربوں سے مختلف ہوتے ہیں............نئی فکر .... نئے صوتیات،نئی تراکیب اورنئی علامتوں کے ساتھ جلوہ گر ہونے لگتی ہے اور پھر یہیں سے بحث چھڑ جاتی ہے قدیم وجدید کی .... بے نوااور بانوا کی ....لیکن ذوق وشوق اور جستجوئے پیہم انسانی نفسیات کے وہ پیچیدہ عمل ہیں .... جو کبھی ہار نہیں مانتے............جہاں ایک طرف قدامت اعتراضات کی بارش کرتی ہے وہیں جدت، جدید فکر کے جدید مفاہیم کی تلاش میں سرگرداں اور سرگرم رہتی ہے اور آخر کار اپنی روح کی تسکین کا سامان مہیا کر ہی لیتی ہے۔اس تسکین کا انحصار دو باتوں پر ہوتا ہے............لفظ کی آواز یا صوت اور اس میں پوشیدہ و پیوست مفہوم ....چنانچہ پہلی نظر میں جو علامتیں معمہ سی نظر آتی ہیں وہ قاری کے ذوق وشوق کے دوش پر سوار ہوکر اپنی صوتیات اور مفاہیم کے باہم شبنمی پھوار سے اسے مسرور کرکے،اس کی نفس نفس کو جاوداں بنادیتی ہیں۔اوریہی وہ لمحہ ہوتا ہے جب ہم یہ کہہ سکنے کی حالت میں ہوسکتے ہیں کہ''ہاں!یہ سروردراصل آواز اور مفہوم کے بطن سے ہی پیدا ہوا ہے۔''اور نتیجتاً نئی شاعری سے ہم مزاجی ،ہم آشنائی کے توسط سے تمام تر کیفیات اورلذت سے ہماری روح معمور ہوتی چلی جاتی ہے۔الفاظ چمک اٹھتے ہیں......ان میں موسیقیت پیدا ہوجاتی ہے اور وہ چھن چھن کر ہماری روح کی تسکین کا باعث قرار پاتی ہے۔یہی وہ عمل ہے جس

کی بنا پر شاعری خود بخود روح میں اترتی چلی جاتی ہے جسم و جاں کی گہرائیوں میں پائندگی کی حد تک اتر کر روح کو معطر کرنے کا بے مثال عمل............اب یہاں یہ بات بے معنی ہو جاتی ہے کہ نئی شاعری ،نئی علامتوں کو سمجھنے کے لئے کیا کرنا چاہیے، کیا نہیں............ کیسے سوچیں، کیسے نہیں؟؟............ میں سمجھتی ہوں ان بھول بھلیوں میں اترنا، حظ وانبساط کے دائروں سے دور ہونے کے مترادف ہوگا...... ......معیاری ادب وہی ہے جو ترسیلی تقاضوں کو پوار کرے۔ میرؔ کا کہا ہوا یونہی مستند نہیں ہے......... روشنی کی رفتار ہے......... قاری ٹھہرتا نہیں ہے......... بے نوا کو چھوڑ کر دامن بچالیتا ہے اور با نوا کی صدا پر جھومنے لگتا ہے۔ وہی فن مقبول ہو جاتا ہے تجربے دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔

مذکورہ بالا سطور میں، میں نے آپ سے دو باتیں خاص طور سے عرض کیں ایک تو تخلیق کار، متن اور قاری کا باہمی رشتہ اور اس رشتہ کی بنیاد میں نہاں، ہم مزاجی اور ہم آشنائی کے سبب کیفیات ولذّت سے شرابور روح کی طمانیت، اس کی تسکین کا بے حد نازک اور باریک عمل......... جہاں متن میں بے نوا کچھ بھی نہیں ہوتا......... سب موزوں طبیعت اور ذوق وشوق کی جل ترنگیں ہیں، حظ وانبساط کے آبشار ہیں۔ دوسری یہ کہ ادب کے معیار کا دارومدار ترسیلی تقاضوں پر ہوتا ہے۔ متن میں الجھاؤ تناؤ اور ابہام ہوگا تو قاری کے ذہن اور دل میں حبس کی سی کیفیت پیدا ہو جائے گی۔ اور وہ عین جمالیات کی ضد ہوگی......... پھر جس عبارت میں جمالیات کا پٹ نہ ہو......... وہ ادب سے خارج ہے۔ میں سمجھتی ہوں۔ کسی بھی فن پارہ کو سمجھنے، پڑھنے، محظوظ ہونے کے لئے ہمیں ان دو باتوں کے Process سے گزرنا ہوتا ہے۔

رہی بے نوا علامتوں کی بات تو اگلے سوال کے جواب میں اس کا جواب بھی شامل ہے۔

س: موجودہ شعر وادب کی رفتار سے آپ کس قدر مطمئن ہیں۔ ترقی پسند ادب کے بعد جدید ادب کا دور آیا اور اب مابعد جدید ادب کا دور ہے، اس کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

ج: رفتار بھی متوازن ہے اور تنوع بھی خوب ہے۔ لیکن پڑھنے والے نہیں رہے۔ تنقید بھی اپنے راستے سے اِدھر اُدھر ہو گئی ہے کوئی محنت نہیں کرنا چاہتا۔ عجلت پسندی اور ذاتی مفاد اس قدر حاوی ہے کہ جو لکھا جارہا ہے، اس پر سنجیدگی سے غور وخوض کرنے کی فرصت ہی نہیں ہے......... بہت جلد، سب کچھ حاصل کرنے کی خواہش نے مادہ پرستی کو فروغ دیا ہے۔ آزادانہ رائے، صحت مند بحث ومباحثہ کا قحط

ہے...... Original thoughts کے لالے پڑے ہوئے ہیں............لیکن کچھ جیالے تخلیق کار ہیں جو سنجیدگی سے اپنا کام کئے جا رہے ہیں............بالکل ارجنی آنکھ کی مانند............حالانکہ کتابیں زیادہ شائع ہونااس بات کی دلیل نہیں ہے کہ سب کچھ معیاری اور تسلی بخش ہے۔ ہرگزنہیں............ایسی کتابیں بہت جلد باسی پن کا شکار ہورہی ہیں۔ ایک مجموعہ میں ایک چیزکام کی نکل آئے تو غنیمت ہے۔لیکن میڈیا نے ایسے لوگوں کو بہت سر پر چڑھا رکھا ہے۔ دراصل Creation اشتہار نہیں چاہتا،وہ خود اشتہار ہوتا ہے۔ فنکار کو خود پرستی اور خود اشتہاری سے پرہیز کرنا چاہئے۔لیکن اپنے اپنے دور میں اس صورتِ حال سے نبرد آزما ہونے کے لئے انسان کو سنجیدہ اذہان نے اپنی طرف متوجہ کیا بھی ہےاور خوب کیا............

لیکن دورِ حاضرہ میں عصری ادب کو لے کر عجیب گروہ بندیاں پال لی گئی ہیں۔نقاد تو نقاد، فنکاراور یہاں تک کہ قاری رتک طرف داری اور جانب داری کا شکار ہوگیا ہے۔ بیسویں صدی کا ادب بہت Rich رہا ہے،لیکن بیسویں صدی کے چراغ سحریوں (دوایک سب نہیں)............نے ابھی تک گدّیاں نہیں چھوڑی ہیں............ایوارڈ اور ریکارڈ کی ہوس اوراس ہوس سے ادبی فضا کو آلودہ کرنے کی ایسی کوششیں کہ جن کو دیکھ کران حضرات کے ادبی کارناموں سے پیدا شدہ عزت واحترام جو قارئین کے دلوں میں ان کے لئے نقش ہیں............کو بڑی تکلیف دہ ضرب لگتی ہے۔

لیکن یہ بھی ہے کہ وہ گدّیاں چھوڑیں بھی تو کس کے لئے............سینئر نسل تو اُن کے عمل پر ردِ عمل یاان کی پوجا پاٹھ میں وقت ضائع کررہی ہے،لیکن 1980 کے بعد کی نسل ذرا سنبھلی ہوئی ہے۔ چنانچہ اکیسویں صدی میں امکانات اس درجہ نظر آرہے ہیں کہ یہ صدی شعروادب کی بالیدگی کے لئے کسی طورکم نہ ہوگی............رہا سوال ابوجہلوں کا............تو سیاہ دلوں کا کچھ نہیں کیا جا سکتا۔اسلام بھی روشنی پھیلانے کے لئے آیا تھاادب بھی روشنی پھیلاتا ہے وہ روشنی پھیلا بھی رہا ہےلیکن پالیسیوں کا اپنا جال ہے۔امریکہ نے روس اور کمیونزم کو ختم کر کے اقتدار پر شکنجہ کسا تو بزنس ورلڈ نے عورت کی نسوانیت کو نیست ونابود کر کے بازارواد کے حوالے کیا............سوال اٹھتا ہے کہ کسی بھی رفارمر کا کوئی دشمن کیسے ہوجاتا ہے؟ جواب بھی دنیا جانتی ہے۔ ادیب بھی رفارمر ہے۔ادبا جلاوطن کیے گئے ،فنکاروں کواپنے وطن کی دوگز زمین نہیں ملی............یہ سب کیوں ہوتا ہے؟

دراصل ادب، مفکر اور میڈیا............ یہ تینوں استحصال کی لڑائی کے بڑے میدان ہیں۔غریبوں، بے کسوں اور عام آدمی کے دوست ہیں.......... ہم نے سوچا ہے کبھی۔ان سے کن لوگوں کا نقصان ہے؟ خطرہ ہے؟ میرے ذہن میں اس کا جواب بھی سوال کی صورت میں ابھر رہا ہے اور وہ یہ ہے کہ دراصل ہم یہ دیکھیں کہ ادب سے کن لوگوں کو فائدہ ہے؟ بات گہری ہے.......... سوچنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ یہ کہہ دینا کہ اچھا ادب لکھا ہی کہاں جارہا ہے؟ بہت ہی سوچی سمجھی پالیسی کا حصہ ہے۔ ایسے لوگ ادب دشمن، تحریر دشمن ہوتے ہیں.......... اور پالیسیوں کی گہرائی ناپنے کے لئے لوگوں کے رجحان اور نظریے کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔اس لئے سروے بھی ہوتے ہیں.......... سب کچھ برا یا سب کچھ اچھا والی بحث نہیں ہے.......... کتنا، کیا، کیوں، کیسے کس لئے، والا نظریہ اپنا کر قاری اور نقاد کو جانب داری، نکتہ چینی سے باز آنے کی ضرورت ہے۔اگر ادیب کہیں بے راہ روی کا شکار ہو بھی رہا ہے تو پتہ لگانا ہوگا کہ وہ آخر معاصر دنیا کی تبدیلیوں کا عکاس و نبّاض بھی بن رہا ہے کہ نہیں؟ زندگی کو سمت و رفتار کی فہم عطا کر بھی رہا ہے کہ نہیں؟ دورِ حاضرہ کے وسیع عالمی تناظر کے چیلینجز کو قبول کرنے کی ہمت وقوت یا استعداد اُس کے بازوؤں میں ہے بھی یا نہیں؟ علامتوں، استعاروں، نئی تراکیب اور نئی تکنیک سے موضوع کا تعلق استوار کر بھی رہا ہے کہ نہیں؟ نقاد کو قاری بن کر یہ جاننا ضروری ہے کہ زندگی کی پیچیدگی نے آج کی شاعری پر کیا اور کیسا اثر ڈالا ہے؟ یا یہ کہ آرٹ پر عصری خوف ودہشت کا اتنا اثر کیوں نظر آرہا ہے کہ فنکارانہ جمالیاتی قابو پانے میں فنکار کہیں نہ کہیں تخلیق میں جمالیات کا دامن چھوڑ کر ماحول اور اس کی آلودگی کا شکار ہورہا ہے؟ کہیں آرٹ پر خون تو غالب نہیں آرہا؟ اسلوب نگارش، اظہار و بیان نے ترسیلی تقاضوں کو کتنا ملحوظ رکھا ہے؟ کہیں ان تقاضوں کی بندش نے اس کے فطری بہاؤ کو ضرب تو نہیں پہنچائی ہے؟.......... کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ادب کو اچھے Readers اور اچھے Critic کی ازحد ضرورت ہے.......... بیزاری، نکتہ چینی، چمکار یا صرف تحسینی کلمات کے رواج کو اب لگام دینے کی ضرورت ہے۔تب ہی آج کے تخلیق کار کا یہ شک دور ہوگا کہ ادبی معاملات اور ادبی سیاست کی موجودہ صورت حال محض ایوارڈ اور اقتدار کی ہے یا اس کے پس پردہ ادب دشمنی یا منصوبہ بندی ہے؟

س: دورِ حاضرہ کی اردو صحافت سے تعلق آپ کی ذاتی رائے کیا ہے؟ اردو اخبارات ایوان حکومت تک

ہماری آواز پہنچانے میں کہاں تک کامیاب ہیں؟

ج: اردو صحافت میں چھوٹے اخبارات ورسائل کی تعداد زیادہ ہے۔صوبائی سطح کے چھوٹے ،منجھولے چار سے چھ،سات صفحات پر مشتمل اخبارات کی اوقات ہوتی ہی کتنی ہے .... ملکی سطح پر ''راشٹریہ سہارا'' اور دیگر چند کی کوششیں ہیں۔نیٹ ورک ہے جو صحافت کے معیار (آبرو) کو قائم رکھے ہوئے ہے۔

جہاں تک رسائل کی بات ہے وہ تسلی بخش تو ہے،لیکن سیاسی خبروں اور معاشرتی مسائل کے خلاف مکمل طور پر احتجاجی ردِ عمل کا ہندوستان کے طول وعرض کو دیکھتے ہوئے تقریباً فقدان ہی ہے۔اور یہ کہ حکومت تک ہماری آواز پہنچ پا رہی ہے کہ نہیں ،تو پہلی بات تو یہ ہے کہ ہم حکومت کے پاس کیوں جائیں؟وہ عوام کے پاس آتی ہے۔جمہوری نظام کا یہ قاعدہ بھی ہے۔غرض ،ہمیں نہیں ان کو ہے............ ہاں یہ اور بات ہے کہ احتجاجی رویّوں کی اپنی دھمک ہوتی ہے۔اردو اخبارات ورسائل اگر ان رویّوں کو اٹھاتے ہیں تو بات تو پہنچ جاتی ہے لیکن کتنے لوگ ہیں آج...... جو اردو رسم الخط سے واقفیت رکھتے ہیں .... ذکر کر دینا اور خود پڑھنا .... دو علیحدہ علیحدہ عمل ہیں .... حکومت تک رسائی کس حد تک ہوتی ہوگی .... کیا ذکر کر دینے بھر سے ترسیل ہو جاتی ہے؟ یہ اور بات ہے کہ جس دھیمے پن سے ہمارا احتجاج درج ہوتا ہے،اسی دھیمے پن سے ہماری طرف حکومت کی توجہ بھی ہوتی ہے۔اردو صحافت کا، انداز، ناک میں دم کر دینے والا نہیں ہے۔ہونا لازمی ہے آج کے دور میں .... لیکن سب سے بڑا مسئلہ پھر یہ بھی ہے کہ اردو صحافت زندہ کیسے رہے۔اس میں جان کہاں سے پیدا ہو؟ کیونکہ ہم اپنے بجٹ کا کتنا حصہ اردو اخبارات و رسائل کے لئے مقرر کرتے ہیں؟ پوشیدہ ہے بھلا کسی سے؟

س: دورِ جدید میں اردو ناول اور افسانے کے ارتقا کے متعلق رائے؟

ج: چھوٹی چھوٹی ہنڈیاں تو بہت پک رہی ہیں لیکن دیگ پکانے والے بہت کم ہیں۔دیگ پکے گی تو زیادہ کا بھلا ہوگا۔اس لئے ناول نگاری کے رجحان کو فروغ ہونا چاہئے اس صدی میں اچھی شروعات ہوئی ہے لیکن افسانے کا ارتقاء حیرت انگیز طریقے سے اپنے معیار کو برقرار رکھتے ہوئے عروج پر ہے .... خدا کرے نئے لکھنے والے آتے رہیں۔............ جستجوئے پیہم۔کاروانِ عمل اورعہدِ

جست ....جمود کوتوڑتے ہیں۔ یہی میری دعا ہے۔

س: کسی نے کہا ہے کہ 'آگ کا دریا'' میں فلسفہ تاریخ بحیثیت عقیدہ کا موجود نہیں ہے۔''حیثیت ذریعۂ اظہار کا ہے۔'' آپ اس جملے پر کیا کہنا چاہیں گی؟

ج: قراۃالعین حیدر ایک جرنلسٹ تھیں............ دنیا گھوم چکی تھیں............ مطالعہ وسیع تھا۔''آگ کا دریا'' کا ہر جز چیخ چیخ کر یہ بتاتا ہے۔انٹرنل آرگینک نہیں ہے تو ناول فیل ہے۔دراصل ناول میں ہر جز دوسرے سے اس طرح جڑا ہوا ہونا چاہیے جیسے جسم کا ایک عضو دوسرے سے جڑا ہوتا ہے۔انٹرنل بیلنس کی بہت ضرورت ہوتی ہے ناول میں۔''آگ کا دریا'' میں کوئی تاریخ ہی نہیں ہے۔نہ ایک کردار دوسرے کردار سے قریب ہے، نہ واقعات Live ہیں......فنی اعتبار سے تاریخ کو افسانے کے سانچے میں لکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ادوار کی تقسیم میں ناول کی فضا تعمیر نہیں ہوتی۔ادوار تاریخی حیثیت رکھتے ہیں فنی نہیں......تاریخ کے مسائل، ناول کے خلاف ہیں۔فکشن میں کردار مرتا نہیں، تاریخ میں مرتے ہیں............ مثلاً اکبر مرتا ہے رومیو جولیٹ نہیں .... لیلیٰ مجنوں نہیں ....اور تاریخ کا مسئلہ دراصل ہے بھی نہیں .... اسے چھوڑیئے، فکشن کی بات کیجئے............فکشن میں زندگی آرگینک اسٹرکچر ہے...... چیز مرتی نہیں ہے............تاریخ مرتی ہے......تاریخ میں لوگ چیزوں کو Visually دیکھتے ہیں پھر فلسفۂ تاریخ کا مسئلہ کہاں پیدا ہوتا ہے ...... پورے ناول میں ایک بھی چیز ایسی نہیں ہے، جو پہلے سے موجود نہ ہو............اور یہی وہ چیزیں ہیں جو پکار پکار کر قرۃالعین حیدر کے لئے کہتی ہیں کہ وہ جرنلسٹ تھیں، مطالعہ وسیع تھا............ دنیا گھوم چکی تھیں............ لائبریریاں، آرکائیوز، کھنگال چکی تھیں............وہی سب کچھ یکجا کر کے لکھ دیا، تو اردو میں ایک انوکھی، منفرد اور پہلی کوشش ہوگئی............جس کی انفرادیت نے ہی اسے درجہ عطا کر دیا............ورنہ............!! بہر حال کچھ بھی کہو، یہ بھی ایک کمال ہی تھا۔............

س: بول چال کی سطح پر یوں تو اردو کو فروغ ہو رہا ہے لیکن تلفظ کا معیار دن بدن خراب ہو رہا ہے۔اس مسئلہ کا کیا حل ہے؟

ج: جب Reader ہی نہیں ہوں گے تو تلفظ کا مسئلہ ہونا فطری ہے۔اردو کی بقا اسی میں ہے کہ جہاں تک ہو، جو تلفظ ہو اسے قبول کر لیجئے۔لوگوں کو شرمندہ کریں گے کہ 'آپ اردو نہیں جانتے۔''......

تو اور نقصان اٹھائیں گے......ہمیں زیادہ نہیں تھوڑا ہی سہی، لچیلے پن کو اپنانا ہوگا............ قلم مؤنث ہے مذکر ہے............ کہنے دیجئے............ کچھ بھی مفہوم ادا ہونا چاہیے............ تھوڑا پریکٹیکل ہونا بھی ضروری ہے۔

حالاتِ حاضرہ کا یہی تقاضہ ہے۔مدرسہ پن سے چھٹکارا ملنا چاہیے۔زبان داں اگر غلطی کرتا ہے تو اصلاح ضرور کرنی چاہیے لیکن اردو سے محبت کرنے والے غیر اردو داں اس کی طرف متوجہ ہوکر،الفاظ کی ادائیگی میں صحتِ زبان کو معصومیت کی وجہ سے نقصان پہنچاتے ہیں تو وہ نقصان فوری ہے............ ذرا اور اندر آئیں گے تو صحیح غلط کے فرق کو پہچان جائیں گے۔آسمان پر اونچی پتنگ ہے تو کبھی ڈھیل دینا اور کبھی تاننا............ دونوں ضروری ہیں۔

س: آپ نے جب اپنا تخلیقی سفر شروع کیا تو اس وقت کئی نظریوں کا بول بالا تھا،آپ کو کس نظریے نے متاثر کیا اور کیوں؟

ج: میں نے 1999ء سے لکھنا شروع کیا۔آپ جانتے ہیں،اس وقت کیا تھا اور کیا نہیں............ فی الحال میں کسی مخصوص نظریے سے متاثر نہیں اور متاثر ہوں بھی............ کہنے کا مطلب ہے کہ نظر سب پر ہے،لیکن لکھتی وہی ہوں جو اپیل کرتا ہے۔کسی کا شکار نہیں بلکہ شکار کر کے بیٹھی ہوں............ ادبی ادوار کو ٹائٹل دینا شاید فیشن ہے۔لیکن میرؔ، غالبؔ، ناسخؔ، انیسؔ،نسیمؔ کے زمانے میں کیا تھا............ نہ نظریہ نہ تھیوری............ پھر بھی وہ سب عہد ساز تھے۔قصرِ علم کے مضبوط و مستحکم ستون............ ویسے بھی فارمولا ٹائپ تحریروں سے میری مناسبت ہی نہیں ہے............ میدان میں اتر کر،محسوس کر کے تن من جلاؤ تو سوز پنپتا ہے............ تحریر وجود میں آتی ہے............ تخلیق خلق ہوتی ہے...... مجھے کسی رجحان، کسی نظریے، کسی ازم،، کسی فارمولے سے بھلا کیا کام............ ہاں! ان سب کا احترام ضرور کرتی ہوں۔لیکن............!!!

س: تقسیم ہند سے اردو ادب کو فائدہ پہنچا یا نقصان، مستقبل کے بارے میں آپ کیا کہنا چاہیں گی؟

ج: عالمی منظرنامہ کی بات کریں تو کوئی نقصان نہیں ہوا............ یہاں بھی لکھا جارہا ہے اور وہاں بھی............ لیکن ملکی سطح پر نقصان ہوا۔اذہان تقسیم ہوگئے............ لیکن ہم سنبھل گئے۔

س: اردو ادب میں خواتین کا مستقبل؟

ج: بیحد روشن ہے بلکہ ہر جگہ روشن ہے۔بس جدو جہد اور علم وعمل میں جرأت و جسارت کی ضرورت ہے۔ ناول ،افسانہ اور شاعری.......... بیسویں صدی کی ابتدا سے آج تک .... ایک سے ایک شاہکار.......... بین الاقوامی سطح پر پکے دستخطوں کے ساتھ .... محنت کروگے تو میدان مارلوگے۔صف شکن بننے سے کوئی نہیں روک سکتا.......... بشرطیکہ صلاحیت پیدا کرو۔۔۔!!!اوراب تو بین الاقوامی نسائی ادبی تنظیم ''بنات'' کے ذریعے دنیا کی ۱۵۰ ر لکھنے والیاں جُڑگئی ہیں۔ان میں ادبی رہنمائی بھی کررہی ہیں۔امید ہے اس تنظیم کے بطن سے بھی مستقبل میں روشن امکانات پیدا ہوں گے۔جو ادب میں اضافے کا باعث ہوں گے۔

ثروت خان کی کہانی

رتن سنگھ

جاگیرداری ماحول میں پلی بڑھی ثروت خان نے بچپن میں یہ دیکھا کہ گھر کے تمام افراد کے لئے چھتیس اقسام کا کھانا پکتا تھا لیکن گھر کے نوکروں چاکروں کے لئے الگ سے معمولی کھانا تیار ہوتا تھا۔

اتفاق سے ثروت خان کی والدہ کو اپنے گھر کا یہ چلن پسند نہیں تھا اور وہ چوری چھپے اپنا کھانا نوکروں کے ساتھ مل بانٹ کر کھاتی تھیں۔ یہیں سے ثروت خان کے دل میں یہ خیال پنپنے لگا کہ زندگی کی اس بُنیادی ضرورت کے لئے انسانوں کے درمیان یہ بھید بھاؤ کیوں ہے؟

ثروت خان ابھی چھٹی کلاس میں ہی تھیں کہ پرانی روایت کے مطابق پردہ کرادیا گیا۔ یوں بھی گھر میں کورس کی کتابوں کے علاوہ دوسرے رسائل یا کتابیں پڑھنا بچوں کے لئے معیوب سمجھا جاتا تھا۔

اس قسم کے ماحول میں بھی ثروت خان کے دل میں انسانوں کے بیچ عدم مساوات کا جو بیج بچپن میں پیدا ہوگیا تھا۔ وہ پودا آہستہ آہستہ پنپتا رہا اور یہ اللہ میاں سے جھگڑتی رہیں کہ اس کی بنائی ہوئی دنیا میں ایسا کیوں ہے؟

ان کی خوش قسمتی تھی کہ پندرہ سولہ سال کی عمر میں شادی کے بعد یہ سسرال پہنچیں تو وہاں ان کے شوہر اور سسرال کا پورا گھرانہ روشن خیالات کا حامی تھا۔ اس لئے وہاں آ کر نہ صرف انہوں نے گیارھویں کے بعد اپنی تعلیم کو پورا کیا بلکہ اپنے دل میں گونجتی ہوئی پرانی آواز کو بھی سُنا اور اپنے خیالات کے اظہار کے لئے انہوں نے قلم تھام لیا۔

یعنی کہانی کار بن کر ادب کی دُنیا میں قدم رکھا۔

عدم مساوات کے خلاف جو جذبہ ان کے دل میں بچپن سے تھا وہ ان کے جوان ہونے کے ساتھ ساتھ بڑا ہوتا رہا اور آخر کار اس کا اظہار ایک افسانے میں اس طرح ہوا کہ وہ دِھوارامی کا ننھا کیشو تھا، جو دو دن سے بُخار میں تپ رہا ہے وہ وقت سے دوا نہ ملنے کی وجہ سے اَجل کا لُقمہ بن گیا۔

رامی نے اس دن کام مل جانے پر سخت محنت کی ہے۔ اسے ساٹھ روپے مزدوری کے ملے تو سب سے

پہلے اس نے اپنے بچے کے لئے دوا خریدی لیکن تب تک بہت دیر ہو گئی تھی۔ رامی، انجان رامی، مرتے ہوئے بچے کے منہ میں دوا اُنڈیلتی ہے اور وہ باہر گر جاتی ہے۔

رامی اب بھی دوا کی شیشی ہاتھ میں لئے ہوئے گھوم رہی ہے۔ جیسے جیسے زندگی اپنی بقا کے لئے ہاتھوں میں دوائی پکڑے گلی گلی بھٹک رہی ہو۔

ثروت خان نے اس طرح کے اشاروں میں اپنے دل کا تمام درد کاغذ پر انڈیل دیا ہے۔ علاقے میں اکال پڑنے پر لوگ روزی روٹی کی تلاش میں شہر کی طرف بھاگے تو ثروت خان کے الفاظ،'' گاؤں کے افراد بھی جیسے تیسے شہر کا پیوند بنتے چلے گئے تھے۔''

''پیوند'' لگنے کا اشارہ اسی عدم مساوات کی طرف اشارہ کرتا ہے جو کہانی کا مرکزی خیال ہے۔ جا بجا اس کی طرف اشارے ملتے ہیں۔'' رامی فکر مند ہو چکی تھی----'' گاؤں کے مَنگھ ہی اسے پریشان کرتے ہیں تو شہر میں کیا ہوگا؟''

ہونا کیا تھا۔ وقتی طور پر زندگی ہار گئی۔ موت جیت گئی۔ لیکن زندگی نے ہار نہیں مانی، زندگی کی رہگزر پر وہ رامی کی شکل میں دوا لئے گھوم رہی ہے کبھی تو عدم مساوات کی وجہ سے'' بے بسی'' لاچاری، مُفلسی، بھوک، پیاس، اور آخر موت سے چھٹکارا ملے گا۔

اسی لئے ثروت خان اپنی ایک اور کہانی'' چوتھا کھونٹ' جو ایک طرح سے پہلی کہانی کا ہی دوسرا روپ ہے۔ میں لکھتی ہیں:'' خارج میں تضاد، باطن میں تضاد، خارج بھی بدشکل، ظلم و جور، تشدد، ناہمواری، بے ربطی اور غیر ہم آہنگی کا عجیب اور بھیانک کھیل، عجیب کھلاڑی، کیسا معاشرہ، کیسی تہذیب، کیسا تمدن، سب تتّر بتّر، سب درہم برہم۔''

اور اسی لیے خوشحال سلطنت ـــــ بدتر ہو کر ـــــ چوتھا کھونٹ بن جاتی ہے۔ اور چوتھے کھونٹ کی طرف جانے والا شہزادہ، اسی رامی کی طرح زندگی کو ان دکھوں سے نجات دلانے کے لئے ناہموار راہوں پر بھٹک رہا ہے۔

یہ تاثرات اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ جب تک عدم مساوات کی وجہ سے پیدا ہونے والا اندھیرا مٹ نہیں جاتا، ثروت خان کا قلم، خوبصورت سے خوبصورت ترین افسانوں کی شکل میں شمعیں جلاتا رہے گا تاکہ اس روشنی کو پا کر زندگی قدم بہ قدم خوشحالی کی منزل کی طرف رواں دواں رہے۔

ثروت خان شورشِ فکر کی فریم میں

پروفیسر عتیق اللہ

''عہد نامۂ عتیق'' میں ارشاد ہے:

...........پس خدا نے آپ اپنے امیج پر آدمی کو تخلیق کیا اور آدم پر گہری نیند طاری کر دی اور وہ سو گیا اور پھر خدا نے اس کی پسلی نکالی..................اور اس سے ایک عورت کی تخلیق کی اور آدمی کے لئے اس کی پرداخت کی اور آدم نے کہا:

''یہ ہڈی، میری ہڈیوں میں سے ہے اور گوشت میرے گوشت میں سے ہے۔ یہ عورت اسے عورت Woman کہا جائے گا کیونکہ یہ آدمی سے نکلی ہے۔ دونوں ننگے تھے اور آدمی اور عورت دونوں (اپنی برہنگی سے) نہیں شرمائے۔

اور دونوں کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور وہ جانتے تھے کہ وہ ننگے ہیں اور انہوں نے انجیر کے درخت کے بڑے بڑے پتوں سے اپنا لباس بنالیا۔''

یہ اقتباس اپنی ماہیت میں انسان/ آدمی کو نَر مادہ خصوصیات یعنی نرزائی Andocentric حامل بتاتا ہے۔عورت مرد سے نکلتی ہے اور آدم نے اسے حوّا سے موسوم کیا۔خدا بھی ایک 'نَر' ہے جس نے اپنی امیج (صورت) پر آدمی کی تخلیق کی۔آدمی پہلے پیدا ہوا، عورت بعد میں عورت اور مرد کی تفریق کی کہانی کا یہ سلسلہ اساطیر اور لوک ادب سے ہوتا ہوا عہد جدید تک پہنچتا ہے، جو تاریخی اور متنی ہے۔ یہ بھی ایک مقبول عام روایت ہے کہ زمین پر تکلم کے دس پیمانے اتارے گئے تھے، آدمی نے صرف ایک پر قناعت کر لی اور عورت نے نو کے نو پر قبضہ کر لیا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ لڑکی لڑکے سے پہلے بولنے لگتی ہے۔(ہماری پہلی زبان کو مادری زبان کہا جاتا ہے، آج تک کسی نے 'پدری زبان' کی تاکید نہیں کی)۔اور یہ بھرم بھی قائم ہے کہ مرد ریاضی میں ماہر ہوتا ہے اور عورت زبان میں ماہر ہوتی ہے۔اس طرح کی غلط اور مغالطہ آمیز روایتوں کو برقرار رکھنے اور فروغ دینے میں زبان اور ادب

کا سب سے بڑا ہاتھ ہے۔

فلسفے اورنفسیات کا میلان بھر مرد مرکوز ہے۔'عورت میں فطری طور پر کچھ کمیاں پائی جاتی ہیں (ارسطو) یہاں پہنچ کر مجھے ایک دلچسپ بات یاد آ گئی کہ ارسطو نے مرد وعورت میں جو حیاتیاتی فرق ہے اس کے ثبوت میں یہ بھی کہا تھا کہ مرد کے مقابلے میں عورت کے دانت کم ہوتے ہیں، ہوسکتا ہے ارسطو کے عہد میں یہ ایک مقبول عام روایت رہی ہو۔ارسطو کے دعوے کا مذاق اڑاتے ہوئے برٹینڈرسل نے یہ کہ کر چٹکی لی کہ ارسطو اس زبردست غلطی سے بچ سکتا تھا اگر وہ اپنی بیوی کے دانت گننے کی زحمت کر لیتا۔عورت ایک کمزور ہستی ہونے کی وجہ سے بہت جلد بالغ ہو جاتی ہے اور بڑھاپا اُسے دبوچ لیتا ہے۔ کیونکہ ادنیٰ چیزیں بڑی تیزی کے ساتھ زوال کی راہ لے لیتی ہیں۔ Generation of Animals (پیک) ساری چیزوں کا پیمانہ مرد ہے (فیثا غورث) اکویناس نے تو عورت کو ایک نامکمل ہستی سے تعبیر کیا اور نتشے نے تو عورت ہی کو تمام احمقانہ حرکتوں اور بدعقلی کا سر چشمہ قرار دیا اور انہیں ایسی پروں والی مخلوق بتایا جو ملاحوں کو بہکا کر پہاڑوں پر لے جاتی تھیں۔ گویا شیو جی کی بھکتی میں آڑے آنے والی بھی عورت ہے اور نتشے جیسے فلسفی کو للچانے والی ہستی بھی عورت ہے جو فلسفی کی صداقت کی تلاش کی راہ میں مانع آتی ہے۔اس کا یہ قول بھی مشہور ہے کہ عورت کی تخلیق خدا کی دوسری غلطی تھی (پہلی دنیا/آدم کی تخلیق اور دوسری عورت کی تخلیق) فرائڈ تو یہ تک کہتا ہے کہ جن مخفی اعضا کی بنیاد پر مرد کو برتری حاصل ہے اس کے تئیں عورت جذبۂ حسد میں مبتلا رہتی ہے۔

ثروت خان کا سارا درد ہی یہ ہے کہ عورت کو ایک انسانی ہستی کے بجائے حیوانوں کی طرح دوسری جنس میں شمار کیا جاتا ہے یعنی The Other۔اس تفریق کو صدیوں سے اساطیر کے بعد آسمانی صحائف سے سند کا درجہ ملتا رہا۔افلاطون نے اسے جذباتی اور کم زور صنف قرار دیا اور دنیائے ادب نے اس ایک سکہ بند ہستی میں بدل دیا۔ لفظ/متن کیا پیدا ہوا عورت کی موت واقع ہوگئی۔ثروت خان انسانی فکر کے اس متعصبانہ اور خود غرضانہ میلان کے خلاف اپنی آواز بلند کرنے والی ایک ایسی ادیب ہیں جو عورت کی صدیوں سے دبی کچلی زخم خوردہ، پارہ پارہ انانیت اور اس کی سنگین نفسیاتی نتائج سے انسانیت کو آگاہ کرنے کے درپے ہیں۔انہوں نے جا بجا ادب کے ساتھ مربوط کر کے تاریخ، تہذیب اور سماج کا حوالہ دیا ہے۔ان کے یہاں فکر و نظر کی پختگی بھی ہے اور ان کے قابو میں ایک صاف و شفاف زبان بھی ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ تنقید یا طنز و مزاح کا میدان خواتین کے لیے تنگ ہے۔اگر وہ پادری، قانون ساز، طبیب (یونانی اور آیورویدک کے حوالے سے) فلسفی، محقق اور سائنسداں نہیں بن پائی تو اسے

مواقع فراہم کرنے والے معاشرے (جس میں مردوں کو بالا دستی حاصل ہے) کا قصور ہے نہ کہ عورت کا۔ثروت خان نے ایسے کئی مقبول عام بھرم توڑنے کی کوشش کی ہے۔وہ جن فکشن نگاروں کے رویوں کو زیر بحث لائی ہیں ان کا محور بھی ان کا تانیثی میلان ہے۔وہ متن کے ساتھ تحت المتن تک پہنچتی ہیں۔انہوں نے کرید کرید کر عورت کے ایک ایک زخم کا اپنے بے حس معاشرے سے حساب مانگا ہے۔

☆☆

ثروت نے 'تانیثی ادب' کے وسیع الذیل عنوان کے تحت 'نسائی ادب کی سمت و رفتار' کے ذیلی عنوان سے بھی ایک مضمون شامل کیا ہے۔ان کے قاری کے لیے یہ طے کرنا مشکل ہوگا کہ نسائی ادب کا شمار کیوں تانیثی ادب میں نہیں کیا جاسکتا اور کیا دونوں اپنے معنی اور تصور میں ایک ہی ہیں۔ظاہر ہے انہوں نے نسائی ادب میں انہی امور کو اپنی تحریر کا حصہ بنایا ہے جو دوسرے مقامات پر تانیثیت کے ذیل میں آتے ہیں۔ Ecriture Feminine یا Faminine Writing یعنی عورتوں کی تحریر بھی ایک معروف اصطلاح ہے۔شووالٹر کے نقطۂ نظر سے دیکھیں تو اس نے مغرب میں عورتوں کے ادب کی تاریخ کے تین مرحلے بتائے ہیں:

۱۔ a faminine phase نسوانی مرحلہ (۱۸۴۰ تا ۱۸۸۰) جس کے تحت خواتین مصنّفین مرد ادیبوں کے اصولوں اور فن کارانہ معیاروں کی پیروی کرتی ہیں۔

۲۔ a faminist phase تانیثی مرحلہ (۱۸۸۰ تا ۱۹۲۰) جس کے تحت خواتین، مردوں سے الگ اپنا ایک تشخص قائم کرنے کے درپے نظر آتی ہیں۔

۳۔ a female phase، نسائی مرحلہ اس کے تحت خواتین کے ادب میں ان کی اپنی آواز، ان کی اپنی شناخت، ان کے اپنے اسلوب، ان کے اپنے تجربات اور ان کی اپنی انفرادیت کو واضح طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔

ظاہر ہے ہمارے یہاں خواتین کے ادب کو بالخصوص اس طور پر تاریخ وار نہیں دیکھا جا سکتا کیونکہ موجودہ دور میں ہمیں یہ تینوں شقیں تاریخ وار نہیں متوازی ملتی ہیں اور شووالٹر کے قائم کردہ ان زمروں سے بھی اختلاف کی گنجائش ہے۔ثروت نے عورتوں اور بالخصوص نسائی ادب کو پیش آنے والے چیلنجز کا بڑی عمدگی سے کچا چٹھا پیش کیا ہے۔

ہیلن لکساؤ کا کہنا ہے کہ ایک ایسا ادب بھی ہے جو اپنے اسلوب، زبان، لب و لہجے اور محسوسات ہی نہیں مکمل طور پر مردوں کی زبان اور ڈسکورس سے مختلف ہوتا ہے...... لیکن اس کا سبب حیاتیاتی تفریق نہیں ہے۔خواتین اکثر مردوں کے ڈسکورس میں اور مرد خواتین کے ڈسکورس میں یعنی نسائی اسلوب میں لکھتے ہیں۔

ثروت خان ایک معروف فکشن نگار ہیں۔ جہاں تک میرا سوال ہے مجھے تخلیق کاروں کی لکھی ہوئی تنقیدوں میں زیادہ لطف آتا ہے۔ جب بھی تنقید تخلیق کے پندار کو توڑ کر کسی نئے نکتے سے آگاہ کرتی ہے یا کسی ایسی گرہ کو کھولتی ہے جو ابھی تک ہماری نظروں سے اوجھل تھی یا جسے کھولنے سے ہم معذور تھے تو وہ لمحہ یقیناً ہمارے لیے اس انبساط افزا لمحے سے کم نہیں ہوتا جس کی توقع ہم کسی بھی اچھی تخلیق سے کر سکتے ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تخلیق کار کے ذہنی تجربے نقادوں سے مختلف ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی نقادوں کے علم کا باران کی تحریروں پر اتنا حاوی ہو جاتا ہے کہ 'تخلیق' بہت پیچھے رہ جاتی ہے۔ تنقید اتنی بوجھل ہو جاتی ہے کہ اسے ہضم کرنا تو دور ایک ڈیڑھ صفحے کے بعد پڑھنے کے لیے دل کو بہت مارنا پڑتا ہے۔ اس کے برعکس بعض تخلیقی فن کاروں کے تنقیدی شذرات اتنے سرسری اور کھوکھلے ہوتے ہیں کہ انہیں دور ہی سے سلام کرنے کو جی چاہتا ہے۔ ثروت نے 'شورشِ فکر' کے دیباچے میں اپنے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''ادبی تنقید کے میدان میں تخلیق کار کا فکری اور نظریاتی نظام ایک روایتی ادبی نقاد سے یکسر علیحدہ ہوتا ہے۔ تخلیق کار اشیاء کو اپنے طور پر جانچتا پرکھتا ہے، اس کی تخلیقی صلاحیت اور تنقیدی شعور مشترکہ طور پر اس کی فکری بصیرت کی آبیاری کرتے ہیں اور یہی فکری بصیرت کبھی کبھی تخلیق کار کا رُخ تنقید کی طرف موڑ دیتی ہے اور جب وہ تنقید کرتا ہے تو اس کا پیرایۂ بیان بھی تخلیقی نثر کے حسن سے مزین ہوتا ہے جبکہ ادبی نقاد ایک مخصوص اسلوب نگارش اور فکر و نظر کے دائرہ میں رہ کر اصول و ضوابط کی پاسداری کر کے متن کی قدر و منزلت طے کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ گویا تنقید کے میدان میں نقاد اور تخلیق کار کے تنقیدی نظریات، اس کی افہام و تفہیم کے زاویے اور نتائج اخذ کرنے کے طور طریقوں کی رہ گزر علیحدہ علیحدہ تو ہوتی ہے لیکن دونوں کی منزل ایک ہی ہوتی ہے یعنی متن کا تعینِ قدر۔ اس لیے دونوں کے تنقیدی نظریات میں کافی فرق ہوتا ہے۔'' (ص ۷)

ثروت نے محولہ بالا اقتباس میں جو باتیں کہی ہیں ان میں بہت جھول ہے۔ نقاد اور تخلیق کار کا طریق فکر ایک دوسرے سے علیحدہ ہو سکتا ہے لیکن نظریہ کیوں نہیں ہو سکتا؟ جہاں تک تخلیقی نثر کا تعلق ہے تنقید کا وہ سب سے بڑا عیب کہلاتی ہے۔ ثروت کی نثر بھی تخلیقی نہیں ہے جیسا کہ انہیں گمان ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی، وزیر آغا، آرنلڈ، ایلیٹ، اور بہت سے نقاد تخلیق کار بھی تھے۔ نقاد بھی۔ ان کی نثر کو تخلیقی نہیں کہا جا سکتا لیکن تخلیقی بصیرت ضرور ان کی تنقید میں کارفرما ہے۔ وہ تخلیقی بصیرت ہی ہے جو تخلیق میں سے ایک ہزار نکتے نکال لاتی ہے۔ زبان کو وہ ڈھیلا نہیں چھوڑتے، جبکہ تخلیق کار جنہیں خالص تخلیق کار کہاں جائے زبان کو قابو میں نہیں رکھ پاتے اور نہ کسی ایک مرکزی نکتے کو۔

ثروت خان نے اپنی نثر کو تخلیق کہا ہے۔تخلیقی نثر جذباتی ہوتی ہے اس میں استعارہ سازی کی بھی گنجائش ہوتی ہے جبکہ ثروت خان کی نثر جذباتی اور صحافتی ہے۔اسی ملی جلی نثر میں انہوں نے تجزیے بھی کیے ہیں وہ اردو ادب کی استاد ہیں۔آپ جانتے ہی ہیں کہ اردو کے جامعاتی استاد کے لیے تنقید لکھنا کتنا ضروری ہے اور اکثر مجبوری بھی۔اگر اس کی تنقید بے مزہ، خشک، بودی اور محض لفاظی ہے تو ہم اس کے خلاف ایف آئی آر بھی درج نہیں کرا سکتے۔اکثر استاد اس علم و احساس سے محروم ہوتے ہیں کہ تنقید بڑے جان جوکھوں کا کام ہے۔نقاد کو مصنف بھی کہا جاتا ہے لیکن وہ ایسا مصنف ہوتا ہے جسے ہمیشہ سوال گھیرے رکھتے ہیں۔کوئی بھی دوکوڑی کا فن کار اسے ذلیل و خوار کرسکتا ہے۔اس کا گریبان پکڑ کر اس سے جواب طلب کرسکتا ہے۔اسی لیے ہمارے بیش تر تخلیقی فن کار تنقید کو ہوّا سمجھتے ہیں اور اگر نقاد نے تعریفوں کے پل باندھنے کے بعد تھوڑی سی ٹیڑھی نظر دکھائی تو سمجھ لو اس کی خیر نہیں۔ چاروں طرف سے ہمارے تخلیقی فن کار اس پر پل پڑتے ہیں۔ہمارے رسائل میں مکتوباتی حصہ کا مطالعہ کافی ہوگا جو احباب نوازی کا خاصا بڑا اکھاڑہ ہوتا ہے۔

ثروت ایک سنجیدہ ادب کی استاد ہی نہیں ادب کی طالب علم بھی ہیں۔فکشن نے ان کے ذہن کو پہلے ہی مانجھ دیا ہے۔وہ ان تخلیقی فن کاروں میں سے نہیں جن کے ذہن کی یتیمی ان کی زبان اور ان کی فکر میں نظر آتی ہے۔ وہ جانتی ہیں کہ تنقید اگر ایک علیحدہ ڈسپلن ہے تو اس کے تقاضے کیا ہیں۔اور اس کا منصب تخلیق کے منصب سے کیونکر مختلف ہے۔تخلیق کار اپنے عمل میں ایک قبائلی ہوتا ہے۔اسے میمنہ سے کوئی غرض ہوتی ہے نہ میسرہ سے۔وہ اپنے آپ کو دنیا کا سب سے بڑا آمر، سب سے بڑا مارشل، سب سے بڑا مطلق العنان سمجھتا ہے۔وہ ہزار نقاد کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھے اور بظاہر اسے اپنے سروں پر بٹھانے کا مظاہرہ کرے لیکن اندر ہی اندر وہ اسے اپنے سے کم تر، بھڑ بھڑیا، گھمنڈی، بیگانہ خو، انا گزیدہ اور نہ جانے کیا کیا گردانتا ہے۔ میں جب ان حقائق کا شمار کر رہا ہوں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے سارے تخلیق کار اس قماش کے ہیں اور سارے نقادوں کے خنّاس اسی طرح بگڑے ہوئے ہیں۔

ثروت خان کے بعض مضامین ادھر ادھر پڑھنے میں آئے تھے، لیکن ہر مضمون اور دوسرے مضمون کے درمیان وقت کا اتنا فاصلہ تھا کہ ذہن میں کوئی ایک مکمل نقش نہیں بن سکا تھا۔یہ تو معلوم ہے کہ انہیں پوری آواز میں بات کرنے، لگی لپٹی کے بغیر صاف گوئی اور برملا کہنے کا چسکا ہے۔ظاہر ہے جو بے حد خطرناک چسکا ہے۔وہ چمکارتی ہی نہیں غصہ بھی نکالتی ہیں۔کہیں وہ شاکی نظر آتی ہیں، کہیں ڈانٹتی ہوئی اور کہیں احتجاج کرتی ہوئی۔ ہمارے دور کی

شاعرات کی زبان اکثر دراز ہو جاتی ہے۔ کڑواہٹوں سے بھری ہوئی، وہ آپے سے باہر ہونے کا کوئی موقعہ نہیں چھوڑتیں۔ شاعرات کے یہاں یہ چیز ایک معمول سا بن گئی ہے۔ ثروت خان ایک فکشن نگار ہیں اور فکشن نگار خواتین کا معاملہ شاعرات سے ذرا مختلف ہے۔ وہ اپنی بھڑاس افسانے یا ناول کے فارم میں نکال لیتی ہیں۔ یہ کیوں ہے کہ قرۃ العین، جمیلہ ہاشمی، سائرہ ہاشمی، خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور، بانو قدسیہ، ترنم ریاض یا زاہدہ حنا کے زبانی ڈسکورس یا مباحثوں میں ان کے منہ سے جھاگ نہیں نکلتے۔ ثروت خان کی برافروختگی میں ایک حدِّ ادب ہے۔ ان کے احتجاج میں استدلال کی آمیزش ہے۔ وہ اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں نہیں مارتیں۔ قومی اور بین الاقوامی سطح پر کیا کچھ رونما ہو رہا ہے۔ اخبارات کی سرخیاں عورت کے خون سے اور زیادہ سرخ کیوں ہوگئی ہیں۔ مرداساس معاشرے کی صدیوں سپرورش یافتہ اَنا کا کفر کیوں نہیں ٹوٹتا؟ اب جبکہ ہر چیز خرید و فروخت کی ہے وہ لفظ اور خیال ہی کیوں نہ ہو ایسے معاشرے میں سب سے کمزور سمجھنے والی مخلوق عورت اور بچہ ہی ہے اور دونوں ہی بے بس اور بے کس ہیں۔ ثروت خان نے تانیثیت کے تحت سوال نہیں قائم کیے ہیں بلکہ ہمارے ترقی یافتہ تہذیبی دور کے یہی تلخ ترین حقائق ہیں۔ ثروت خان کے چوبیس مضامین میں سے گیارہ مضامین کا جھکاؤ تانیثی ادب سے متعلق ہے۔ ان مضامین میں ان کی ذہانت اور بصیرت کی سطح بہت بلند ہے۔ انہوں نے پوری ذمہ داری کے ساتھ پہلے ہوم ورک کیا ہے۔ ہمارے عہد کی چکاچوند کرنے والی بالائی سطح سے نیچے انسانیت کس طور پر پامال ہورہی ہے۔ اعلیٰ اقدار انسانیہ کو کس طور پر ملیا میٹ کیا جارہا ہے۔ اور مذہب، سیاست کا اور سیاست مذہب کا کس کس طریقے سے آلۂ کار بنتا جا رہا ہے اور سیاست کیوں انسان متعلق Human Concern نہیں ہے؟ ہمارے ادوار کا یہ بہت بڑا المیہ ہے کہ ہمارا دور سنگدلانہ سیاست کا دور ہے جو مرداساس ہے۔ مذہب و اخلاق بھی مرداساس، انتظامیہ بھی مرداساس۔ خواب بھی مرداساس اور اس کی تعبیریں بھی مرداساس۔ ثروت خان کو اگر مقتدرہ کے خلاف غم و غصہ ہے تو وہ قطعی بے بنیاد نہیں ہے۔ اردو سماج ابھی تک 'عورت کی پوری آواز' کو برداشت کرنے کا اہل نہیں ہوا ہے۔ ثروت خان نے غم و غصہ کا اظہار کیا ہے لیکن یہ غم و غصہ ایک ایسے فن کار کا غم و غصہ ہے جسے اپنے لفظوں کا پاس ہے۔ انہوں نے پوری ذمہ داری کے ساتھ ان تلخ ترین حقائق کی پردہ دری کی ہے جو مجموعاً ہماری بے حسی کے زائدہ ہیں۔ انہوں نے یہ تاثر عمرانی تاریخ سے حاصل کیا ہے۔ وہ کل بھی درست تھا اور آج بھی درست ہے۔ عورت کو کسی بھی دور میں ذہن وضمیر کی آزادی نصیب نہیں ہوئی۔ اسے اپنی شخصیت کو اپنے طور پر متشکل کرنے کے حقوق حاصل ہوئے اور نہ اس کے جذبات کی کوئی قیمت سمجھی گئی۔ ثروت خان نے ان معاشرتی حقائق کو پورے اعتماد کے ساتھ زبان دی ہے اور

اردو افسانے میں اس کی بدلتی ہوئی تصویروں کا تجزیہ بھی کیاہ۔ تجزیہ، تنقید کے تفاعل کی ریڑھ کی ہڈی ہے۔ اگر چہ وہ بار بار جذباتی بھی ہو جاتی ہیں لیکن ان کی کوشش ہوتی ہے کہ معقولیت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے۔ معقولیت اس معنی میں کہ "انہوں نے جو کچھ کہا ہے، سچ کہا ہے سچ کے سوا کچھ نہیں کہا ہے" اور یہ سچائیاں صدیوں کا سفر طے کرتی ہوئیں ہمارے اسنام نہاد ترقی یافتہ دور میں بھی انسانیت کے لیے ایک چیلنج کا حکم رکھتی ہیں۔ ثروت خان نے کہیں صورت حال پیش کرنے پر اکتفا کیا ہے، کہیں اس کے محرکات پر بحث کیے، کہیں اس سوال سے بھی الجھی ہیں کہ صارفیت، بازارکاری اور عالم کاری کے نام پر کس طور پر ہم ایک نئی محکومی کو اپنے اوپر مسلط کرنے کے در پے ہیں۔ ثروت نے جابجا سوا سوالات قائم کیے ہیں۔ جن کے وہ جواب بھی فراہم کرتی ہیں لیکن انہیں جوابوں کی تہہ میں سے پھر نئے سوالات پھوٹ نکلتے ہیں:

- ان تمام ناولوں میں سے بیشتر میں عورت یا تو خودکشی کر لیتی ہے یا شوہر کا گھر چھوڑ دیتی ہے یا سکون کی تلاش میں بھٹکتی ہے۔ وہ مطمئن نہیں ہے، خوش نہیں ہے، کیوں؟
- کیوں اسے سخت و کرخت اور کھردرا بننے پر مجبور کر دیا جاتا ہے جس کی وجہ سے افسردگی، خود اعتمادی میں کمی اور بدگمانی جیسے داخلی نوعیت کے محسوسات اسے ابنارمل بنا دیتے ہیں۔
- طبقۂ نسواں کے لیے اخلاق کی پاسداریاں، طبقۂ نسواں کے لیے مذہب کی جکڑ بندیاں، طبقہ نسواں کے لیے اخلاق کی پاسداریاں، طبقہ نسواں کے لیے شرم و حیا کی حد بندیاں، طبقۂ نسواں کے لیے عزت کی دہائیاں، طبقہ نسواں کے لیے اور ساری بے شرمیاں — طبقہ رجال کے لیے۔
- دراصل منافع کا حصول جب اولین ترجیح بن جائے تو پھر عورت کا وقار اور سماج میں اس کے مساوی حقوق کی بات نعرہ بازی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔

لیکن وہ صرف خواتین ادیبوں کے مسائل ہی پر اکتفا نہیں کرتیں ایسے مسائل کو بھی موضوع بحث بناتی ہیں جن کا تعلق پوری انسانیت سے ہے۔ گفتگو کا رخ نسائی ادب اور محض خواتین کے مسائل کی طرف سے مڑ کر موجودہ عالمی صورت حال کی طرف ہو جاتا ہے۔ انہوں نے ایک سوال میں بیک وقت کئی سوال ہمارے سامنے رکھ دیے ہیں:

"ہمارے علم و عمل میں عجلت پسندی اور قول و فعل کی عدم پختگی اس قدر حاوی ہوگئی ہے کہ کہیں نہ کہیں کتاب کے باسی پن کو فروغ ملا ہے اور معنیٰ و مفہوم، وجود و شناخت سے وابستگی کی ہمواری میں خلل پیدا ہونے لگا

ہے علوم انسانی کا پہیہ اپنی دھری پر گھومتے گھومتے اپنے مرکز سے ذرا کھسکتا ہوا نظر آرہا ہے۔ تیرا میرا ہی نہیں بلکہ ساری دنیا کا وجود ہی خطرے میں پڑ گیا ہے۔ عورت مرد ہی نہیں بلکہ فرد کی شناخت کا مسئلہ ہی انتہا کی حدوں کو پار کرتا ہوا نظر آرہا ہے چنانچہ ایسے حالات میں اہل دانش، اور صاحبانِ علم و ادب کی ذمہ داری ہے کہ وہ اسے دوبارہ بنی نوع انسان کی زندگی کا مرکز و محور بنانے کی جدو جہد کریں اور پورے انہاک سے اپنے قلم اور وژن کا حق ادا کرنے کی طرف عصری تقاضوں کے تحت گامزن ہوں اور اگر گامزن ہیں تو یہ معلوم کریں کہ آخر ان کی سمت و رفتار کیا اور کیسی ہے کہ ادب و کلچر کی بقا پر ہی سوالیہ نشان کیوں کھڑا ہو گیا ہے؟ (ص ۴۷۔۴۶)

ثروت کے ایک مضمون کا عنوان 'تانیثی ادب میں طنز و مزاح کے عناصر' ہے جس میں طنز کی مثالیں تو ہیں مزاح برائے نام بھی نہیں۔ یوں بھی عالمی ادب میں 'مزاح کی موت' واقع ہو چکی ہے اور خواتین صدیوں سے بھٹکتی ہوئی آرہی ہیں، ان کا زیادہ وقت factitious joy یعنی بناوٹی مسرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے گزرا ہے۔ شاید اسی لیے 'مزاح' کے ساتھ وہ کم ہی انصاف کر پاتی ہیں۔ اس ذیل میں 'میرا کا تصور عشق اور اس کی معنویت' اور 'میواڑ کے صوفی سنتوں کی شاعری' قابل قدر مضامین ہیں جو یہ ترغیب دیتے ہیں کہ اردو شعر و ادب کے علاوہ عوامی ادب نے جن بصیرتوں کا اظہار کیا ہے ان کا علم ہمارے لیے بھی کس قدر لازمی ہے۔ ثروت نے ان مضامین میں کافی محنت اور تلاش کی ہے۔ 'پار پرے' اور 'رشید جہاں کے افسانوں کے تجزیے' پوری طرح ان کی تنقیدی حسیت کے مظہر ہیں۔ باقی دوسرے مضامین سے بھی ثروت کی فکر، ان کے مطالعے کی کثرت، ان کی سوجھ بوجھ کا پتہ چلتا ہے۔ ایک تخلیق کار کی حیثیت سے اُنھیں عالمانہ قسم کی تنقید کے بجائے اپنے قاریانہ تاثرات ہی رقم کرنے کی طرف توجہ دینی چاہیے۔ بہت زیادہ کسی بندھی تنقید کو بدمزہ ہونے میں دیر نہیں لگتی۔ ثروت خان بہت فہیم ہیں اس نکتے کو بخوبی سمجھ گئی ہوں گی۔

اردو زبان ہی نہیں ایک تہذیب کا نام ہے

عورت کی مختلف شکلوں کو پیش کرتی کہانی

پروفیسر علی احمد فاطمی

اردو کہانی تقریباً سو سال کا سفر طے کر کے آج جس مقام پر پہنچی ہے اس میں خواتین افسانہ نگاروں کی خدمات سے انکار ممکن نہیں۔ رشید جہاں، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، جیلانی بانو سے لے کر ذکیہ مشہدی، ترنم ریاض، نگار عظیم وغیرہ تک ایک لمبا سلسلہ ہے۔ جس میں اب ایک نام ثروت خان کا بھی جڑ گیا ہے۔ اس لمبے سفر کے مختلف ادوار ہیں۔ مختلف حادثات اور اتار چڑھاؤ لیکن ان سب کا محور و مرکز کل بھی عورت تھی اور آج بھی عورت ہی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ مختلف اور بڑی سوچ رکھنے والی خواتین افسانہ نگار نے اس کے سماجی و معاشرتی اسباب بھی تلاش کئے اور اسے وسیع تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی پھر بھی عورتوں کی بیجا حمایت سے وہ بھی بچ نہ سکیں اس میں ان کے عورت ہونے کا دخل ہے۔ بہر حال مرد اور عورت کائنات کی افضل ترین تخلیق کے دو پہلو ہیں۔ لازم و ملزوم اور ایک دوسرے کے لئے نامکمل پھر بھی تضاد اور تصادم کیوں نظر آتا ہے؟ اسی بنیادی سوال اور مسئلہ کے ارد گرد خواتین افسانہ نگاروں کا سرمایہ بکھرا پڑا ہے۔

ثروت خان کے افسانوی مجموعہ ''ذروں کی حرارت'' کو بھی ہم ان معاملات اور خیالات سے الگ کر کے نہیں دیکھ سکتے۔ اس میں اٹھارہ کہانیاں ہیں۔ پہلی ہی کہانی میں 'مرد مار بھلی' میں مرکزی کردار کیرتی کا ہے جو بچپن سے ہی اپنے باپ کے ذریعہ اپنی ماں پر ظلم دیکھتی آئی۔ یہ چنانچہ اس کی ایک نفسیات بن جاتی ہے پھر اس کی دکھیاری ماں کی یہ خواہش نفسیات کی کمان بن جاتی ہے:

''بیٹی تجھے ایک دن بڑا افسر بننا ہے۔ سماج کے ان جواں مردوں سے کمزوروں بے بسوں اور لاچاروں کو نجات دلانا ہے۔ ایک بہادر عورت بن کر ناانصافی کے خلاف لڑنا ہے۔''

وہ پولس افسر بن جاتی ہے اور اسے ہر مرد ظالم دکھائی دینے لگتا ہے۔ چنانچہ ایسے روایتی جملے بھی درمیان میں آتے ہیں:

''اُف پڑھ کر بھی عورت بے وقوف کی بے وقوف ہے۔'' یہ جملے ایک دوسرے نسوانی کردار سنبل کے لئے ہے جو اپنے شوہر کے ظلم سہتی ہے پھر بھی اسے مجازی خدا سمجھتی ہے۔ دو متضاد کردار، ایک کمزور دوسرا مرد مار۔ کچھ روایتی سوچ، کچھ غصہ، کچھ مرد مجرم کی ضرورت سے زیادہ پٹائی جبکہ وہ یہ کہہ رہا ہے۔''میڈم آج اپن نے جرم قبول کرلیا تو پھر نا گہانی سزا اپن کو کیوں مل رہی ہے۔''

یہ معنی خیز جملہ صرف اس مرد مجرم کا نہیں بلکہ مرد مار کیرتی نے پوری مرد قوم سے کہلوانا چاہا ہے۔ اسی طرح ترشنا میں لمبے قد والی لڑکی خاندان کے طعنے سن سن کر اپنے آپ کو سخت کر لیتی ہے اور طعنہ کو چیلنج میں بدل کر مس ورلڈ کا مقابلہ جیت جاتی ہے۔ طعنہ کو چیلنج میں بدلنا ایک صحت مند عمل ہے لیکن سخت اور بیمار پولس افسر یا مس ورلڈ بننا کیا مسئلہ کا مستقل حل ہے؟ دراصل کرداروں کے نفسیاتی پہلو اور اُن کے پیچ وخم کی اندھی گلیاں اور اُن گلیوں سے فراریت کا جذبہ ان دونوں کرداروں کے عمل کو مترشح کرتا ہے۔

ڈرائی ڈیکوریشن تقرر، حسن کا معیار وغیرہ میں بھی مرکزی کردار عورت ہی ہے۔ مدھو، صبا، فرحت، سونیکا، سیتا وغیرہ کے نام سے کہیں بیوی، بیٹی، بہو یا محبوبہ کی شکل میں ان سب میں کہیں روایت ہے تو کہیں روایتی جدّت لیکن اکثر میں حقیقت اور معروضیت ہی ہے۔ ثروت خان نے ان کہانیوں میں عورتوں کے بارے میں اگر اس قسم کے روایتی سوالات قائم کئے ہیں۔ مثلاً

''کیا لڑکی کا حسن صرف کسی لڑکے کی پسند کے لئے ہوتا ہے؟

(میں مرد مار بھلی)

''گویا مرد سے مار کھانا اس کی زندگی کا اہم حصہ ہے۔'' (مردانگی)

''پھولوں سے کانٹوں تک اس سفر کو طے کرتے ہوئے خود اسکی شناخت اور اسکا وجود کہاں کھو جاتا ہے''

(ڈرامائی ڈیکوریشن)

تو دوسری طرف ان کی وہ کہانیاں ہیں جہاں نسوانیت، فطرت سے قریب ہوکر زندگی کی روشن قدروں سے وابستہ ہو جاتی ہے اور ارتقائے حیات میں اپنا اہم رول ادا کرتی ہے بس ذرا توازن اور تفاخر سے دیکھنے اور سمجھنے کی ضرورت ہے کہ عورت کی حسیت، قبولیت اور خصوصیت نے کائنات کے نگار خانے کو صرف شباب سے ہی نہیں محبت اور ممتا سے بھی سجا رکھا ہے۔ ان کی ایک مختصر لیکن بیحد مؤثر کہانی 'سمرپن' ہے۔ جس میں ایک نرم و نازک ہرنی اپنے شکاری کے خوف سے پہلے تو اپنی جان بچاتی ہے پھر تحفظ کا یقین ہو جانے کے بعد اس کے اندر اطمینان و

انبساط کا احساس جاگتا ہے پھر وہی شکاری اسے اچھا لگنے لگتا ہے۔ اور وہ سپردگی کے جذبات سے مچلنے لگتی ہے۔ 'اب میں نے جان لیا ہے' جملہ بے حد معنی خیز ہے لیکن اب شکاری غائب ہے۔ جب عورت اصل محبت پانا چاہتی ہے تو وہ محبت غائب ہو جاتی ہے اور جب وہ ایک انسان کی طرح جینا چاہتی ہے تو اس کا شکار کیا جاتا ہے۔ قابل غور بات یہ ہے کہ یہ احساس گھر کے باہر جنگل اور سنگھرش سے جاگتا ہے۔ اس کہانی کی تعریف معروف فکشن نگار جوگندر پل نے بھی کی ہے۔ (شورشِ فکر صفحہ ۲۵۰)

یہ سچ ہے کہ گھر سماج کی پہلی اور بڑی اکائی ہوتا ہے لیکن پھر بھی زندگی صرف گھر تک محدود تو نہیں۔ جہاں ثروت خان گھر سے باہر نکلی ہیں ان کی باہری سوچ کو پر ملے ہیں۔ سماج اور حیات سے متعلق انکی فکر کو جست اور پرواز ملی ہے۔ اس کی بہترین مثالیں ہیں زندگی اور موت، چوتھا کھونٹ، مردانگی اور لوک عدالت۔

چوتھا کھونٹ اساطیری انداز میں ایک شہزادے کی کہانی ہے جو منع کرنے کے باوجود چوتھے کھونٹ کی طرف چلا جاتا ہے وہاں جاکر اسے جو مناظر دیکھنے کو ملتے ہیں وہ اس مکروہ دنیا کے مناظر ہیں جہاں نیکی و بدی، شرافت و غلاظت سب گڈمڈ ہو جاتے ہیں اور یہ جملے کہانی کے بطن سے پھوٹتے ہیں:

''یہ کیسا نظام ہے۔ نا خارج کا پتہ نہ باطن کا۔ خارج میں تضاد۔ باطن میں تضاد، خارج بھی بدشکل۔ باطن بھی بدشکل۔ سب کچھ بدشکل۔ ظلم، جور، تشدد، ناہمواری۔ بے ربطی اور غیر ہم آہنگی کا عجیب اور بھیانک کھیل۔ عجیب کھلاڑی کیسا معاشرہ۔ کیسی تہذیب۔ کیسا تمدّن۔ سب تتر بتر۔ سب کچھ درہم برہم۔''

اس دنیا کے گورکھ دھندے کو سمجھ پانا بہت مشکل ہے۔ اسی سے سماجی المیے جنم لیتے ہیں جو زندگی اور موت، مردانگی جیسے افسانے میں ڈھل جاتے ہیں۔ راجستھان کی زمینی فضا میں ڈوبے یہ افسانے ہرچند کہ دیہات کی عام سی عورتیں رامی اور مانگی کے رنج والم اور غریبی، بے بسی کی کہانیاں ہیں لیکن ثروت خان نے اسے راجستھان کے لال پیلے صافوں۔ رنگ برنگے گھاگھروں اور وہاں کی مقامی بولیوں کے درمیان سے اُبھار کر بالکل ایک نیا رنگ دے دیا ہے جس سے یہ کہانیاں اردو کی منفرد کہانیاں لگتی ہیں ایسی کہانیوں کا بھرپور استقبال کرنا چاہئے اور ہوا بھی ہے کیونکہ اردو کہانی ایک نئے کلچر سے آشنا ہوئی ہے۔ ایسی ہی ایک غیر معمولی کہانی ہے لوک عدالت اس مجموعہ کی سب سے آخری کہانی جو اپنے تھیم اور پیش کش کی وجہ سے سب سے اچھی اور مؤثر کہانی کہی جاسکتی ہے۔ راجستھان کے راجپوتوں کا معیار اور کردار، شجاعت اور رعونت۔ جہاں اپنے سگے کی موت پر بھی رونے میں توہین ہے۔ یہ جملے دیکھئے:

''ارے تو ان راجپوتوں کو نہیں جانتا۔ان کی عورتیں موت پر روتی نہیں چاہے وہ اپنا ہی مرد کیوں نہ ہو۔ رونا آئے بھی تو ضبط کر لیتی ہیں۔

بھلا وہ کیوں؟ روتے تو سبھی ہیں۔سبھی جن مانس ہیں پھر عورتیں تو کمزور دل کی ہوتی ہیں سب سے زیادہ وہی روتی پیٹتی ہیں۔

ہاں چھوٹی رانی صاحب کو رونا آ رہا تھا مگر بڑے کنورانی صاحب نے انہیں آنکھیں دکھائیں تو انہوں نے اپنے منہ میں آنچل ٹھونس لیا..........

''..........یہ تو ظلم ہے بھیا۔''

''اب ظلم ہی سہی رسم و رواج تو نبھانا ہی پڑتا ہے۔لوک لاج بھی کوئی چیز ہے۔''

کرائے پر رونے والی عورتیں جاتی ہیں۔ان کرداروں کی اپنی ایک الگ کہانی ہے۔غریب لٹی پٹی یہ عورتیں رابعہ،نور جہاں وغیرہ کرایہ پر جا کر روتی ہیں جہاں اپنے غم کو دوسروں میں ڈھال کر روتی ہیں اور خوب روتی ہیں کہ ان آنسوؤں میں دنیا جہان کے غم نہ صرف سمٹ آتے ہیں بلکہ مشترک ہو جاتے ہیں اور پھر ایک سوال ابھرتا ہے۔''یہ انسان کو آخر کیا ہو گیا ہے؟''اور کہانی راجستھان سے نکل کر عام انسان کی ہو جاتی ہے اور یہی تخلیقی عظمت ہے جہاں حسن،شباب،اظہار و نمائش سب پھیکے پڑ جاتے ہیں اور انسان کی آنکھوں سے بہتا ہوا آنسو،اس کے جسم و جاں سے لپٹا ہوا غم دائمی قدر اختیار کر لیا ہے جہاں علاقہ،ذات پات اور عورت و مرد کا فرق ختم ہو جاتا ہے۔زندگی اور انسان کے تئیں یہ نظریہ خوبصورت عورتوں کو کنارے کر کے رامی،مانگی،رابعہ جیسی غریب و معمولی عورتوں کو زندگی عطا کر دیتا ہے۔اور وہ بڑے کردار بن کر ابھرتی ہیں۔زندگی،معاشرت اور حقیقت میں ڈوبا ہوا ثروت کا یہ رویہ ہی ان کے ان نسوانی کرداروں کو دھنا،رانو،آنگی،ثریا،گوری،لاجونتی وغیرہ جیسے زندہ جاوید کرداروں کے قریب کر دیتا ہے۔

ثروت خان کا تخلیقی سفر بے حد دلچسپ ہے۔شورش فکر میں انہوں نے خود اس سفر کو بہ خوبی بیان کیا ہے۔انہوں نے ہمیشہ روایت سے یکسر انحراف کیا ہے جو بہت مشکل ہوتا ہے پھر بھی انہوں نے''محبت کا شجر''لگا کر جو اپنی کہانی دہرائی ہے اور جو شعور پروان چڑھا ہے اور جس سے ان کا اپنا فکری و تخلیقی کردار تعمیر ہو سکا اس کے بطن سے نکلی ہوئی یہ کہانیاں نسائیت اور انسانیت کے ملے جلے آہنگ کا پتہ تو دیتی ہیں لیکن اس کی تان انسانیت پر ہی ٹوٹتی ہے۔آخر کیا وجہ ہے کہ جن عورتوں کے حسن و شباب پر وہ زور دیتی ہیں اور ایک عورت ہو کر عورت کے گورے رنگ

اور سڈول پنڈلیوں کا ذکر بھی کرتی ہیں۔ گھنگھرو اور گھونگھٹ کا بھی ذکر ملتا ہے لیکن وہ سب اتنا متاثر نہیں کرتا جتنا کہ رامی کی محنت اور محبت اور مانگی کی جرأت و جسارت۔ زندگی کے یہ وہ کربناک پہلو ہیں جہاں بڑے بڑے فلسفے اپنا سر جھکا دیتے ہیں اور ایک نئے قسم کی انسانی جمالیات اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ اس نئی جمالیات کے دو مناظر آپ بھی ملاحظہ کیجئے:

''عورتیں دیکھو کیسی گرمی میں اپنے لوگڑے کو سر پہ منڈے ہوئے ہیں۔ نیم برہنہ چھاتی پنڈلیوں تک اونچا گھاگھرا اور گھونگھٹ اتنا لمبا کہ کیا مجال جوان کے سر کا ایک بال بھی دکھ جائے۔''

یا

''تین دولہے اور تین دلہنیں۔ مزے کی بات یہ تھی کہ صرف آٹھ نو سال کے درمیان دولہوں کی عمر اور چار پانچ سال کے درمیان دلہنیں۔ جنہیں نہ حال کی خبر نہ مستقبل کا پتہ......زندگی کے مشکل سفر کے یہ معصوم مسافر اور نادان کاروان۔''

ایسے خوبصورت تخلیقی جملوں سے سجی ہوئی کہانی اس وقت عروج پر پہنچتی ہے جب بھری بس میں ایک بیوی اپنے شوہر کے ذریعہ ذلیل ہوتی ہے اور بیوی کا ہاتھ احتجاج میں ہوا میں لہرا جاتا ہے یا رامی کا پاگل پن ایک عورت اور ماں کی ممتا کا نقطۂ عروج تو ہے ہی بڑی سے بڑی امیری اور دانشوری کا مذاق بھی اڑاتا ہے۔ یہ کہانیاں انسانی مسئلہ کی شکل میں ظاہر ہوتی ہیں اور یہ درس بھی دیتی ہیں کہ زندگی کی سچائیوں اور حقیقتوں کی اپنی جو کیفیات اور جمالیات ہے وہ مہک زدہ حسن میں نہیں۔

آخر کیا وجہ ہے کہ اس مجموعہ کی بدصورت عورتیں خوبصورت جوان عورتوں پر حاوی ہو جاتی ہیں اور ان کے کردار زندگی کی بڑی حقیقتوں سے واقف کراتے ہیں۔ اچھی بات یہ ہے کہ ثروت خان اس علم وشعور سے واقف ہیں اور ان کا فنکارانہ اظہار بھی اپنی جگہ بنانے میں کامیاب ہوا ہے۔ ورنہ ان کی ابتدائی کہانیوں میں کہیں کہیں بیجا حمایت اور جانب داریت جھلکتی ہے یہ ایک فطری عمل ہے لیکن جیسے جیسے فکری عمل نے بلوغیت کے در وا کیے۔ اُن کے یہاں احساس کی پختگی، زبان و بیان کا منفرد اثر اور بیانیہ کا مخصوص اور کٹیلا بانکپن اردو افسانہ نگاری میں انہیں الگ مقام عطا کرتا ہے۔ مثال کے طور پر اُن کی کہانیاں انکشاف، وہم نزاکت، پوکھرن کی زمین اور پلٹ اے گردشِ ایام، اردو کے اہم افسانوں میں شمار کیے جاسکتے ہیں۔ ان کہانیوں میں موضوعات کے تنوع کے باہم کہانی پن اور کرداروں کے فکر وعمل نے ثروت خان کو تانیثیت کے دائرے سے باہر نکالا ہے۔ ایک شور، ایک زور، ایک جوش

اور ولولہ انگیزی جس طرح اُن کے مجموعے کے ابتدائی کہانیوں میں نظر آتی ہے۔ وہیں بعد کے افسانوں میں ایک ٹھہراؤ، ایک فہم، ایک شعور، ایک بصیرت افروزی کی قوسِ قزح اپنا کمال دکھاتی ہے۔ جن میں نشاط، انبساط اور جمالیات، نشاطِ غم میں تبدیل ہوتے نظر آتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ ان افسانوں میں صرف خوبصورت عورتیں، خوبصورت زبان و بیان ہی نہیں بدصورت مسائل و مصائب بھی ہیں، ان کو اور خصوصاً مرد کو سمجھنے کی کوشش ہے جسے سمجھنا اتنا آسان نہیں، سمجھنا تو عورتوں کا بھی اتنا آسان نہیں۔ اسلیئے کنفیوژن ہے لیکن ثروت کے یہاں یہ کنفیوژن سبقت وقنوطیت کا اشارہ نہیں کرتا بلکہ افہام و تفہیم، ادراک و آگہی کی منزل پر کھڑا ہو کر اسے فلسفیانہ نظروں سے دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ کہانیاں اسی سماج، معاشرہ، انسانی رشتوں اور خاص طور پر مرد اور عورت کے رشتوں کو سمجھنے کی بہترین کوشش ہیں۔ مرد غالب کردار کی اکلوتی کہانی نہ ماضی نہ مستقبل میں ایسے سوالات کو سمجھنے کے عمدہ اشارے ہیں۔

ثروت کی کہانیاں زندگی اور معاشرہ کو سمجھنے میں معاونت کرتی ہیں اور ایک زاویۂ نظر دیتی ہیں۔ ساتھ ہی یہ اعلان بھی کرتی ہیں کہ آج کی خواتین افسانہ نگار کا سوچنے کا انداز بھی بہت کچھ بدل چکا ہے۔ کمزور نسائیت نے مضبوط حسیت کا روپ لیا ہے جو ان کہانیوں میں صاف نظر آتا ہے۔ متبدل تصورِ حسن اور عورت کی طاقت بھری نسائیت کو چھوتی ہوئی ثروت کی کہانیاں اکثر بڑے پیغام کی لو دے کر زندگی کی اقداری و استحصالی صورتوں کو روشن کرتی ہیں۔

انکشاف میں ایک نئی اور سفاک دنیا سے واقفیت ہوتی ہے وہیں دوسری طرف دودھیا ٹرین کے وہ مسافر جو دلی سے علی گڑھ کے بیچ کے گاؤں شہروں میں دودھ پہنچاتے ہیں اپنی دنیا میں مگن، اپنی باتوں میں مگن، انسانیت کے جذبے سے سرشار، پھٹے پرانے کپڑوں میں بھی مست ملنگ ہو کر گاتے بجاتے اپنا سفر طے کرتے ہیں۔ ہندوستان کی طبقاتی زندگی، معاشی بدحالی اور سرمایہ داروں کو عزت کی نگاہ سے دیکھنے کی نئی فیشنیبل نسل کا نظریہ، یہ سب کچھ اس افسانے کے بطن سے نکل کر قاری کے ذہن پر ہتھوڑے برساتا ہے۔ اور تفکرات کے ایسے ریگستان میں لے جاتا ہے جہاں سراب ہی پانی کا دھوکہ قرار پاتا ہے۔

اسی طرح ''وہم نزاکت، افسانہ شہری اور دیہاتی زندگی کی وہ جھلک پیش کرتا ہے۔ جس میں شہریوں کو شور شرابہ اور افراتفری کی زندگی سے پناہ کے لئے دیہات میں ''فارم ہاؤس'' کی تلاش ہے۔ یعنی تصنع و تکلف بھری زندگی سے سادگی اور امن و سکون کی طرف لوٹنا اور دیہات کی پر سکون فضا، سادہ لوحی، سچائی، وفا، کو گلے لگانے کا وہ

خواب جواَب شہریوں کے لئے ممکن ہی نہیں۔ثروت خان نے دورِ حاضر کے ترقی یافتہ دور میں انسان کی خواہشات کی تکمیل کے اس عروج کو دکھا کر، اُس کے ہاتھ خالی، دل مغموم، حسرت سے پر اور زندگی کی سب سے قیمتی اور اہم چیز سکون کی تلاش میں سرگرداں رہنا جیسے مدو جزر کو افسانے کی شکل میں ڈھالا ہے۔ صارفیت کے اس دور کی یہ بہترین کہانی ہے۔ جس میں شہری عورت ایک دیہاتی عورت کے حسن کو اس طرح نکھار رہی ہے کہ اُس کے ایک ایک عضو کا بیان کر کے حظ وانبساط کے دریا میں غوطے بھی لگاتی ہے اور کہیں نہ کہیں بازار کی چکا چوندھ اور بڑی بڑی کمپنیوں کے مہنگے پروڈکٹس کا مذاق بھی اڑاتی ہے۔

'اسی طرح پوکھرن کی زمین' افسانے میں ہندوستان پاکستان کی تقسیم کے بعد آج ستر اسی برس گزرتے کے بعد کی نسلوں کی اپنے اپنے ملک کے لئے حب الوطنی کا جذبہ، اور پرانی نسل کے دلوں میں تقسیم سے قبل کا درد اور پاکستان میں رہتے ہوئے بھی، ہندوستان کی یاد یہاں کی فضا، یہاں کی قومی یک جہتی کی یادیں اُن کے تصور کا بیش قیمتی سرمایہ ہے۔ فسادات پر بہت سا ادب تخلیق ہوا۔ جو اردو ادب کا سرمایہ ہے، لیکن آج کا ہندوستانی جب اپنے عزیزوں سے ملنے پاکستان جاتا ہے تو اسے وہاں نئی نسل کی سوچ اور سلوک سے سامنا کرنا پڑتا ہے، ملنے گیا ہے تو مہمان نوازی بھی ہو رہی ہے اور نا دانستہ طور پر طعن وتشنیع سے بھی دل چھلنی ہو جاتا ہے۔افسانے میں دونوں ملکوں کی سماجی، سیاسی، معاشی، علمی وادبی، تہذیبی وتمدنی حالات پر ہونے والے تبادلۂ خیال سے ثروت خان کی ذہنی پختگی کا بہ خوبی اندازہ ہوتا ہے وہ قاری کو اپنے ساتھ رکھنے اور اسے ہم خیال بنانے میں کامیاب نظر آتی ہیں۔

بلاشبہ ثروت خان اکیسویں صدی کی افسانہ نگار ہیں، یہ بات اُن کے افسانوں کی روح، اُن کی فضا، اُن کی افہام وتفہیم سے صاف واضح ہے، جہاں انسان، عورت مرد کے دائروں میں قید بھی ہے۔آزاد بھی ہونا چاہتا ہے، کوششیں بھی کر رہا ہے۔ عالمی سطح پر وہ ایسے تباہ کن راستے پر گامزن ہے جہاں اسے خود نہیں معلوم کہ اس راستے کی منزل ہے بھی یا نہیں...... یہ راستہ سیدھا ہے یا بے راہ روی کا ہے۔بس انہیں سوالات سے ہمیں ثروت خان کی کہانیاں آشنا کرواتی ہیں۔ جو واقعی اکیسویں صدی کی عورت، مرد اور انسان کی کہانیاں بھی ہیں، حالات وتضادات کی کہانیاں ہیں، تہذیب واقدار کی کہانیاں ہیں مثبت ومنفی رویوں کی کہانیاں ہیں۔

ثروتِ حیرت

پروفیسر غضنفر

اکادمی اسٹاف کالج علی گڑھ کے زیرِ اہتمام منعقدہ ایک ریفریشر کورس میں تربیت پانے والے اساتذہ میں سے ایک نے پروگرام کو آرڈی نیٹر ڈاکٹر طارق چھتاری کو ایک دن اپنی ایک تحریر دکھائی۔ تحریر دیکھ کر طارق چھتاری کی نگاہیں چونک پڑیں۔ طارق چھتاری نے وہ تحریر مجھے بھی دکھائی۔ اسے دیکھ کر میری بھی آنکھیں پھیل گئیں۔ ہماری حیرت کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ ایک جاندار تحریر تھی بلکہ وجہ یہ تھی کہ اس طرح کی تحریر اس نے پہلی بار لکھی تھی۔ ہم دونوں نے اس تحریر کی دل کھول کر تعریف کی۔ طارق چھتاری نے تو اس میں ایک آدھ تخلیقی پھونکیں بھی ماریں اور صاحب تحریر کو ایسے افسانوی گر بتائے اور فنکارانہ ٹپس دیے کہ جن کی روشنی میں وہ تحریر ''سمرپن'' نام کی کہانی بن کر لاہور سے نکلنے والے جریدہ تخلیق میں شائع ہوگئی اور جوگیندر پال جیسے کہنہ مشق اور جید افسانہ نگار سے بھی داد و تحسین وصول کرلی۔

طارق چھتاری کی پرفسوں تعریف اور سحر کارانہ پذیرائی نے صاحبِ تحریر کو ایسا مسحور اور متحرک کیا کہ اس کا قلم جو صرف نصابی نوٹس بنانے تک محدود تھا، اور ایک محدود گھیرے میں گھوما کرتا تھا، اب اس تنگ دائرے سے نکل کر تخلیق کی راہِ بے حصار پر بے روک ٹوک چلنے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کی رفتار نے ایسا زور پکڑا کہ کچھ دور جاتے جاتے اس نے کوئی درجن بھر افسانے لکھ ڈالے اور کچھ اور آگے بڑھ کر ایک ناول بھی صفحۂ قرطاس پر اتار دیا۔ اس کی شورشِ فکر نے ایسا ہنگامہ برپا کیا کہ اس کا قلم تخلیق کے میدانوں کے علاوہ تنقید اور دانشوری کے علاقوں میں بھی سیر کرنے لگا۔ اس نئے سفر کے دوران اس کے قلم کی روشنائی ایسی چمکی کہ منزل تک جانے والے سارے اندھیرے پگ روشن ہوگئے۔

اس کی پہلی تحریر تو حیرت کن تھی ہی، اس کے نئے تخلیقی سفر کی فتوحات بھی کم حیرت انگیز نہیں کہ اس نے بالکل ایک نئے میدان کے وہ بھی بہت کم وقت میں کئی معرکہ سر کرلئے۔ حیرانی کی بات یہ بھی ہے کہ یہ کام بلکہ کارنامہ کہنا چاہئے، پکی عمر کے ہاتھ میں آئے ایک کچے قلم نے انجام دیا۔ اس قلم نے جس کے لڑکھڑانے، بہکنے، پھسلنے، رُک جانے اور ٹوٹ جانے کے قدم قدم پر قوی امکانات ہوتے ہیں مگر تعجب ہے کہ پکی عمر کے ہاتھ نے اس کچے قلم کو اس طرح تھاما اور اسے اس احتیاط اور ہنرمندی سے چلایا جیسے کوئی سدھا ہوا شہہ سوار رخشِ خامہ کو ایڑ لگا رہا ہو۔

اس کے اس سفر کی کامیابی اس اعتبار سے بھی تعجب خیز ہے کہ اس صاحبِ قلم کا تعلق ایک ایسے شہر سے ہے جہاں نہ کوئی لسانی عیش باغ ہے اور نہ کوئی ادبی نشاط باغ اور نہ ہی کوئی فن دلشاد گارڈن۔ وہاں تو وہ ادبی اکادمیاں بھی نہیں جن کی آب پاشیاں تخلیقی زمینوں کو زرخیز اور ان کی فصلوں کو ثمر دار اور فرحت انگیز بناتی ہیں۔ وہ شہر تو ریگستان میں بسا ایک ایسا خطہ ہے جہاں کا چپّہ چپّہ ریگ وسنان سے اٹا پڑا ہے۔ اس سنگلاخ اور بے آب وگیاہ زمین پر بسنے والے کے تخلیقی وفور کر دیکھ کر محسوس ہوتا ہے جیسے اس کے وجود میں برسوں سے دبی کوئی آتش فشاں اچانک پھوٹ پڑی ہو اور اس کے اندر کا لاوا ادب پاروں میں متشکل ہو گیا ہو۔

دراصل اس کی کامیابی کا راز وہ دھن ہے جو علی گڑھ کے تربیتی سفر کے دوران اچانک اس پر سوار ہو گئی تھی۔ ٹھان لینے کی کیفیت پیدا کر دینے والی یہ دھن اسے روئی کی طرح دھنتی چلی گئی۔ گانٹھوں کو کھولتی، رکاوٹوں کو روندتی، تہوں کو اُبھارتی اور گرد وغبار کو اڑاتی اسے نرم، ملائم، سبک اور صاف وشفاف گالا بناتی چلی گئی۔

یہ دھن اس پر ایسی سوار ہوئی کہ اُس نے اپنے سفر میں نہ اپنوں کی جدائی کی پرواہ کی، نہ راستے کی خندق دکھائی اور نہ ہی کسی کی انگشت نمائی کی۔ مسلسل آگے بڑھتی ہوئی یہ دھن ایک ایسے جنون میں تبدیل ہو گئی جو قدم قدم پر نعرۂ مستانہ بلند کرتی گئی اور اس نعرۂ مستانہ کی گونج فضاؤں کو چیرتی ہوئی دور بہت دور تک پہنچ گئی۔ یہ وہی دھن ہے جو شہر یار کے لفظوں میں امراؤ جان ادا کی محفل میں اس طرح بجی تھی۔

کہیے تو آسمان سے تارے اُتار لاؤں　　　مشکل نہیں ہے کچھ بھی اگر ٹھان لیجئے

گویا شہر یار کہ اس شعر کا سچ اس کے یہاں ایک پیکر اختیار کر گیا۔ بلاشبہ پکی عمر میں شروع کیے گئے کام کا پختہ رنگ وروپ میں نظر آنا اور وہ بھی تخلیقی سفر کے اتنے مختصر وقفے میں آسمان سے تارے لانے سے کم نہیں ہے۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ اس دھن کو ادبی فضا کا حصہ بنانے میں راہ کے بہت سارے شجرِ سایہ دار کا بھی ہاتھ رہا ہے۔ یعنی اس سفر میں اسے بہیترے ادیبوں کا ساتھ بھی ملا جنھوں نے اسے ادوے پور کی اوبڑ کھابڑ راہوں سے نکال کر ہندوستان کے میدانی حصوں میں جانے کا راستہ ہموار کیا اور سر کے اوپر سرپرستی کا سائبان بھی رکھا۔

اگر یہ سچ ہے کہ اس کی اس جنوں آمیز دھن نے اسے اس سفر پر گامزن کیا اور اسے شجرِ سایہ دار کی طرح بہت سارے ادب کے تن آور درختوں کا ساتھ ملا تو یہ بھی حقیقت ہے کہ جس چیز نے اس سفر میں سب سے زیادہ اہم رول ادا کیا اور اسے راہ میں کہیں رکنے نہیں دیا وہ ہے اس کی شخصیت کا وہ جوہرِ جرأت مندانہ اور وصفِ بے باکانہ جو اسے مردوں کے مجمع میں مردانہ وار لے گیا اور اُسے وہ یارا عطا کیا کہ۔

چپ رہ نہ سکا حضرت یزداں میں بھی اقبال

حالانکہ اس بندۂ گستاخ کا منہ بند کرنے کے لئے عورت اور مرد دونوں ٹولوں کی طرف سے کبھی زہر تو کبھی شہد میں ڈوبے طنز و تشنیع کے تیر بھی چلے جس کا ذکر اس نے اپنی کتاب (شورش فکر) میں "ثروت کی کہانی میری زبانی" کے عنوان سے بھی کیا ہے لیکن ان تیروں سے اس کی پرواز کہاں رکنے والی تھی۔ اس کے ذہن کو تو اقبال کا یہ شعر کہ:

میں کہاں رکتا ہوں عرش و فرش کی آواز سے　　　مجھ کو جانا ہے بہت اونچا حدِ پرواز سے

مہمیز کر رہا تھا۔

اس کی شخصیت کے اس جوہر نے اس سے وہ وہ پڑھوایا جو عام طور پر عورتیں نہیں پڑھتیں اور وہ کچھ لکھوایا جسے لکھتے وقت مردوں کے ہاتھ بھی کپکپا اٹھتے ہیں۔ اس کا یہ وصف اسے وہاں وہاں لے گیا جہاں جاتے ہوئے قدم قدم پر پاؤں میں کانٹے چبھتے ہیں اور پاؤں تو پاؤں دل و دماغ میں بھی چھالے پڑ جاتے ہیں۔ اسکے ذہن کے اس پہلو نے اُسے ان منظروں کی جانب مبذول کیا جدھر جاتے ہوئے دل دہلتا ہے، دماغ ہلتا ہے اور آنکھیں جلتی ہیں۔ اگر اس کی شخصیت میں یہ وصف نہیں ہوتا تو وہ اپنے شریکِ سفر کو تنہا چھوڑ کر اس قدر اعتماد سے آج دہلی تو کل لکھنؤ اور پرسوں ممبئی کے سفر پر نہیں نکلتی اور اپنی ایسی خودنوشت ہرگز نہیں لکھتی جس میں وہ باتیں بھی قلم بند ہیں جو عام طور پر نوکِ کلک نہیں بن پاتیں یا جن سے بعض ذہنوں میں کردار کے مشکوک ہو جانے کا اندیشہ جنم لیتا ہے یا جو بسا وقت بنے بنائے رشتوں کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیتی ہیں۔ اس کے اسی جوہر نے اس کے ذہن کو ان مسئلوں، مصنفوں اور ادبی کرداروں کو بہترین مضامین کے سانچوں میں ڈھال کر اُس کی فہم کو طبقۂ نسواں اور معاصر اردو ناول، نئی عورت نئے مسائل نسائی ادب کی سمت و رفتار اور چیلنجز، ترقی پسند افسانے میں نسوانی کردار، کرشن چندر کے افسانوں میں نسائی کرداروں کی معنویت، رشید جہاں کی فکر، رشید جہاں اور تانیثی افسانہ، اردو ادب کے تانیثی ادب میں طنز و مزاح، میرا کا تصورِ عشق اور اس کی معنویت، ایک چادر میلی سی میں لپٹی رانو وغیرہ کی طرف مبذول کیا جن کا تعلق خالصتاً نسائیت یا تانیثیت سے ہے۔ مگر اس کے اس تانیثی اپروچ کی وجہ بقول اس کے "میرا عورت ہونا نہیں ہے بلکہ بحیثیت ایک مصنف کے کائنات میں اس صنف کے حوالے سے متضاد معاشرے کے متضاد رویے ہیں۔" گویا اس کے اس جوہرِ تابدار پر اُس کرب نے آب چڑھایا جو مرد کے شکنجے میں کسی ہوئی عورت کی پیڑا اور آہ و کراہ سے اس کے دل میں پیدا ہوا تھا۔

اس سفر میں وہ جس انداز سے ان موضوعات و مسائل کی طرف گامزن ہوئی اور جس ہمت و حوصلے کے

ساتھ بعض معاشرتی، تہذیبی اور اخلاقی حد بندیوں کو توڑتی ہوئی عورت کے اندرون تک پہنچی اور جس طرح خار دار راستوں میں زخمی اور لہولہان ہوئی اسے دیکھ کر اس پر کوئی یہ الزام نہیں دھر سکتا کہ فیمنزم کے اس سفر کا انتخاب اس نے فیشن پرستی یا فیشن زدگی کے زیرِ اثر کیا، جیسا کہ اس سفر کے مسافروں پر عموماً دھرا جاتا ہے۔

اس کی اس صف شکن والی رفتار اور بے باکانہ اندازِ سفر کا سہرا بہت حد تک اس کے شریکِ سفر کے سر بھی بندھتا ہے کہ جس نے ان ہوش ربا اور صبر شکن باتوں کی ذرا بھی پرواہ نہیں کی جو دورانِ سفر اڑائی گئیں یا اس کی سماعت تک مختلف وسیلوں سے پہنچائی گئیں اور جس مردِ آہن یعنی اس کے شوہر نے اس کے حوصلے کو بلند کرنے، اسے سفر کی تمازت سے بچانے اور اس کے فن کو جلا بخشنے میں گھر بیٹھے بیٹھے ایسی سائبانیاں عطا کیں کہ شاید ویسی ساتھ میں رہ کر بھی نہ کی جا سکیں۔

ان حیرتوں کے علاوہ ایک حیرت یہ بھی ہوئی کہ اس نے ایک ایسے علاقے کے مسائل کو موضوع بنایا جو اب تک اردو تخلیق کاروں کی نگاہ سے اوجھل رہا اور جس کے رنگ و آہنگ کو فضائے اردو میں موسمِ بہار کا ایک تازہ جھونکے کی طرح محسوس کیا گیا۔ حیرت تو اس پر بھی ہوئی کہ اس نے اپنے قلم کو یہ پرواہ کیے بنا تلوار کی طرح چلایا کہ اُس کی زد میں کون کون آئے گا، اس کے زور سے کون کون تھرّائے گا اور ضرب سے کیسے کیسے لوگ کٹیں گے۔

حیرت کا سبب یہ بھی ہے کہ اس کی تحریریں یہ بھی احساس دلاتی ہیں کہ برگد تو اور گھنا ہو گیا ہے مگر اس کے نیچے بیٹھنے والوں کو اب بھی تمازت کی سوئیاں چبھتی ہیں۔ حق اور مساوات کی بات کرنے والا بھی درمیان میں لکیریں کھینچتا ہے۔

روشن خیالی کا ڈنکا پیٹنے والا بھی اکثر مولویانہ نظر سے دیکھتا ہے۔ بھائی بہن کو بہن تو سمجھتا ہے مگر اسے انسان نہیں سمجھتا۔ معاشرے کا حساس ترین انسان بھی بے حسی کا ثبوت دیتا ہے۔ اکیسویں صدی کے انسان کے اندر بھی پتھر ور یگ کا وحشی چوکڑیاں بھرتا ہے۔ مرد وہ نہیں جو کسی کا مذاق اُڑاتا ہے بلکہ مرد وہ ہے جو اس مذاق کو ہوا میں اُڑا دیتا ہے۔ یہ بات مردوں پر آئے نہ آئے اُس پر سو فی صد صادق آتی ہے۔

حیرتیں تو اور بھی ہیں کہ اس کی شخصیت میں اور بھی کئی ایسے حیرت انگیز پہلو ہیں جو ہمیں متحیر کرتے ہیں مگر ان حیرتوں کا اظہار ہم اگلے وقتوں کے لئے اٹھا رکھتے ہیں کہ اس کے متعلق اس کی میری اور آپ کی تینوں کی حیرتیں بنی رہیں کہ یہی حیرتیں ثروت کی ادبی ثروت ہیں۔

کڑوے کریلے' ایک مطالعہ

پروفیسر انور پاشا

اردو ناول کا ارتقائی تسلسل حیرت انگیز اور مسرت خیز ہے اور اس نے فکر و احساس اور تخلیقی اور فنی وفور کی ایسی پرکشش دنیا بسائی ہے کہ دہائیوں پر دہائیاں گذرتی چلی جاتی ہیں اور اس کا سفر جاری و ساری ہی رہتا چلا آرہا ہے۔۔

جب ہم اکیسویں صدی کے تناظر میں اردو ناول کا جائزہ لیتے ہیں تو خوشی ہوتی ہے کہ اس عہد کے ناول نگار عصر موجود کی الم ناکیوں الجھنوں اور سماجی حقائق و احساسات کو بیحد قریب سے دیکھنے اور محسوس کرنے میں نہ صرف یہ کہ کامیابی حاصل کر رہے ہیں بلکہ اس شدت احساس کو اپنے قارئین تک پہنچانے میں ہمعصر زندگی کی بھرپور نمائندگی بھی کر رہے ہیں۔۔۔

اکیسویں صدی کے اوائل سے اب تک جو نمائندہ ناول نگار سامنے آئے ہیں ان میں ایک اہم اور ناگزیر نام ثروت خان کا بھی ہے جنھوں نے عصری اور زمینی حقائق سے آنکھیں ملاتے ہوئے ان تمام روشن دانوں اور دریچوں کو کھولنے اور اپنے اردگرد ہو رہے ظلم و استحصال 'ناانصافی و نابرابری اور زوال اخلاق و اقدار کا پردہ چاک کیا ہے اور اپنی پرقوت تخلیقیت کے ذریعہ ایک نئے انسان دوست سماج کی تشکیل کا کارنامہ انجام دیا ہے۔۔ظاہر ہے کہ فکشن نگار یا فنکار یہ کارگراں اپنے تخلیقی اور فنی عمل کے ذریعہ ہی کرتا ہے۔۔لہذا ثروت خاں نے بھی خصوصاً اپنے خوبصورت اور نمائندہ ناول" کڑوے کریلے" میں یہ معرکہ سر کیا ہے۔۔

اردو فکشن اور خصوصی طور پر ناول آگ کا دریا' آنگن 'اداس نسلیں اور خدا کی بستی سے آج تک نئے تخلیقی امکانات کے کتنے ہی نئے مدارج طئے کر چکا ہے لیکن فکشن اور ناول پر ہونے والی ہر گفتگو کا آغاز اور محور یہی ناول بنتے ہیں۔۔۔میرے نزدیک یہ بات کچھ غلط نہیں بلکہ ایک ارتقائی تسلسل سے مشروط ہے۔

" کڑوے کریلے" دلت کلچر اور آدیباسی ماحول کی تلخیوں اور ان کے اندر سے ابھرنے والی جدو جہد

بلکہ جہد للبقا کا تخلیقی استعارہ جس کے لئے مزاج اور ماحول کے مطابق ایک کھردرے بیانیہ کا وجود میں آنا فطری ہے لیکن اس کا امتیازی نقط ؟ شناخت یہ ہے اس کھردرے پن کے اندر سے فطرت کی آغوش میں پلنے والی رومانویت اور انسانی روح کے اندر نمو پانے والی محبت دونا مغلوب قوتوں کی طرح شانہ بہ شانہ ہیں اور ناول کے واقعات اور کردار اسی شفاف فضا میں ارتقا پذیر ہوتے ہیں۔

فکشن اور خصوصی طور پر ناول میں واقعات اور کردار ایک دوسرے کا لباس بنتے ہیں اور اس طرح ایک دوسرے کی تکمیل بھی کرتے ہیں۔۔بقول ہنری جیمس

'جو کردار ہے وہ فقط
وہ فقط واقعات کا تعین
ہے اور جو واقعات ہیں وہ
فقط کردار کا تعین ہیں'

What is the character but the determination of the incidents and '
what is incident but the determination of character '
(Henry James... The Art of fiction)

ثروت خاں کا کمال فن یہی ہے کہ انہوں نے واقعے اور کردار کو ایک دوسرے میں پرو دیا ہے یا گوندھ دیا ہے۔۔اسی فنکارانہ عمل سے مولی دیوی مہاور 'نریندر شرما اور بھیلو راجہ جیسے کردار ایک مخصوص سماجی ماحول میں تخلیق کئے گئے ہیں۔۔ناول کے تمام کرداروں میں مولی دیوی ہی دراصل مرکزی کردار ہے اور سارے کردار و واقعات اسی سے نمو پذیر ہوتے ہیں اور ایک طرح کی تخلیقی گرمی حاصل کرتے ہیں۔

ثروت خان کی کہانی : لوک عدالت

پیغام آفاقی

جب آپ کسی تخلیق کار سے کسی اور تخلیق کار کے کسی فن پارے پر گفتگو کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں تو گویا آپ بہت چابک دستی سے ایک تیر سے دو شکار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ثروت خان کی کہانی اور پیغام آفاقی کا تبصرہ پسِ پردہ یہ ایک طرح سے دو فنکاروں کی ایمانداری کا امتحان یا پھر ان کے درمیان کے رشتہ کو خراب کرنے کا انتظام بھی ہوتا ہے۔ہم اتنے سادہ نہیں ہیں کہ آپ کے ارادوں اور آپ کی ٹٹولتی ہوئی نظروں کو سمجھتے نہ ہوں لیکن اس تمہید کا جواز یہ ہے کہ آپ اس نقطۂ نظر سے ذرا اوپر اٹھکر ہم کو سنیں اور اگر پکڑ سکیں تو ہماری چالاکی کو پکڑیں بھی کہ ہم بہرحال اپنے مطلب کی بات کہنے سے گریز نہیں کریں گے۔

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ فکشن ایک ارتقا پذیر صنف ادب کا نام ہے اور ہمیشہ کی طرح آج کے ہر زندہ ادیب سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ اپنے زمانے کو سمجھے اور سمجھائے کہ وہ اپنے زمانے کو دیکھے اور دکھائے۔ ایک بڑی بات جس کی توقع ادیب سے کی جاتی ہے وہ یہ کہ وہ کسی اہل اقتدار یا اہل مال و دولت کی طرح رعب قائم کرنے کی کوشش نہ کرے۔علم کا رعب، فلسفہ کا رعب، مطالعہ کا رعب، اس کی جگہ وہ اپنے قارئین کی زندگی سے محبت، دلچسپی اور درد کا رشتہ قائم کرے۔اور اس کے لئے ضرورت پڑنے پر کسی بھی طرح کی قربانی دے۔

جب اس توقع کی روشنی میں ثروت خان کے افسانے ''لوک عدالت'' کا میں نے مطالعہ کیا تو مجھے صاف محسوس ہوا کہ اپنی اور تخلیقات کی طرح اس کہانی میں بھی وہ ایک تخلیق کار کی اولین صفات یعنی سیاسی و تمدنی مصلحتوں سے بلند تر ہونے ، جان کو ہتھیلی پر رکھ کر حق بات کہنے، اپنے خون اور اپنی ماں کے دودھ کا حق ادا کرنے اور سچ کو بے خوف وخطر پیش کرنے کا حق اور فریضہ ادا کرتی ہیں۔

اردو کا آج کا نوجوان افسانہ نگار ادب لکھنے کے جھانسے نہیں دیتا۔ یہ کام اس نے اپنے ان سینئر لوگوں کے لئے چھوڑ دیا ہے جو بڑے ناولوں کی تلاش میں کبھی آسمان میں جاتے ہیں، کبھی غیر ممالک میں، کبھی ماضی میں

اور کبھی پرانے ادب میں، یہ کام اس نے ان ادیبوں کے لئے چھوڑ دیا ہے جو آج کی ان سچائیوں میں ناول نہیں تلاش کر سکے جن سچائیوں کے پنکھوں پر جہاں ہزاروں سال کی تاریخ بارود کے ڈھیر کی طرح ڈھتی چلی آ رہی ہے وہیں موجودہ زندگی کی ہزار ہا تبدیلیاں ہر جانب سے مسلسل زندگی کو کتر بونت رہی ہیں۔ آج کا ناول، آج کا افسانہ دو خانوں میں تقسیم ہوتا ہوا دکھ رہا ہے۔ ایک زندہ افسانہ اور دوسرا بڑا افسانہ۔ اگر بڑا اور مردہ ناول یا افسانہ لکھنا ہے تو ان موضوعات کو اٹھاؤ جن کو تخریب کا خطرہ نہیں ہے۔ اگر زندہ ناول یا افسانہ لکھنا ہے تو سمندر کے پانی میں ہاتھ ڈال کر اس کی تیز لہروں کے بیچ ریت کو مٹھی میں پکڑنے کی کوشش کرو۔ بڑی چوٹیاں پہاڑوں پر تعمیر ہو سکتی ہیں۔ جہاں کی زندگی برف جیسی سرد ہے۔ لیکن ہم تو طوفانی سمندر میں جی رہے ہیں۔ ہم نے سمندر کی لہروں کے بیچ جنم لیا ہے۔ ہم جنگ کے میدان میں پیدا ہوئے ہیں۔ اور شاید اسی میدان میں کام آئیں گے۔ ہم تاج محل نہیں بناتے ہیں ہم تاریخ کی تعمیر کرتے ہیں، ایسے ہلچل کے عالم میں اردو کے چند ادیب اپنے کنبے کے ساتھ وہ سب کچھ جسے وہ جی رہے ہیں، وہ لکھ رہے ہیں، دراصل بڑے ادب کی پہچان یہی ہے کہ وہ انسان کے ایمان کی آبیاری کرے۔ اور بلاشبہ 'لوک عدالت' انہیں ادب پاروں میں ایک ہے۔

کہانی 'لوک عدالت' میں ایک راجپوت خاندان کے افراد کو فسادی پٹھان سمجھ کر مار دیتے ہیں۔ اور مرنے کے بعد جب ان کی اصل پہچان سے واقف ہوتے ہیں تو ان کی لاشیں خود ان کے گھر پہنچا آتے ہیں۔ راجپوت عورتیں روایت کا لحاظ رکھتے ہوئے خود رونے سے گریز کرتی ہیں اور رونے کے لئے گولیاں بلواتی ہیں یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو جہیز میں دلہن کے ساتھ دیے جاتے ہیں۔ لیکن گولیاں کہیں نہیں ملتیں اور ان کی جگہ فسادات میں اجڑے گھروں کی چند عورتیں، رابعہ، نور جہاں وغیرہ آ جاتی ہیں، روتی ہیں، پیسے لیتی ہیں لیکن راستے میں بلوائی انہیں گھیر کر ان کی آبروریزی کرتے ہوئے ان کو مار دیتے ہیں اور ان کی عورتیں جو مندر سے لوٹ رہی ہیں۔ تماشہ دیکھتی ہیں اور نعرے لگاتی ہیں۔ بالآخر ان مری ہوئی عورتوں پر آنسو بہانے والا وہاں کوئی نہیں ہوتا، افسانہ نگار کے سوا۔

کہانی سے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:

''سوجی ہوئی آنکھوں، بکھرے بالوں اور بے ترتیب آنچلوں کو سنبھالتی ہوئی رابعہ، نور جہاں، میمونہ، شاکرہ اور ذکیہ کوٹھی سے باہر آ کر شِور کی طرف نڈھال قدموں سے روانہ ہوئیں۔ ابھی دوسرے موڑ پر ہی پہنچی تھیں کہ ٹولے والے، بھگوا وستر، ترشول، بھالے اور کرارے نوٹ اور نکڑ ناٹک کو دیکھنے والی سامعین، ابھی ابھی نکڑ کے دوسرے چھوڑ پر دیوی کے مندر سے پوجا کر کے لوٹیں آٹھ دس خواتین، ہاتھ میں پوجا کی تھالی لیے اور اس میں دیوی

ماں کا پرساد لیے بڑی پراسرار نگاہوں سے نکڑ ناٹک دیکھنے میں محو تھیں۔''

یہ ہے وہ سچائی جو گجرات کے قریب راجستھان میں لکھی جاتی ہے۔اور نندی گرام کی گہرائیوں میں اتر کر سارے جھانسے دینے والے ناولوں کو بے نقاب کرتی ہے۔اور بے نقاب کرتی ہے ان تمام بڑے ناول نگاروں کو جو ریاکاری سے کام لیتے ہوئے نام نہاد تہذیبی عظمتوں کا ڈھونگ رچاتے ہیں۔اور جن کی نظریں صرف انعامات پر ٹکی رہتی ہیں۔

یا تو یہ ان کی کوتاہ بینی تھی یا ان کی دور اندیشی کہ وہ ان حقیقتوں کو لکھنا نہیں چاہ رہے تھے جن کی عکاسی ہماری نسل کر رہی ہے۔'' اقتباس سنئے۔

''اسی طرح ہماری نسل صدیوں سے ان کی خدمت گزاری کرتی چلی آ رہی ہے۔مگر اب ہماری ذات والوں نے یہ کام چھوڑ دیا ہے۔اب راجستھان میں بھی گولی گولا تقریباً ختم ہو گئے ہیں''۔کیوں ہمارے سینئر ادیبوں کے یہاں اس سچائی کا ذکر نہیں ملتا۔کیونکہ اس سے شہرت نہیں ملتی بلکہ یہ حقیقت کفن مانگتی ہے۔اور ادب میں جانباز قلم ذرا کم ہی نظر آتے ہیں۔

ایک بات بالکل صاف ہے کہانی 'لوک عدالت' ثروت خان اور ادبی انعامات کے درمیان روڑا پیدا کرتا ہے۔یہ کہانی افسانہ نگار کو انعامات کا نہیں، سزا کا مستحق بناتی ہے۔ادب میں مختلف قسم کی تنقیدیں رائج ہیں لیکن شاید ایسی تنقید ابھی فروغ نہیں ہوئی جس میں ادب پارے کو اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے کہ ادب پارہ کے اندر جرأت تخیل، جرأت فکر، جرأت بیان اور آوارہ پن کس حد تک موجود ہے اور ادب کی سیاست میں وہ انعام پانے کی مستحق ہے یا سزا پانے کی۔جب کہ ادب کے قدر و قیمت کے تعین میں یہی پہلو سب سے نازک ہے۔

کچھ لوگ ادب کے بوڑھے، ناکارہ، مصلحت پسند اور مفاد پرست نقادوں کی زبان میں مجھ سے پوچھ سکتے ہیں کہ میں نے جو باتیں رکھی ہیں ان کا افسانے کے فن سے کیا تعلق ہے؟ تو میں صرف یہ کہوں گا کہ اگر 'لوک عدالت' سے یہ پہلو نکال لیجیے تو اس افسانے میں کچھ بھی نہیں بچتا۔ایک انگوٹھا بھی نہیں۔نہ اس میں زبان کا کمال ہے۔نہ منظر کشی، نہ کردار نگاری، نہ کہانی، اور اس کے باوجود اگر اس کہانی میں سکتے میں ڈال دینے والے ایسے کرداروں کا ایک گروہ دکھائی دیتا ہے جو نہ صرف یہ کہ موت کے منظر پر رونے سے پرہیز کرتے ہیں بلکہ موت کے مناظر پر جشن مناتے ہیں، اگر اس کہانی میں ہندوستانی تہذیب کی آنتیں باہر نکل آئی ہیں۔اور اگر اس کہانی میں ایک ایسا کہانی کار دکھائی دیتا ہے جو کسی بھی زاویے سے دوغلا نہیں دکھائی دیتا تو اس کی وجہ صرف وہی ہے جس کا ذکر

میں نے اوپر کیا ہے۔

اردو ادب کی تاریخ اٹھا کر دیکھئے ۱۹۸۰ء سے پہلے تک اردو کے افسانے اور ناول محفل ادب میں شاعری کے پیچھے دوسری اور تیسری صف میں بیٹھے ہوئے دکھتے ہیں، آٹھویں دوہے میں اردو فکشن نے وہ انقلاب برپا کیا کہ آج فکشن سب سے آگے پہنچ گیا۔ اسکی وجہ صرف یہ ہے کہ آج فکشن نے آج کی ہندوستانی پذیرائی کو سمجھنے اور لکھنے کے چیلنج کو قبول کیا۔ پروفیسر وہاب اشرفی نے پہلی بار اردو کے ناولوں کو اس لائق پایا کہ انہیں مشہور عالم ناولوں کے مدِ مقابل رکھ کر گفتگو کی یہ بات صرف اسلئے پیدا ہوئی کہ یہ ناول فنی اور موضوعاتی اعتبار سے منفرد اور بامعنیٰ لکھے گئے اور وہ منفرد اور بامعنیٰ اس لئے ہوئے کہ ان کا بنیادی رویہ وہی تھا کہ آج کی صورت حال کا جائزہ لیا جائے، اور فکشن کو ادیب اپنی مقبولیت اور شہرت کا ذریعہ نہ بنا کر زندگی کا ہتھیار بنائے۔ ثروت خان کی کہانی 'لوک عدالت' اسی زمرے کی کہانی ہے۔ یہ کہانی ۱۹۴۷ء کے فسادات کے اوپر لکھی گئی کہانیوں کی طرح مرثیہ نہیں ہے، یہ کہانی ایسا دستاویز ہے جو ادب کی عدالت میں ایک مقدمہ قائم کرتا ہے۔

میں آخر میں یہ کہنا چاہوں گا کہ یہ کہانی تقاضا کرتی ہے کہ اردو ادب اور دوسرے ہندوستانی ادب میں رابعہ، نور جہاں، میمونہ، شاکرہ اور ذکیہ کی کردارکش اور کردارکشی دونوں کا جائزہ لیا جائے کیونکہ ہر عہد کا ادب کرداروں کا از سرِ نو انکشاف کرتا ہے اور یقیناً ہندوستان کی مٹی سے پیدا ہونے والی رابعہ، نور جہاں، میمونہ، شاکرہ اور ذکیہ اپنے اوپر رونے والوں کی منتظر ہیں لیکن اب بازار میں کرائے پر ملنے والے گولے گولیاں بھی اتنے خوفزدہ ہیں کہ وہ آنسو بہانے کے بجائے جشن منانے میں زیادہ عافیت محسوس کرتے ہیں۔

'لوک عدالت' آج کی اسی صورت حال کی علامت ہے اور اس اعتبار سے اپنے اندر ایک پیغمبرانہ شان رکھتی ہے کہ فنی سطح پر یہ انسانی غیرت کو للکارتی ہے۔

اس مقالے کے افتتاح پر میں نوٹ کے طور پر یہ ضرور لکھنا چاہوں گا کہ اردو ادب کے وہ طالب علم جو یونیورسٹیوں میں پڑھ رہے ہیں یا ریسرچ کر رہے ہیں وہ میرے نظریات سے دور ہی رہیں تو یہ ان کی صحت کے لئے اچھا ہے کیونکہ اگر ان کی سوچ میں یہ باتیں گرہ پا گئیں تو قدامت پرست اور مفاد پرست نقادوں کے ہاتھوں ان کے نمبر کٹ سکتے ہیں۔

اندھیرا یگ: عورت بطور ہیرو

پروفیسر مولا بخش

اپنے انجام سے بے پروہ، بارود کے ڈھیر پر بیٹھی لطیفے سنانے والی ہماری اس دنیا کو اب صرف اور صرف عورت ہی بچا سکتی ہے۔ آج فرائڈ کا یہ خیال کہ مرد مکمل ہستی ہے اور عورت آختہ ،یا یونگ کا یہ خیال کہ ”عورت کی آزادی ایک واہمہ ہے“ ایک لچر خیال ثابت ہو چکا ہے۔ مغرب میں تانیثی تحریک کے نتیجے میں ایک واضح تبدیلی آچکی ہے کیونکہ وہاں ایک اندازے کے مطابق جو لوگ معاشی سطح پر فعال ہیں ان میں پچاس فیصد عورتیں ہیں۔ اس کے برعکس ہندوستان میں عورتوں کی سماجی حالت پہلے سے بہت بہتر ہونے کے باوجود ملک کے مختلف مقامات پر اب بھی تنتر منتر، بالیکا ودھو، بیواؤں پر ظلم، عورتوں کو دوسرے درجے کا شہری سمجھنے، انہیں مارنے پیٹنے اور جس عمر میں بھی ممکن ہو گھر سے نکال دینے نیز پڑھائی لکھائی سے دور رکھنے اور ان کی عصمت تار تار کرنے جیسے اور بھی مظالم کے دلدوز واقعات اخباروں میں پڑھنے اور ٹی وی اسکرین پر دیکھنے کے بعد ہمیں ان واقعات پر گھڑی بھر افسوس کرنے کی مہلت بڑی مشکل سے ملتی ہے۔ گویا ہندوستان میں عورتیں کہیں بہت فعال اور ماڈرن ہیں تو کہیں وہ مرد اساس معاشرے کے قوانین پر سر جھکا کر عمل پیرا نظر آتی ہیں تاہم حالات نہ پریم چند والے ہیں نہ عصمت والے کیونکہ ہندوستان میں خواتین اسکالروں اور خواتین سماجی کارکنوں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اب عورتیں ہی اس کائنات کو ایٹمی خطروں سے بچا سکتی ہیں۔

اب سے پہلے ٹھیک ہے کہ عورتوں نے جو کچھ بھی لکھا وہ ادب ہو یا دوسرے علوم سے متعلق کوئی تحریر، دراصل وہ ادب یا وہ علم نہیں تھا جو وہ لکھنا چاہتی تھیں بلکہ وہ ادب یا علم تھا جو مرد قارئین کے جبر یا مرد اساس معاشرے کے مشروط حالات اور مرد اساس ادبی شعریات نے انہیں لکھنے پر مجبور کیا تھا لیکن اب حالات بدل چکے ہیں۔ بہت کم ہونگی ایسی ادیبائیں یا عالمائیں جو لکھتے وقت مرد اساس معاشرے کی ذہنیت کا پردہ فاش نہ کرتی ہوں۔

آج کی تانیثی ادیباؤں نے اپنے ادب کو حد درجہ بین العلومی بنانے کی طرف پیش رفت کرنی شروع

کردی ہے اور پہلے سے موجود بعض ادبی و سیاسی نیز لسانی فلسفوں مثلاً مارکسیت، ساختیات، پس ساختیات اور لسانیات کو نئے نقطۂ نظر سے پڑھنا شروع کردیا ہے اور طبقۂ اناث کی فطرت کی دریافت پر اپنی توجہ مرکوز کرنی شروع کردی ہے۔ تاریخ کی از سرِ نو تشکیل کے ساتھ ساتھ ادب اور بالخصوص ناول کی تاریخ بھی از سرِ نو مرتب کرنے کی مہم چھیڑ رکھی ہے۔ ان جملہ سرگرمیوں کا مقصد دراصل تانیثی ادب کو مرکز میں لانے کی خواہش ہے۔

اچھا ہے کہ عورتوں نے بہت جلد یہ سمجھ لیا کہ فکشن میں بالخصوص ناول ایک ایسی نثری صنف ہے جس میں وہ اپنے وجودی، سماجی اور ثقافتی کرب کو اچھی طرح سے بیان کرسکتی ہیں اس کی وجہ ناول کے اندر موجود لچیلا پن اور اس کی میل دار ساخت (Hybid Structure) ہے۔ ورجیناوُولف نے اپنی کتاب 'A Room of ones own' میں صحیح لکھا ہے کہ جب ایک عورت ناول کی طرف اپنے ذہن کو موڑتی ہے تو وہ اس راز کو سمجھ جاتی ہے کہ اس صنف کو مردوں نے اپنی نفسیات اور ضرورت کی صنف بنالیا ہے اسی لیے مردوں کے لکھے ناولوں میں ایسا ایک بھی جملہ نہیں جس کا استعمال ایک عورت اپنے ناول میں کرے، ان کا ماننا ہے کہ مردوں کے ناولوں کی نثر فطری اور ملائم ہونے کے باوجود عورت کے لیے بے سلیقگی کا نمونہ ہے لیکن عورت مجبور ہے کہ اسے استعمال کرے تاہم Jane Austene نے اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ فطری طور پر عورتوں کے جملے مردوں کے جملوں کے مقابلے اپنی ساخت کے اعتبار سے الگ ہو جاتے ہیں یعنی عورتوں کے جملوں میں Clauses ڈھیلے ڈھالے ہوتے ہیں۔

آپ اردو میں لکھے گئے ابتدا تا حال کے خواتین ناول نگاروں کے ناولوں کا مطالعہ کیجیے تو اس امر کا احساس ضرور ہو جائے گا۔ مثلاً اردو کی پہلی تمثیل نگار خاتون رشیدۃ النساء کی اصلاح النساء (۱۸۸۱ء) (۱۸۹۶ء)۔ بیگم صغرا ہمایوں مرزا کا، سرگزشت حاضرہ (۱۹۲۶ء)، موہنی (۱۹۲۹ء) نذر سجاد حیدر کا اختر النساء ''آہ مظلومہ'' (۱۹۱۰ء) جانباز (۱۹۳۵ء) حرماں نصیب (۱۹۳۸ء)، خجستہ اختر بانو کا آئینۂ عبرت، والدہ افضل علی کا گودڑ کا لال، محمدی بیگم کا صفیہ بیگم، رضیہ سجاد ظہیر کے ناول سر شام کانٹے، سمن، اللہ میگھ دے، (۱۹۷۳ء)، صالحہ عابد حسین کے ناول اپنی اپنی صلیب، گوری سووے سیج پر (۱۹۶۳ء) آتش خاموش (۱۹۶۴ء)، معصومہ، ایک قطرۂ خون (۱۹۷۶ء) عصمت چغتائی کے ناول ٹیڑھی لکیر اور دل کی دنیا، آمنہ ابوالحسن کا ناول پلس مائنس، قرۃ العین حیدر کے ناول 'میرے بھی صنم خانے (۱۹۴۷ء) سفینۂ غم دل (۱۹۵۴ء) آگ کا دریا (۱۹۵۹ء) آخر شب کے ہم سفر (۱۹۷۱ء) کار جہاں دراز ہے (۲۰۰۲ء) گردش رنگ چمن (۱۹۸۸ء)، چاندنی بیگم (۱۹۸۹ء) اور ناولٹ 'چائے کے باغ، اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجو، دلربا، سیتا ہرن، ہاؤسنگ سوسائٹی، فصل گل آئی یا اجل آئی، جمیلہ ہاشمی کا تلاش بہاراں (۱۹۶۱ء)

چہرہ بہ چہرہ روبرو تاریخی ناول (۱۹۷۷ء)، دشت سوس بھی تاریخی ناول ہی ہے۔ بانو قدسیہ کا راجہ گدھ (۱۹۸۱ء)، الطاف فاطمہ، نشان محفل (۱۹۷۵ء)، خدیجہ مستور کا آنگن (۱۹۶۲ء) زمین (۱۹۸۰ء) جیلانی بانو کا ایوان غزل (۱۹۷۶ء) اور بارش سنگ (۱۹۸۵ء)، رضیہ فصیح احمد کا ناول آبلہ پا (۱۹۶۴ء)، انتظار موسم گل، آزار عشق، کے علاوہ معاصر خواتین ناول نگاروں نے ترنم ریاض، صادقہ نواب سحر، ثروت خان آشا پر بھات، شائستہ فاخری، ناصرہ شرما، برجس بیگم، ڈاکٹر نسرین بانو، انجم بہار ہاشمی اور برطانیہ میں مقیم صفیہ صدیقی کے یہاں بڑی حد تک مرد اساس نثری مستون کے اسلوب و انداز سے الگ تانیث اساس اسلوب کے خلق ہونے کی صورتیں واضح طور پر نظر آتی ہیں۔ ثروت خان نے اپنے ناول 'اندھیرا پگ' میں 'گفتگو آپ سے' کے عنوان کے تحت ایک دیباچہ لکھا ہے یہ بجائے خود ناول کی کتاب میں روایت سے بغاوت کا نمونہ ہے۔ ذرا ناول کی نثر سے الگ نان فکشن یا تبصرہ اور علمی نثر انہوں نے کس طرح کی لکھی ہے اس پر ایک نگاہ ڈالیں:

''اس ناول کو تحریری شکل دینے سے قبل، میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا...... جب میں جیسلمیر گئی...... وہاں کے کلچر، تہذیبی اقدار اور ثقافتی نظام سے متاثر ہوئی...... جب میں بیکانیر گئی، جب میں جودھپور گئی، ......اتنا کچھ، اتنے قریب سے دیکھا کہ گویا ایک ایک کردار، ایک ایک واقعہ، ایک ایک مکالمہ سے میری پہچان ہو رہی ہو۔ ملاقات ہو رہی ہو۔ ان کے رہن سہن، طور طریقے، رسم و رواج، سماج و تہذیبی امور اور ان کے اصول و ضوابط کی پاسداری میں کوشاں افراد......کو اپنے ارد گرد دیکھ کر حیران رہ گئی......لگا......تبدیلی ہے کہاں؟......یہ کس چڑیا کا نام ہے۔ ہم مغالطہ میں ہیں کہ ہندوستان اکیسویں صدی میں دنیا کے نقشے پر ایک رہنما بن کر ابھرنے والا ہے۔ ہاں مٹھی بھر روشنی پر ہم اترا سکتے ہیں۔ لیکن سواری تو ہمیں بیل گاڑی ہی کی پسند ہے۔ کھڑ کھڑ کرتی، پیاں پیاں چلتی...... رینگنے رنگاتے دھچکے کھاتے اس سفر کی لگام اب بھی فاشٹ طاقتوں کے ہاتھ میں ہے۔'' (ثروت خاں، اندھیرا پگ معیار پبلی کیشنز، دہلی ۲۰۰۵ء، گفتگو آپ سے، ص:۵)

سب سے پہلے اس دیباچے کے عنوان 'گفتگو آپ سے' کو مصنفہ نے کیسے لکھا ہے اس پر غور کریں لکھا ہے گفتگو اور اس کے آگے نوٹ آف ایکس کلیمیشن لگایا ہے 'آپ' دراصل مرد کی علامت بن گیا ہے۔ مذکورہ بالا عبارت میں گیپ کا التزام جملے کے سیٹ کو توڑتا ہے۔ مصنفہ جہاں جہاں گئیں ان سب میں ایک جگہ 'جب' لگانے کے بجائے سب جگہ 'جب' لگانے اور پھر اس طرح کا جملہ ''میں حیران رہ گئی......لگا......تبدیلی ہے کہاں'' کھڑ کھڑ کرتی، پیاں پیاں چلتی'' جیسی غیر فطری نحوی روش جیسے لکھا نہیں بولا ہوا جملہ ہو یعنی بات چیت کا جملہ یہ ثابت کرتا

ہے کہ عورت فطری بہاؤ کے جملے زیادہ لکھتی ہے یہ تو دیباچے کی مثال تھی۔ اب ذرا ناول سے ایک عبارت ملاحظہ فرمائیں ان کے ناول کی ہیروئن روپی کی پھوپھی راج کنور کے ذہن میں خیالات کا ایک انبار ہے ان کی سوچ کے اظہار کے لیے ثروت خان نے کچھ اسی طرح کے ڈھیلے ڈھالے جملے لکھے ہیں:

انہیں سرحدوں کو توڑتی، اس کائنات کی رگ رگ میں سماتی یہ نرم رو پیار اور اس کے خوشگوار جھونکے ...... جب سمندر کے ہمراہ آسمانوں تک کا سفر طے کرتے ہیں تو صرف اس لیے کہ انہیں زمین کے ریزے ریزے میں سما جانا ہوتا ہے ...... پانی کی ایک ایک بوند ...... جو اجنبی شناسا اور تپتی بنجر دھرتی کو صرف اس لیے شاداب کرتی ہے کہ اسے نمو دے کر مخلوطی تہذیب کی تشکیل کر سکے ...... یہ کائنات اور اس کا نظام ...... یہ پانی ...... یہ ہوا ...... یہ سورج ...... یہ آسمان ...... سب بے حد منظم ...... لیکن اس کا محور ...... اس کا مرکز ...... یہ انسان ...... نہ جانے کیوں برہم برہم سا ...... ہمیشہ درہمی برہمی پر ہی کیوں آمادہ رہتا ہے ......!! نہ جانے کیوں ...... کیوں ...... کیوں ......ں ......ں''۔ (اندھیرا پگ، ص:۱۱۔۱۰)

آپ ان جملوں کے علاوہ ناول سے اور بھی جگہوں سے خالص بیانیہ کے نمونے تلاش کر سکتے ہیں جس میں نحو کی مروجہ ساخت میں توڑ پھوڑ نظر آئے گی۔ انہوں نے روزمرہ کے خلاف درہم برہم کو درہمی برہمی لکھا ہے۔ جملہ اس طرح سے بھی لکھا جا سکتا تھا کہ ''نہ جانے کیوں برہم برہم سا ...... ہمیشہ درہم برہم کرنے پر کیوں آمادہ رہتا ہے لیکن اختصار کا حسن پیدا نہیں ہو پاتا۔'' ایسا نہیں کہ اس نوع کی نثر ثروت خان کے یہاں ہی ہے، سچ تو یہ ہے کہ معاصر خواتین ناول نگاروں مثلاً آشا پربھات، ترنم ریاض، نور زہت، ناصرہ شرما، صادقہ نواب سحر، برجیس بیگم، ڈاکٹر نسرین بانو، انجم بہار ہاشمی اور برطانیہ میں مقیم صفیہ صدیقی کے یہاں کم و بیش مرد اساس نثری انداز سے الگ ہونے کی شعوری کوششیں محسوس کی جا سکتی ہیں۔ مذکورہ بالا ناول نگاروں اور ان کے فوری پیش رو خواتین ناول نگاروں نے اپنے فن پاروں میں کچھ نے پرزور طریقے اور کچھ نے ہلکی آنچ کے ساتھ مرد اساس معاشرے کے بنے بنائے اصولوں کے خلاف ایک تحریک کی ضرورت کو شدت سے محسوس کیا ہے اور تقریباً یہ اشارہ، واضح طور پر کر دیا ہے کہ مردوں نے کیونکر دنیا کو تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کیا ہے اور جمہوریت کے نام پر جنگل راج کی کیسی کیسی گھنونی تصویریں پیش کی ہیں۔ اس سطح پر آج کی مشرقی اور مغربی عورتیں ایک ہی طرح سے سوچتی نظر آتی ہیں۔ ثروت خان جو افسانہ نگار اور ایک تانیثی نقاد کے طور پر ابھریں نے اپنے ناول بلکہ پہلے ناول 'اندھیرا پگ' (۲۰۰۵)، آشا پربھات جن کی پہچان نظم نگاری سے بنی ہے بالخصوص اپنے دوسرے ناول 'جانے کتنے موڑ' (۲۰۰۹)، ترنم

ریاض جو نظمیں لکھتی ہیں اور ایک افسانہ نگار اور تانیثی تنقید کے حوالے سے جانی جاتی ہیں انہوں نے اپنے ناول 'مورتی' (۲۰۰۳) اور برف آشنا پرندے ( ) کے علاوہ ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے بھی جانی پہچانی جاتی ہیں۔ صادقہ نواب سحر جو ہندی شاعری اور ہندی تنقید میں جانا پہچانا نام ہے ان کا ناول 'کہانی کوئی سناؤ متاشا' (۲۰۰۹ء) میں شائع ہوا۔ ڈاکٹر نسرین بانو (ہندی افسانے لکھتی ہیں جن کے اردو مجموعے اب تک شائع ہو چکے ہیں، مقالے بھی لکھتی ہیں) کا ناول 'ایک اور کوسی' (۲۰۰۹ء) ناصرہ شرما ہندی کی مشہور ادیبہ ہیں ان کا ناول 'زندہ محاورے' اور انجم بہار ہاشمی کا ناول 'قصر دل' اور برطانیہ میں مقیم صفیہ صدیقی کا ناول 'دشت غربت' میں نہ کہ مرد اساس معاشرے کی ذہنیت کا پردہ فاش کیا گیا ہے بلکہ نئی انسانی ہمدردی اور انسانیت کی نئی راہیں دریافت کرنے پر زور دیا گیا ہے۔
نئے عہد میں ایک طرف اگر عورتوں نے ناول کو اپنے لیے موزوں صنف ادب تصور کیا تو مغرب اور مشرق کے کچھ تذکیری ناقدوں نے ناول کی موت کے راگ بڑی شدت سے الاپنے شروع کردئے۔ کچھ نے اسے زوال پذیر صنف قرار دیا تو کچھ لوگ اب ناول میں Irrealism غیر حقیقت پسندی کو ضروری سمجھنے لگے ہیں۔ انہیں حقائق پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنے ایک مضمون میں یہ قیصر ضحیٰ عالم نے لکھا ہے:

''بہر حال نائپال نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ اس کی سمجھ سے بالاتر ہے کہ کوئی کیوں اختراعی یا گڑھی ہوئی کہانیاں پڑھنا پسند کرے گا؟ ......آج کی دنیا کی پیچیدگیوں کو صرف Nonfiction ہی گرفت میں لاسکتا ہے'' بکر انعام یافتہ ی این میکوین (Ian Mc Ewan) نے بھی مانا ہے کہ ایک وقت تھا کہ وہ بھی اختراعی کرداروں کے آمنے سامنے ہونا پسند نہیں کرتا تھا۔''

یہ سچ ہے کہ لوگ اب خالص تخیل پر مبنی ناول افسانوں سے دلچسپی نہیں رکھتے لیکن یہ ایک مریضانہ خیال ہے کہ ناول کی موت ہوگئی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ حقائق پر مبنی واقعات کو فکشن کے فارم میں ڈھالنے کی روایت گہری ہوگئی ہے۔ آج کے فکشن نے تاریخ کو اپنا نشانہ بنایا ہے۔ یہ سچ بھی ہے کہ فکشن نگاروں میں ثروت خان نے اس گمشدہ طریق کار کی بازیافت کی ہے۔ یعنی فکشن میں ریسرچ کی اہمیت پر زور دیا ہے۔ اپنے ناول اندھیرا پگ میں حاشیہ آرائی اور فٹ نوٹ میں تحقیقی اشارے رقم کئے ہیں۔ 'اندھیرا پگ' کے دیباچے بعنوان 'گفتگو آپ سے' کے تحت واضح طور پر مصنفہ نے لکھا ہے کہ انہوں نے راجستھان کے کئی مقامات کے اسفار کیے۔ اس ضمن میں انہوں نے جناب نند کشور شرما Desert Culture Centre Jaisalmer کا شکریہ ادا کیا ہے۔ (ص:6) جنہوں نے انہیں راجستھانی تہذیب سے متعلق لٹریچر فراہم کیا۔ جودھپور سے جیپور کے سفر کے دوران محترمہ

وجے لکشمی سے دوستی ہوئی دراصل وہی روپی یعنی اس ناول کے مرکزی کردار کی پھوپھی ہیں یعنی محرمہ نے اسی ناول پر ایک Project کی طرح کام کیا ہے۔ گویا ثروت خان کی نظر آج کے ناولوں کے قاری کی شکایت پر ہے اور وہ یہ بھی جانتی ہیں کہ فکشن اور نان فکشن سے متعلق امتیازات وافتراقات پر غور وفکر کرتے وقت ہمیں اس حقیقت کو بھی فراموش نہیں کرنا ہوگا کہ بیانیہ دونوں جگہ ہے چاہے وہ تخیلی واقعہ ہو یا تاریخ اور جہاں بیانیہ ہوگا وہاں زبان کا مجازی پہلو بھی ضرور ہوگا اور حقیقت وہی ہے جو زبان کے ذریعے قائم ہوتی ہے۔ وہ سچے کردار ہوں یا واقعات انہیں ہم کسی نہ کسی بیانیہ کے سہارے سامنے رکھنے پر مجبور ہیں جس میں بیان کنندہ کوئی نہ کوئی نقطۂ نظر ضرور سامنے رکھتا ہے۔ گویا جو سامنے ہو رہا ہے اسے لسانی سانچے میں ڈھالنا آسان نہیں اور یہ کام ثروت خان نے اپنے ناول میں کیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ تانیثی مصنفین زیادہ تر وہی مواد یا ان اصناف پر توجہ دیتی ہیں جو صریحاً حقائق پر مبنی ہوتے ہیں جیسے خودنوشت، ڈائری، یادداشت، سفرنامہ وغیرہ۔ 'کہانی کوئی سناؤ متاشا' بھی نسوانی خواہش کا ایک ثمرہ ہے۔ صادقہ نواب نے اس ناول کو سوانحی ناول کا روپ دیا ہے تا کہ اسے محض تخیل کی پیداوار نہ سمجھا جائے۔ 'جانے کتنے موڑ' کو پڑھتے وقت بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ مصنفہ کا مشاہدہ ہے۔ مقامات اور کرداروں کی حرکات وسکنات اور ان کی مقامی زبان سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ناول خالص تخیلاتی سرگرمی کا نتیجہ نہیں ہے۔ 'لَا' میں جس طرح ہم آشا کو دیکھ سکتے ہیں اسی طرح متاشا میں صادقہ کو تو وہیں روپی پر ثروت کی چھاپ بھی نظر آتی ہے اور یہ کوئی عیب نہیں۔ رہا سوال 'مورتی' کے 'ملیحہ' کا اور اس ناول میں کتنا تخیل اور کتنا ریسرچ کا تو یہ ناول کسی حد تک تھوڑا تصنع کا شکار ہے۔ ناول فن سنگ تراشی مجسمہ سازی کے پس منظر میں ہے۔ اس فن سے مصنفہ کا لگاؤ اور اس فن کے بعض ضروری امور سے متعلق ان کی معلومات کسی حد تک ہی ہمیں ناول پر شک کرنے سے روکتی ہے۔ ملیحہ میں بھی ترنم موجود ہے۔ آشا پر بھات کے پہلے ناول 'دھند میں اگا پیڑ' پر آدرش اور تخیل دونوں غالب ہے ان کا یہ ناول کمزور ہے لیکن اندھیرا پگ، کہانی کوئی سناؤ متاشا، اور مورتی اور جانے کتنے موڑ کو ہم ایلن شاولٹر کے لفظوں میں مرد کا متن (Andro text) ہرگز نہیں کہہ سکتے۔ ان ناولوں کو ہم تانیثی (Gyno text) کہہ سکتے ہیں۔

ماحولیات (Ecology) کے اعتبار سے اندھیرا پگ ''صحرا'' سے اور کہانی کوئی سناؤ متاشا شہر سے اور جانے کتنے موڑ دیہات اور شہر دونوں سے وابستہ ہے۔ اسی طرح اردو ناول میں Wilderness یعنی غالباً پہلی بار صحرائی ثقافت، رسوم اور اساطیر کے پس منظر میں سماج کی دبی کچلی پسماندہ ذی روح، عورت کی آزادی کی بات فن کارانہ طور پر اندھیرا پگ میں کی گئی ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ پیغمبر عیسیٰ کو صحرا میں ہی خدائے واحد کا عرفان حاصل ہوا

تھا۔ دیکھا جائے تو صحرا اور پہاڑ وغیرہ دنیا کے Epic میں زیادہ استعمال ہوئے ہیں۔ ویسے کہانی سناؤ متاشا میں سفرنامے کی سی خصوصیات ہیں۔ ناول کی پروٹو گونسٹ سفر کرتی نظر آتی ہے اس رعایت سے جنگل پہاڑ کے علاوہ کھیت کھلیان بھی ہمیں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ گھریلو فکشن میں اس نوع کا ماحول ہی جان ڈالتا ہے۔ جانے کتنے موڑ میں بھی سفرنامے ہیں۔ اس رعایت سے شہر کے علاوہ پہاڑ آشا پربھات کے ناول کا منظر یہ حصہ بنے ہیں۔ جس وقت 'لتا' پہاڑوں یعنی کاٹھمانڈو اور پوکھرا جاتی ہے اس وقت وہ زندگی کے جملہ رنگوں اور دکھوں سے ویسے ہی واقف ہوگئی ہے جس طرح دنیا اور اس میں موجود دکھ کو سمجھنے کے لیے بدھ نے کپل وستوں چھوڑا تھا۔ ہم جانتے ہیں کہ موسیٰ نے بھی پہاڑوں کو پار کیا تھا اور احکامات خداوندی پائی تھی۔ 'اندھیرا یگ' میں روپی اور راج کنور کے علاوہ روپی کے دکھ کو ظاہر کرنے کے لیے صحرائی ہواؤں، آندھیوں کی تصویر کشی جس طرح سے کئی مقامات پر ثروت خان نے کی ہے اس سے ایسا لگتا ہے کہ یہ کردار عیسیٰ کی طرح دنیا کے دکھوں اور بیماریوں کا علاج ڈھونڈھ رہے ہیں۔ روپی کا گاؤں چھوڑ کر شہر کی طرف مراجعت عرفان کی منزلیں طے کرنے کے مترادف ہے۔ اسی طرح ان ناولوں میں پیش کردہ منظر اور ماحول کردار اور حالات کو حد درجہ معنی خیز بناتے ہیں۔ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ قارئین کی سہولت کے لیے جنھوں نے ان ناولوں کو نہیں پڑھا ہے کو مختصر ''اندھیرا یگ'' کی بابت کچھ اشارے کر دیے جائیں۔

'اندھیرا یگ' ایک برہمن گھرانے کی لڑکی روپی کی کہانی ہے جو دیش نوک راجستھان کی رہنے والی ہے۔ اس کی پھوپھی اسے بہت پیار کرتی ہے۔ وہ آگے پڑھنا چاہتی ہے ڈاکٹر بننا چاہتی ہے۔ اس کی پھوپھی راج بھی یہی چاہتی ہے لیکن باپ رتن ناتھ اس کی شادی کر دیتا ہے اور کچھ ہی دنوں بعد وہ بیوہ ہو جاتی ہے۔ ایک ایسی لڑکی جسے ابھی عورت ہونے کے معنی سے واقفیت بھی ٹھیک سے نہیں ہوئی تھی۔ اسے اندھیرے یگ کی رسم ادا کرنی پڑتی ہے۔ روپی کو اپنے گھر میں بیوہ کے کپڑے پہن کر ایک الگ کوٹھری میں رہنا پڑتا ہے لیکن شہر سے آکر اس کی پھوپھی اسے شہر لے جاتی ہے اور اس کا داخلہ میڈیکل کالج میں کرا دیتی ہے۔ ادھر گاؤں میں جب اس بات کی خبر ہوتی ہے تو پنچایت میں پنڈت رتن ناتھ کا حقہ پانی بند کر دینے کا فیصلہ سنایا جاتا ہے۔ راج کنور پنچایت کو للکارتی ہے۔ مار پیٹ ہو جاتی ہے اور روپی کے پتا پنڈت رتن ناتھ بہن کو دھتکار دیتے ہیں۔ اس غم میں شہر پہنچ کر راج کنور بیمار پڑ جاتی ہیں اور مرنے سے پہلے اپنے شوہر سے یہ وچن لیتی ہے کہ وہ روپی کو گاؤں نہیں بھیجیں گے اور ڈاکٹر ضرور بنائیں گے لیکن روپ کے دادا بشن سنگھ پنچایت کے ڈر سے شہر پہنچ کر روپی کو دھوکے سے گھر لے آتے ہیں اور وہی

کال کوٹھری اس کا مقدر بن جاتی ہے وہ بھاگنے کی کوشش کرتی ہے لیکن ناکام ہو جاتی ہے۔اس درمیان اس کے گھر کی نوکرانی رونی سے ناجائز رشتہ پنڈت رتن ناتھ کا ہو جاتا ہے وہ حاملہ ہو جاتی ہے۔عزت کے ڈر سے دھونی کے ہوتے ہوئے رونی کو جان سے مار دیا جاتا ہے۔روپ کی ماں کا احتجاج دھرا کا دھرا رہ جاتا ہے۔ایسے میں رونی کو نہ پاکر روپ دھونی سے سارا راز جان لیتی ہے اسے باپ سے نفرت ہو جاتی ہے اور ایک دن اپنے عاشق راجکمار کو خط لکھ کر دھونی کے ذریعے اس تک پہنچاتی ہے جس میں رونی کی موت کا واقعہ لکھا گیا ہوتا ہے۔راج کمار خط پولس کو دیتا ہے۔پولس آتی ہے۔تہہ خانہ میں جاتی ہے وہاں سے کئی نئی پرانی لاشیں نکلتی ہیں۔رتن کو پولس گرفتار کرتی ہے یعنی روپ کی ماں رشوت دے کر اپنے پتی کو بچا لیتی ہے۔پولس کے جاتے ہی روپ سب کے سامنے دھونی کو لے کر شہر روانہ ہو جاتی ہے جس کے پیچھے پیچھے راج کمار بھی ہے۔

آپ نے اندھیرا پگ کی کہانی تو سن لی لیکن یاد رہے کہ کہانی ناول نہیں ہے ناول وہاں ہوتا ہے جہاں کہانی سماجی سروکار اور ثقافتی جزئیات نیز ثقافتی سیاق کا منظر نامہ ہوتا ہے، جو کہانی کو بامعنی بناتا ہے اور زندگی کے گہرے تجربے کو سامنے لاتا ہے۔اسکے لیے جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا اس ماحول اور منظر پر بھی نظر رکھنی پڑے گی جو کرداروں میں رنگ بھرتے ہیں اور ان کی نفسیات کی پیشکش اور زندگی کے وسیع ترین جذبات اور احساسات کے دامن کو تھامتے ہیں۔فطرت اور انسان کے رشتے پر روشنی ڈالتے ہیں۔اندھیرا پگ کا یہ صحرا ملاحظہ فرمایئے:

تین دن سے مسلسل نہ ٹوٹنے والی لڑی کی طرح آسمان سے دھول کے بادل برس رہے تھے۔ ہر طرف غبار ہی غبار، ریت ہی ریت، کھانے میں، پینے میں، کپڑوں میں، سر میں ...... پسینے سے شرابور جسم پر بھی ایسی چپٹتی کہ پورا وجود ہی، کرکرا، کھردرا چپ چپا محسوس ہونے لگتا۔ تپتے سورج نے زندگی کی سختی میں اور اضافہ کر دیا تھا۔ دوپہر ہوتے ہوتے قصبہ میں سناٹا چھانے لگتا اور ذرا سی دیر میں شائیں شائیں لو چلنے لگتی۔''

یہی وہ موسمی کیفیات ہے جس نے اس دن دھونی کی بہن رونی یعنی اپنی نوکرانی کی عزت تار تار کرنے کا سیاق یا موقع پنڈت رتن ناتھ کو فراہم کیا تھا۔بیانیہ کا یہ نکھرا مگر جملوی سطح پر بولنے جیسا اسلوب پڑھنے کے دوران ہمیں اسی ماحول میں لے جاتا ہے۔لفظ کرکرا کھردرا، چپ چپا جیسے صوت نقلی الفاظ مقامی ماحول اور جزئیات کو دکھانے میں اہم رول ادا کرتے نظر آتے ہیں۔

تانیثی ناولوں میں یعنی وہ ناول جو عورت مرکزی پیراڈائم میں لکھا گیا ہو اس میں جنگ کے بیانیے کے بجائے پیدائش کا بیانیہ غالب ہوتا ہے۔عورت ویسے بھی جنگ میں جیتی جانے والی شئے، مریادا کی بھینٹ، سماج

کے اصولوں کی بھینٹ چڑھائی جانے والی شئے رہی ہے جیسے جانے کتنے موڑ میں لتا کو خوشحالی کے لیے اپاہج کے حوالے کردیا جاتا ہے۔ روپی کو اندھیرا پگ میں سماجی اصولوں اور رواجوں کے نام پر پڑھانے کے بجائے شادی کر دینا ضروری سمجھا گیا ہے۔ متاشا کو اس کے باپ نے خود اپنے دوست کے حوالے اپنا کام نکالنے کے لیے پیش کردیا گیا اور اسی طرح ملیحہ کو فن کار بنانے کے بجائے ایک مشین قسم کے انسان کے حوالے کردیا گیا۔ باوجود یہ کہ روپی، راج اور متاشا Good girl syndhrome یعنی سماج کے اصولوں کے سامنے سر جھکا دینے والی عورتیں نہیں ہیں لیکن جانے کتنے موڑ کی 'لتا' مورتی کی لمیحہ اور 'ایک اور کوسی کی 'انم' گڈ گرل سنڈ روم کی مثالیں بن گئی ہیں۔ ان جملہ کرداروں کی نفسیات کو پیدائش کے بیانیے کے ذریعے ابھارا گیا ہے۔ مرد اکثر جنگ کی، لڑنے بھڑنے کی باتیں کرتا ہے اور اپنی بہادری کا قصہ بیان کرتا ہے جیسے مثال کے طور پر روپی کا دادا (جب روپی شہر میں ڈاکٹری پڑھ رہی ہوتی ہے اور گاؤں میں کسی قسم کا اس حوالے سے چرچا نہیں ہو رہا ہوتا ہے) تو دوستوں کے پاس بیٹھ کر اس قسم کی خوش گپیاں کر رہا ہوتا ہے یعنی ہر جنس فطری طور پر اپنی مخصوص اظہاری نفسیات رکھتی ہے۔ عورت کے لیے 'بچہ' ہی سب کچھ ہے۔ اس لیے اس کو پیدا کرنا اس کے پیدا ہونے کے بعد اس عمل کا ذکر کرنا اس کی فطرت میں شامل ہے اس لیے کوئی بھی تانیثی ناول یا فکشن پیدائش کے بیانیے یعنی خاندانی مسائل، پرورش و پرداخت اور پھر بچوں کی خاطر قربانی جیسے امور زندگی سے تشکیل پذیر ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ مردوں کے مقابلے بعض مخصوص استعاروں کی مدد سے اپنے بیانیے کو رمزیت عطا کرتی ہیں مثلاً چڑیا، فاختہ، تتلی وغیرہ۔ عورت کا بیانیہ صوت نقلی الفاظ (Onomatoppoeic word) کی بہتات کو سامنے لاتا ہے۔ یعنی وہ الفاظ جس کی صوت ہی میں اس کے معنی موجود ہوں جیسے کھٹ، ٹن وغیرہ۔ آپ نے اندھیرا پگ پڑھا ہے تو کوئی ہر دو تین صفحہ بعد اس طرح کے الفاظ سے آپ کا سامنا ہوا ہوگا جس کے ذریعے اندھیرا پگ کا بیانیہ حد درجہ واقعیت سے قریب کیا گیا ہے۔ اور اس طرح ثروت خاں کا بیانیہ تصویری امیج میں بدل گیا ہے۔ جیسے ریگستانی علاقے میں بارش ہو رہی ہے۔ روپی کے بچپن کے دن ہیں اور وہ اپنی سہیلی رمیا کے ساتھ کھیلتے ہوئے بہتے پانی میں کیونکر ادھم مچا رہی ہے۔ ثروت خان کا بیانیہ ملاحظہ فرمائیں:

''اے...... روپی نے اس پانی میں اتر کر ایسا چھپاکا لگایا کہ پانی کے ڈھیروں چھینٹوں نے رمیا کو بھگو دیا۔ روپی کا یہ بچکانہ روپ دیکھ کر، رمیا کا بچپنا بھی جاگ گیا اور دونوں پانی میں چھبل چھبل، سڑ سڑ کرتی پانی کو چیرتی، اچھالتی، کودتی، کداتی تالاب کی طرف چل دیں۔''

مذکورہ بالا عبارت میں ثروت نے چھپا کا، چھبل چھبل ،سڑ سڑ لفظ کے ذریعے ماحول کو مصور کر دیا ہے ۔آگے افعال کے طویل سلسلے ہیں یہ Actions کو ویسے ہی دکھاتے ہیں جیسے کہ سنیمائی متحرک پیکر ہوتے ہیں یعنی سڑ سڑ کرتی پانی کو چیرتی، اُچھالتی، کودتی کداتی تالاب کی طرف چل دیں۔

پیدائش کے بیانیے سے عورت کا لگاؤ اس لیے بھی ہوتا ہے کہ مرد ہو چاہے عورت اس کا جسم کرسٹوا کے مطابق حیاتیات کے اصولوں کے علاوہ زبان اور ثقافت کی پیداوار ہوتا ہے لیکن مرد کے مقابلے عورت کو ایک اختصاص حاصل ہے کہ وہ حاملہ ہوتی ہے تب اسے پہلی بار خود اپنے آپ کے علاوہ دوسرے کے وجود (بچہ) کا احساس شدت سے ہوتا ہے۔اندھیرا پگ کی رونی اور پھر اس تجربے کا عارف روپی کی ماں سبھدرا کا اپنے شوہر سے بغاوت کرنا۔ بچے کو بچانا اور جانے کتنے موڑ میں لتا کا حاملہ ہونا اور ایک نئے تشخص کے تحت اس پر پورا اور اس حادثے کو نظر انداز کر دینا جو اس کے نندوئی نے کیا تھا۔ دراصل اپنے علاوہ دوسرے کے وجود کا گہرا وجودی احساس ہی ہے۔ یہ تجربہ مرد کو ہو ہی نہیں سکتا۔اس طرح تشخص اور شناخت کا روایتی تصور تار تار ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عورت کسی بھی کام کو انجام دیتے وقت پیدائش کے اس تجربے کو استعارے کے طور پر برتتی ہے۔ مرد اس تشخص کو سمجھ ہی نہیں سکتا اس لیے اس کا بیانیہ اس کی فطرت کی رو سے جنگ کا بیانیہ بن جاتا ہے اور عورت کا پیدائش کا بیانیہ۔ آیئے اسے کچھ مثالوں سے سمجھنے کی سعی کریں۔ پہلے اندھیرا پگ سے کچھ مثالیں سامنے رکھیں۔ راج کنور روپی کی پھوپھی اپنے بھائی کو شہر لے جا کر روپ کو پڑھانے کے لیے راضی نہیں کر پاتی۔ باپ بیٹی کے درمیان گرما گرم بحث اور پھر روپ کا ماں یا باپ کی کسی بات کو بھی نہ ماننا۔ پھر روپ کی ماں سبھدرا کا اپنی نند اور شوہر کو بے بس نظروں سے دیکھنا اور پھر:

''سر پہ آنچل کو ٹھیک کیا۔ کمر سے لٹکے چابیوں کے گچھے کو سنبھالا اور روپی کے تیوروں سے فکر مند، پژمردہ چہرہ لیے مڑیں اور اندر جا کر مسہری پر بچھی چادر کی سلوٹوں کو درست کرنے لگ گئیں۔ایک کونے سے چادر کو کھینچ کر درست کرتیں تو دوسری طرف شل پڑ جاتے، وہ اسی طرف جا، وہی عمل دہراتیں تو بیچ میں شل آ جاتے۔ آخر سلوٹیں بدستور رہیں تو انہوں نے جھنجھلا کر اسے چھوڑ دیا.........شاید چادر سکڑ گئی۔ پھر سر کھجانے لگیں......پھر شاید تھکان کا احساس ہوا یا کیا؟......جسم کو مسہری کے حوالے اس طرح کیا جیسے وہ بے جان لوتھڑا ہو۔''

اسے ہم تانیثی بیانیہ یا پیدائش کے بیانیہ کا عمدہ نمونہ قرار دے سکتے ہیں۔ یہ سپاٹ بیانیہ نہیں ہے اخیر میں تشبیہہ بیانیے کو اور چوکھا کرتا ہے۔ جو لوگ چادر کے محاوراتی استعمال سے واقف ہیں انہیں سمجھنے میں دیر نہیں لگے

گی کہ عورت اس سماج میں صرف رفو کرتے کرتے اور سلوٹیں درست کرتے کرتے مر جاتی ہے۔ یہ بیانیہ دراصل ایک طرح کا طویل استعارہ خلق کرتا ہے۔ایک طرف کی چادر درست کی تو دوسری طرف کی چادر سکڑ گئی۔ یہ انتہائی اشاراتی جملہ ہے۔ مذکورہ بالا بیانیہ سے تو ہمہ داں راوی کا بیانیہ جو اکثر اپنے خیالات دوسروں پر تھوپ دیتا ہے لیکن آپ نے غور کیا کہ راویہ نے قاری پر یہ واضح کیا ہے کہ...... ''پھر شاید تھکان کا احساس ہوا یا کیا؟......یعنی راویہ کو بھی پتہ نہیں کہ سھدرا کو کیا سوجھا کہ وہ بستر پر دراز ہوگئی یہ کہہ کر یہاں قاری کو بھی غور کرنے پر مجبور کر دیا گیا ہے۔ یعنی مصنفہ نے ہمہ دانی کے الزام سے خود کو بری کر لیا ہے اور واقعے کی سچائی پر قاری سے بھی مہر لگا لیا ہے۔ پھر اس بیانیے کے دیگر جزئیات پر نگاہ ڈالیے تو آپ پر منکشف ہوگا کہ مرد ناولسٹ بستر ٹھیک کرنے کا مذکورہ بالا منظر اس خوبصورتی سے بیان کر ہی نہیں سکتا، جس طرح کہ ایک عورت کر سکتی ہے۔ایک اور مثال پر آپ کی توجہ مرکوز کرنا چاہوں گا۔ رونی سے جسمانی رشتہ قائم کر کے روپ کے باپ رتن سنگھ نے اسے حاملہ کر دیا۔اور اسے مروانے یا اسقاط حمل پر تلا ہوا ہے۔ سھدرا یعنی اس کی بیوی اسے اس انرتھ سے روکتی ہے ملاحظہ ہو اس ناول کا یہ مکالماتی پیدائش کا بیانیہ جسے آج کی اصطلاح میں ہم بچے پر کی جانے والی سیاست کا گھنونا چہرا قرار دے سکتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں مندرجہ ذیل سین:

''جو کیا ہے اسے بھرو بھگتو ...... میں کیا جانوں ......سھدرا نے تمسخرانہ انداز میں جملہ پھینکا یہ نہیں ہو سکتا

''اچانک رتن سنگھ کا چہرہ سخت ہوتا چلا گیا'' گرا دو بچہ......

بچہ اس سنسار میں جنم لے کر رہے گا

آپ نے زبان اٹھائی تالو سے ماردی...... بچہ گرادو......کوئی مذاق ہے...... ماں کی جان کو خطرہ ہوتا ہے۔

خطرہ......! خطرے کا آبھاس تو مجھے بھی ہو رہا ہے، تمہارے فیصلے پر...... کیوں اس دو کوڑی کی استری پر تمہارا لاڈ ٹپک رہا ہے......مر جانے دو......دونوں کو۔''

یہ مکالماتی بیانیہ عورت کی نفسیات اور مرد کا عورت کو جوتی سمجھنے کی نفسیات کی گھناؤنی مثال ہے۔ Child Politics کے علاوہ یہاں پیدائش کے ازلی جذبے کی خواہش نے اپنے سر کو ابھارا ہے جس نے سھدرا کو اپنے شوہر سے بغاوت پر مجبور کر دیا ہے۔

مرد اساس بیانیے میں اس نوع کا منظر نہیں ملے گا۔ اب ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عورت جب

افسانے یا ناول لکھتی ہے یا پہلے سے موجود بیانیہ اسالیب اور ساختوں کو جوں کا توں استعمال کرتی ہے یا ان میں سے کسی ایک یا مخصوص ساختوں اور اسالیب کو منتخب کر لیتی ہے۔ مثال کے طور پر 'اندھیرا پگ' کو ہی سامنے رکھیں اور دیکھیں کہ ثروت خان نے کہانیاں کہنے (Storification) کا کون سا طریقہ استعمال کیا ہے۔

بیانیہ کی ہیئت کا کمال یہ ہے کہ یہ مصنف یا مصنفہ کو بے دخل کر دیتا ہے۔ یعنی مصنف ہی یا مصنفہ ہی راست طور پر کہانی بیان نہیں کرتی یا کرتے بلکہ کسی نہ کسی راوی کو آگے کر دیتے ہیں۔ یا کر دیتی ہیں۔ پھر بیانیہ کے درمیان مکالمہ (کبھی زیادہ تو کبھی کم) کی وجہ سے بھی مصنف متن سے ایک خاص دوری پر رہتا ہے۔ اس حساب سے ناول عورت لکھے یا افسانہ مرد۔ فرق نہیں پڑتا۔ عورت کے بیانیے اور مرد کے بیانیے میں اختیار کئے گئے نقطۂ نظر (Focalisation) کی وجہ سے افتراق پیدا ہوتا ہے۔

اندھیرا پگ Episodic ناول ہے۔ کہانی کوئی سناؤ متا شا روز بہ روز جو کچھ ہوا اسے لکھ دینے کے انداز یعنی روزنامچہ کی ہیئت میں لکھا گیا ہے۔ مورتی ایک سانس میں لکھا گیا مقالے جیسا ناول ہے' جانے کتنے موڑ' بھی اپنی سوڈ کی رو سے لکھا گیا ہے۔ ایک اور کوسی اور کفارہ بھی افسانے کی طرح یا مقالے کی طرح غیر منقسم ساخت رکھتے ہیں۔ ناصرہ شرما کا ناول ہجرت اور مہاجر کے دکھ کو بیان کرتا ہے۔ یہ موضوع انتہائی پامال قسم کا موضوع ہے اسے میں اردو ناولوں کا بھوت کہتا ہوں۔

اندھیرا پگ واحد غائب راوی کا بیانیہ ہے (Authorical Persona) اور ژینت نے اسے diegetic Extra Narator کا نام دیا ہے۔ دراصل واحد غائب راوی کرداروں کا تعارف کراتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ ان پر تبصرہ بھی کر سکتا ہے اور واقعات بھی خلق کرتا ہے۔ وہاں جہاں روپی کے دادا بشن سنگھ فراغت کے دنوں میں اپنے بوڑھے دوستوں کے ساتھ بیٹھا ہے تو اصرار پر اُس نے روپ پیشور کا قصہ سنایا:

''روپ پیش ور سنگھ کو اپنے ماضی پر فخر بھی تھا اور پچھتاوا بھی ......لیکن اس وقت تو ماحول ہی کچھ ایسا خوشگوار اور شوخ تھا کہ وہ بھی اس شوخی میں شریک ہو گیا۔ خان تو جیسے بے چین ہو گئے۔ ننھے بچے کی سی ضد کر بولے......

''اونہہ جلدی سناؤ اپنی کہانی ......صحیح کہہ رہا ہوں ....ایسی گھڑیاں بڑے دنوں میں نصیب ہوا کرتی ہیں۔ وہ اپنی کرسی سرکاتے سرکاتے روپ پیشور کے بالکل قریب لے آئے اور منتظر ہو کر ان کا منہ تاکنے لگے کہ اب بول پھوٹیں اب بول پھوٹیں۔

ان کی اس کیفیت کو دیکھ کر تینوں دوستوں نے خوب مزے لیے۔ آخر روپ پیشور نے پنڈت جی سے کہا۔

یار بشن سنگھ......تو ہی سنا...... تیری بات میں لچھا ہوتا ہے......

بشن سنگھ تو جیسے پھول گئے ۔ایسے سنبھل کے بیٹھے، جیسے لڑکپن کا بانکا......اور بڑے گد گد ہو کر اللہ رکھا سے مخاطب ہوئے۔

''یہ روپیشور جس جات کا ہے نا،اس جات میں ایک پرتھا ہے۔''

کون سی پرتھا۔کھل کر جلدی جلدی بتاؤ...... بتانا ہو تو''خان نے بے صبر ہوتے ہوئے مصنوعی غصے کا اظہار کیا۔

''بے صبرے، بتا تو رہا ہوں۔دھیرج رکھ۔جلدی میں مزہ نہ آنے کا''سب مسکرانے لگے۔لیکن خان کی حالت بالکل ایسی ہوگئی جیسے کھانے کی پہنچ سے دور رال ٹپکاتا کتا......بشن سنگھ نے بیڑی کا بنڈل اور ماچس تکیے کے نیچے سے نکال کر سکھی رام کو دیا......اور خود سائڈ ٹیبل پر رکھا حقہ گڑگڑانے لگے......پھر دھواں چھوڑتے ہوئے بولے:

''بات یہ ہے کہ خان کہ پوری برادری سے سب مر دمل کر ایسے نو جوان کو چن لیتے ہیں جو ہر کسوٹی پر پورا اترتا ہے......جس مرد میں یہ سب ہوتا ہے وہ برادری کا سب سے سندر پرش چن لیا جاتا ہے پھر شروع ہوتی ہے اس کی نئی اور انوکھی زندگی......اب چاہے لڑکی شادی شدہ ہی کیوں نہ ہو اگر اس کو بھا جائے تو اس استری کا پتی خود، اپنی بیوی کے ساتھ سونے کی کھلی دعوت اسے دے ڈالتا ہے......تاکہ اس کے یہاں اچھی نسل کا بیٹا پیدا ہو......

اور اگر بیٹی ہوگئی تو۔اللہ رکھا کی آنکھیں پھٹی تھیں اس میں اس نے سوال کر ڈالا

''بیٹی ہوتی تو یہ لوگ اسے جینے نہیں دیتے............

''تو کیا اپنا روپیشور ایسا ہی نوجواں رہا ہے۔

''ہاں یہ لوگ ایسے نوجوان کو'سانڈ' کی طرح مانتے ہیں۔

اس وقت تو اس کی انگلیاں گھی میں ہوتی ہیں......پھر ادھیڑ ہوتے ہوئے ساری مکھیاں اڑ جاتی ہیں......اور بڑھاپا آتے آتے دوسرا''سانڈ'' تیار کر لیا جاتا ہے......وہ بس بوڑھے کی طرح سڑکوں پر مارا مارا پھرتا ہے......تینوں نے مزے مزے میں یہ باتیں تو کرلیں ......لیکن اس کی گہرائی کا اندازہ اس وقت ہوا، جب انہوں نے روپیشور کو سسکتے دیکھا۔''

شاید ہی کوئی نقاد ہو جو ثروت خان کے اس بیانیہ ساخت اور حقائق کی دل کھول کی تعریف نہ کرے۔

یہاں مصنفہ نے کہانی کو خود سے آگے نہ بڑھا کر ایک کردار کو بیان کنندہ بنا دیا ہے۔ جس کے سامع طے شدہ ہیں یعنی بشن سنگھ بیان کنندہ اور خان، سکھی رام وغیرہ سامع۔ مزے کی بات یہ ہے کہ موضوع یعنی اس کہانی کا کردار روپیشور بھی سامع ہے جس نے خود کہانی بیان کرنا ضروری نہیں سمجھا یعنی کہانی سامعین واحد متکلم (روپیشور) کے بجائے واحد غائب راوی کے فارم میں سننا پسند کرتے ہیں۔ دراصل سننے والے بشن سنگھ کو ایک بہتر قصہ گو سمجھتے ہیں۔ اس بیانیے میں کہانی سے بچے تو بچے بوڑھے بھی اتنی ہی دلچسپی لیتے نظر آتے ہیں اس امر کی نشاندہی کے لیے ثروت خان نے بیانیے میں بعض Actions کے استعمال پر زور دیا ہے۔ جیسے بچے کی طرح کہانی سننے کی ضد کے لیے خبر یہ فعل کا استعمال۔ خان کا کہانی سننے کے لیے کرسی سرکاتے ہوئے روپیشور کے پاس آجانا۔ اور مصنفہ نے کہانی جاننے کا اشتیاق کتنا شدید ہے جس کے لیے ایسی تشبیہ کا استعمال بھی کیا ہے جو یہاں معنی کی شدت کو بڑھاتا ہے جیسے کھانے کو دیکھ کر کتا رال ٹپکاتا ہے۔ اتنا ہی نہیں جو کہانی خان اور سکھی رام کے لیے دلچسپی کا سامان ہے اس کہانی کا جیتا جاگتا کردار اسے خود سن کر آبدیدہ ہو گیا ہے۔ پھر سکھی رام اور خان کا پشیمان ہونا اور آگے کا حال کردار کی زبانی بیان ہونا اور روپیشور کا یہ انکشاف کہ ''میں ایچ آئی وی پوزیٹیو ہوں ...... بس دن گن رہا ہوں۔'' کو پڑھتے ہی قاری کے ذہن میں عورت اور مرد سے متعلق ڈسکورس پر نظر ثانی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اگر اسی سماج میں ایک عورت کے ارمانوں کی بلی چڑھادی جاتی ہے۔ اگر روپی کے بچپن کو شادی کے نام پر برباد کر دیا جاتا ہے اُسی سماج یا مرد اساس معاشرے میں روپیشور خود مرد نہ ہونے کی تمنا کرتا نظر آرہا ہے یہ کون سا سماج ہے جو اسے ایک انسان سے سانڈ بننے پر مجبور کر دیتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ ثروت خان نے روپی یا عورت کے جملہ مسائل کے تجزیے اور ان میں بیداری پیدا کرنے کے لیے مرد اساس معاشرے میں خود مرد پر ہونے والے مظالم سے روگردانی کی ہے یا ان پر نگاہ نہیں رکھی ہے اور عام قسم کا تانیثی فن کار بن کر ابھری ہیں بلکہ ناول کے بہت سے منظروں میں سماج کو کلی حیثیت دیکھنے کا ان کا رویہ اور روپیشور جیسے مرد کے اندر سے کھاتی رہنے والی تکلیف کو اجاگر کرنے کا معروضی نقطۂ نظر انہیں ایک دیانت دار اور نئی انسانیت پسند Female phase کی تانیثیت سے قریب ناول نگار کے روپ میں ابھارتا ہے۔ اس ناول میں ایک جگہ بے باک حقیقت نگاری (Combative Realism) کی ایسی مثال پیش کی گئی ہے جس کے لیے مصنفہ کو ایک بہت بڑے سیاسی اور ادبی حلقے کا عتاب جھیلنا پڑ سکتا ہے۔ قصہ یہ ہے کہ اپنے باپ، اس باپ سے جو مذہب کا رکھوالا ہے لیکن ایک عورت کا قاتل اس سے اس کی اپنی بیٹی یعنی روپی اپنی آزادی کے سلب کیے جانے پر کس بے باکی سے دقیانوسی نظام اور اس عہد کے مہابانیہ یعنی کمیونزم کو بھی چیلنج

کرتی ہے۔ملاحظہ فرمائیں:

''سب کچھ سن سمجھ کر، روپی جیسے آسمان سے گری۔ایک پھوپھی کی طاقت تھی وہ بھی یوں پست ہوتی نظر آئی۔جوان خون اور وہ بھی لڑکپن کا، بس ابال آ گیا۔سہمہ ہوا بچہ اب غرار ہا تھا۔

''میں پوچھتی ہوں باپو آخر کب تک ہم اس سسٹم کی بھینٹ چڑھتی رہیں گی۔یہ تو کمیونسٹوں سے بھی بدتر ہے، ذہن مشن، وژن۔سب کا ناش کرنے والا''اب وہ باپ کے روبرو تھی۔'' جیو کی مرتیو، تو یہیں ہو جاتی ہے بابو، ہاڑھ مانس کے لوتھڑے کو منشے نہیں کہتے۔نہیں باپو...... میں لوتھڑا نہیں بننا چاہتی۔مجھے ادھیکار چاہئے۔آپ نے شاستر پڑھے ہیں۔کیا آپ نہیں جانتے...... کیا سماج نہیں جانتا۔خود شاستروں کی رچنا استری نے کی ہے۔''

اس کردار کا یہ تیور اخیر دم تک برقرار رہتا ہے۔اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کردار پرانے مذہبی ہندستانی نظام ہی نہیں مارکسی تانیثیت کی آئیڈیولوجی سے بھی نالاں ہے۔یہ مابعد جدید عہد کی ایک انقلابی اور انتہائی طاقتور عورت کی آواز ہے۔ اردو میں ۸۰ کے بعد پیغام آفاقی کے مکان کی نیرا جیسی حد درجہ بیدار کردار کے بعد تانیثی ناول کا یہ اتنا ہی اہم کردار ہے جسے بیانیہ کے تفاعل کے ذریعے بڑی خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے۔ناول نگار نے آدرش وادی راستہ نہیں اپنایا ہے نہ سارے مسائل ناول میں ہی حل کر دیے ہیں۔ناول کے اختتام پر جیسا کہ آپ نے کہانی پڑھی ہے بس اتنا ہوا کہ یہ سماج دم بخود ہو گیا ہے۔سماج کے مذہبی ٹھیکے دار اور عقائد و رسوم کے دعویدار جیسے آنے والے زمانے کی رفتار سے خود بخود گھبرا اٹھتے ہیں جیسے ان کے پاکھنڈ کو نئی نسل سمجھ چکی ہے۔باپ یا ماں روپی کو کس منہ سے روکیں۔ روپی کی راہ میں آڑے آنے والا کوئی نہیں۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ثروت خان نے آنے والے زمانے کا ایک خاکہ ابھارا ہے۔اسی طرح 'جانے کتنے موڑ' 'مورتی' اور 'کہانی کوئی سناؤ متاشا' میں بھی مرد اساس معاشرے کو پست ہوتے دکھایا گیا ہے۔انہوں نے اپنے کرداروں کو جس سیاق میں رکھ کر ہمارے سامنے پیش کیا ہے وہ سیاق مرد مرکزی پیراڈائم کے ناولوں میں نہیں ہے جیسے ''اندھیرا پگ'' کی مخصوص ناگزیر رسم جو بیوہ کو آج اکیسویں صدی کے ہندوستان کے کسی خاص صوبے میں اب تک نبھانی پڑتی ہے۔اس سیاق کو سامنے رکھ کر ثروت خان نے اسے پورے ہندوستان اور کہئے کہ پوری عورت ذات کے حال زار پر غور و فکر کرنے پر ہمیں آمادہ کر دیا ہے۔یہ کسی مرد ناول نگار نے نہیں کیا ہے۔اسی طرح جانے کتنے موڑ میں اپاہج سے بیش قیمت شے کے موہ سے جس طرح عورت کو آزاد کیا ہے یہ سیاق نیا بھی ہے اور خطرناک بھی۔اسی طرح متاشا کے بہانے صادقہ نے عورت کو اپنے ہی گھر میں غیر محفوظ دکھایا ہے لیکن سب کچھ ہونے کے باوجود وہ بچوں کی پرورش و پرداخت اور ضرورت کو نہیں بھولتی۔اس

لیے ہم ان ناولوں کو تانیثی متن ہی قرار دے سکتے ہیں اس سے مراد صحیح متن ہے۔

ان ناولوں میں اور بالخصوص اندھیرا پگ میں مرد قاری پڑھتے ہوئے کس نوع کی بائیس سوچ یا رجحان (جو ایک عورت کی طرف سے مرد کے لیے یا مرد کی طرف سے عورت کے لیے ہوتا ہے) نظر نہیں آتا بلکہ ان خواتین ناول نگاروں کے یہاں غیر جانب دارانسانیت پسندی کا جذبہ کارفرما نظر آتا ہے۔ البتہ ایک صورت ایسی نظر آتی ہے جس پر غور کرنا ضروری ہے وہ یہ کہ ان ناولوں میں ہیرو کے تصور کو ذہن سے نکال دیا گیا ہے۔ اندھیرا پگ میں روپی کے شوہر کا وجود ہی موت سے عبارت ہے۔

ناول نگار نے تو اس کے ذکر کے لیے صفحہ دو صفحہ بھی مختص نہیں کیا ہے۔ متاشا کا شوہر گوتم بھی ایک مجبور شوہر ہے جو متاشا کے رحم وکرم کا محتاج ہے۔ جانے کتنے موڑ میں 'لتا' کا شوہر ایک اپاہج ہے جو نہ چل سکتا ہے نہ بول سکتا ہے۔ البتہ سدھاکر کے روپ میں یہاں ایک بیدار انسان کو ہیرو کی شکل میں پیش کرنے کی سعی ضرور کی گئی ہے۔ مورتی میں اکبر علی (جسے ملیحہ کا عاشق فیصل اصغر علی کہنا زیادہ پسند کرتا ہے) میں ہیرو کی جھلکیاں پیش کی گئی ہیں لیکن شوہر کی موت کا مژدہ سنایا گیا ہے۔ 'ایک اور کوسی' کا دانش انم کا شوہر بھی انم کے لیے نہیں ہے اور کافرہ کا ہیرو سلطانہ کے حکم کا غلام ہے۔ کہانی کوئی سناؤ متاشا میں (ایک سنگھ جی کی فیملی جہاں متاشا Paying Guest بن کر رہتی ہے) دیکھا کہ سنگھ ایک بچے کی دیکھ بھال اور روٹیاں پکاتا ہے یعنی بیوی کے رول میں ہے اور بیوی میاں کے رول میں ہے۔ یعنی ہر جگہ شوہر، مرد یعنی اتھارٹی کو ناموجود دکھایا گیا ہے۔ کہیں یہ نئے سماج کا پیش خیمہ تو نہیں؟ کہیں دنیا بڑے انقلاب سے دو چار تو ہونے نہیں جا رہی ہے؟ کم از کم ان ناولوں نے شوہر کی موت کا مژدہ تو سنایا ہی دیا ہے اور اس میں صد فیصد نہیں تو اوسطاً سچائی ضرور ہے لیکن اس کے باوجود ایک انسانی ہمدردی کا ماحول ان ناولوں میں ضرور نظر آتا ہے۔ جملہ ناولوں میں بعض مرد کرداروں نے انسان ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ اور ناول نگاروں نے بھی ان سے ہمدردی کا مظاہرہ کیا ہے۔ جیسے 'کہانی کوئی سناؤ متاشا' کا گوتم 'جانے کتنے موڑ' میں سدھاکر اور مورتی میں فیصل۔ اسی طرح بہت فن کارانہ انداز میں ثروت خان نے روپ بشور سے بے پناہ ہمدردی کا منظر نامہ خلق کیا ہے۔ اسی لیے یہ ناول مرد بہ مقابلہ عورت کے ناول نہیں ہیں بلکہ Female Phase کے ناول ہیں۔ ان ناول نگاروں نے فرائڈ کو رد کر دیا ہے۔ جیسے متاشا نے ایک جگہ کہا ہے کہ لڑکی پر باپ کا اثر ہوتا ہے جبکہ وہ اپنے باپ سے نفرت کرتی ہے۔ 'اندھیرا پگ' کی مرکزی کردار روپی کو آخر کار ماں باپ دونوں سے نفرت ہو جاتی ہے۔ 'جانے کتنے موڑ' کی لتا تو ماں باپ کے وجود کو ہی جیسے بھول جاتی ہے۔ مورتی میں ملیحہ ماں باپ کا ذکر بھی

نہیں کرتی۔ شہناز نبی نے لکھا ہے کہ عورت کے لیے واحد متکلم کا بیانیہ کارآمد ہے۔لیکن 'جانے کتنے موڑ' اور 'اندھیرا پگ' میں واحد غائب راوی کا بیانیہ ان ناولوں کے لیے ناگزیر معلوم ہوتا ہے۔یہی صورت مورتی میں نظر آتی ہے۔ البتہ ان جملہ ناول نگاروں نے عورت مرکزی پیراڈائم کی تشکیل مضبوطی سے کی ہے۔

اخیر میں ایک بات ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ بعض ناقدین نے 'اندھیرا پگ' اور 'کہانی کوئی سناؤ متاشا' پر تبصرہ کرتے ہوئے تکنیک اور زبان کی صحت سے متعلق شکایتیں درج کرائی ہیں۔ جیسے ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی نے 'اندھیرا پگ' کی تعریف کرتے ہوئے یہ لکھا ہے:

''ناول کا دوسرا مرد کردار راجکما ہے......دور سے ہی روپی پر فدا ہے۔ یہ ایک مجبور اور معاشرے کے قانونوں میں جکڑا ہوا عاشق ہے...... یہاں پر قاری کو تھوڑا تعجب ہوتا ہے کہ جب راج کمار سے روپی کی کہیں ملاقات ہی نہیں ہوئی......تو وہ راج کمار سے خط کیسے بھجواتی ہے اور راجکمار پر ہی بھروسہ کیوں کرتی ہے؟ ظاہر ہے یہ قصے کا ایک نازک موڑ ہے جہاں مصنفہ کو احتیاط سے کام لینا چاہئے تھا۔''

دوسرا اعتراض شہاب کا یہ ہے:

''یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ تھوڑے سے تغیر وتبدیل کے بعد اس ناول کو دیوناگری رسم الخط میں بھی آسانی سے پیش کیا جا سکتا ہے لیکن ''بیوی کی طرف متعارفانہ انداز سے دیکھا'' جیسے جملے تکلیف دیتے ہیں کہ قاری اس انداز نظر کا مطلب سمجھ ہی نہیں سکتا۔''

تیسرا اعتراض شہاب کا یہ ہے:

''دوسری بات یہ ہے کہ ناول کے اختتام پر مصنفہ جلد بازی کا شکار ہوگئی ہیں 'اندھیرا پگ' کی رسم کے بارے میں قاری کو اشتیاق رہتا ہے کہ یہی ناول کا سرنامہ ہے مگر اس رسم کی ادائیگی کی تفصیل بہت موثر نہیں ہو سکی۔ اسے جذباتی اور دردانگیز واقعہ ہونا چاہئے تھا جو قاری کے دل کو مٹھیوں میں جکڑ لے۔''

جہاں تک 'اندھیرا پگ' میں پلاٹ اور قصہ پن میں جھول ہونے کا سوال ہے تو یہ بات شہاب کو سمجھ جانی چاہئے تھی کہ یہ ناول گھٹے ہوئے پلاٹ کا ناول نہیں۔آج تفصیل سے گریز اور منظری اسلوب کا انداز بدل گیا ہے۔کسی بھی کردار اور ماحول کے سرے کو قاری کے ہاتھ میں دے دینے کا انداز ناولوں میں ایک رجحان بن گیا ہے۔ پکا پکایا کھانا جب آپ قاری کے سامنے پروس دیں گے تو قاری کیا کرے گا؟ کچھ قاری کے لیے نہ چھوڑنا دراصل 'کفارہ' جیسا ناول لکھنا ہوگا۔اسکی مثال راج کمار سے روپی کہیں ملی ہی نہیں تو وہ کیسے اس پر بھروسہ کر کے وہ

خط اسے دھونی کے ہاتھ سے بھجوایا جس میں اس کے باپ کی کرتوت لکھی گئی تھی جس میں لکھا تھا کہ یہ خط جلد سے جلد پولس تک پہنچا دے۔شہاب صاحب کو اس قصے میں جھول یہیں پر نظر آتا ہے۔دوبارہ ناول پڑھیے تو پتہ چلتا ہے کہ جب بارش میں کھیلتے اور جھولا جھولتے ہوئے جب روپی کو بھیلو رانا دیکھتا ہے اور اپنے دوست راج کمار سے جس لہجے میں اسے کنکری مارنے کی بات کرتا ہے اس سے صاف دونوں سے کہیں ملاقات ہے اس امر کا پتہ چلتا ہے البتہ بات کرنے کے مواقع نہ ملے ہوں کہ گاؤں کا سخت ماحول ہے اور پھر راج کمار ایک 'نیچ' ذات کا اور روپی برہمن ہے۔اب ذرا وہ عبارت ملاحظہ فرمائیں جہاں پہلی بار راج کمار اور اس کے دوست کا داخلہ ناول میں ہوتا ہے۔

''اے بدھو! یہاں خالی پانی میں کنکریاں مار رہا ہے لہریں اٹھانا ہی ہیں تو میرے ساتھ چل۔اپنی روپی کو کنکریاں مارتا کہ اس میں لہریں ......راج کمار نے بھیلو رانا کو سخت نظروں سے دیکھا تو اس کے لہجے میں کچھ شائستگی آئی ...... اپنی سہیلی رمیا کے ساتھ ہے، جھولا جھول رہی ہے۔اکیلی آئی ہے موقع موقع کیا کرتا ہے۔لے بھاگ اچھا پوری کر۔''

کیا اب یہ بتانے کی ضرورت ہے (اگر آپ نے (ص: ۲۴ سے ۳۴ تک کے صفحات غور سے پڑھے ہیں) کہ راج کمار اور روپی ایک دوسرے کو نہیں جانتے۔اسکی سہیلی رمیا اسی طبقے کی لڑکی ہے۔سمجھا جاسکتا ہے کہ روپی تک باتیں رمیا کے ذریعے پہنچائی گئی ہوں اور روپی کو راجکمار کے عندیے کے بارے میں معلوم ہو۔کیا اب قاری اندازہ نہیں لگا سکتا کہ دونوں میں ایک خاموش پریم ہے جسے روپی بھانپ چکی ہے۔اس لیے یہ اعتراض برائے اعتراض ہے۔دونوں کی شادی ممکن نہ تھی، میل ممکن نہ تھا۔گاؤں کے ماحول میں دونوں کے پریم، رسم و رواج کا سخت پردہ پڑا ہے جس کی عکاسی مصنفہ نے اسی رعایت سے کی ہے۔رہا سوال شہاب کے اعتراض کا کہ کہیں کہیں ایک جگہ مصنفہ نے متعارف لفظ کو اسم کیفیت میں بدل کر متعارفانہ کر دیا ہے جو شہاب کو سمجھ میں نہیں آتا۔یہ روزمرہ نہیں ہے، ٹھیک ہے لیکن ناول میں ضرورت کے تحت اس طرح کے تصرفات کیے جاسکتے ہیں۔لیکن ان کا اعتراض اس سلسلے میں Invalid بھی نہیں ہے۔ناول کی ساخت میل دار ہوتی ہے اور اس میں از روئے حالات ماحول اور از روئے تقاضائے کردار، زبان کا خاص اسلوب اور کئی طرح کے رجسٹر کی نقل ناول نگاروں کو کرنا پڑتی ہے تاکہ زندگی کا ہر رنگ ابھرے ایسے میں ہندی اسلوب اس ناول کے لیے ضروری رجسٹر تھا۔شہاب کو ناول میں موجود رجسٹر ہندی اسلوب پر اعتراض کرتے وقت اس بات پر پھر سے غور کرنا چاہئے۔

ثروت نے راجستھانی لوک گیتوں، اساطیر اور رسوم کے مروجہ بیانیے کی Mixing سے وہاں کی زندگی

یعنی مقامیت کو ابھارا ہے اور اس مقام پر عورت کے شدائد کا بیان خلق کیا ہے جس میں Native Resource Oriented Language کا فن کارانہ استعمال بطور مکالمہ اور گیت کے ہوا ہے۔ روپ کنور عرف روپی پانی میں اچھل کود کیے جا رہی ہے۔ گاؤں کے حلوائی جو اس کے دادا کا ہم عمر ہے اسے یوں بلاتا ہے۔ راجستھانی بولی آپ بھی سنیے:

''بٹو !اپڑیاں بھائی رے ساتھے کٹھے جاری ہے۔ اوئی اوئی جلیبیاں لیتی جاتا'' لا اب آ گیا۔ وہاں برگد ہے جھولے لگے ہیں اور جھولے پر یہ گیت گاتی گوریاں:

بنارے   باگاں   میں جھولا   ڈالیا

مہارے   ہوڑے   سوں   کوئل   بولے

سارا کھیل بھنورسا......

گویا Land Scape کا جیتا جاگتا مظہر خلق کرنے کے لیے جس نوع کے رجسٹر کی ضرورت بیانیے کے لیے ضروری ہے، اس کا فن کارانہ شعور ثروت کے بیانیے میں نظر آتا ہے۔

یہ ناول پہلی بار اردو میں راجستھانی تہذیبی زندگی، سماجی ہمواریوں اور دقیانوسی اصولوں کی بھینٹ چڑھتے، دبے کچلے مرد اور عورت کی المناک زندگی کے خلاف احتجاج کا فن کارانہ رویہ قاری کے ذہن میں پیدا کرتا ہے۔ ثروت خان بحیثیت ناقدہ اپنے مقالوں میں اک برافروختہ عورت کے روپ میں ابھرتی ہیں لیکن اپنے افسانوں اور بالخصوص اس زیر بحث ناول میں انہوں نے انسانیت نواز تانیثیت کے اصولوں کو پیش نظر رکھا ہے۔ ان کی نگاہ میں صرف عورت ہی اس سماج کا کھلونا نہیں بلکہ مردوں کو بھی یہ سماج ایک ناکام نامراد جیو کے روپ میں پیش کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتا۔ روپ پشور اس امر کی زندہ مثال ہے جو اس ناول کا ایک نا قابل فراموش سانحہ ہے۔ اس ناول میں روپی یعنی ایک عورت کی موت نے جنس کے فطری اصولوں پر گہری چوٹ پہنچائی ہے اور ناول میں احتجاج کی لے آہستہ آہستہ تیز ہوتی چلی گئی ہے اور آخر کار یہ ناول عورت کا مرد اس معاشرے کے خلاف جاری سنگھرش کی علامت بن جاتا ہے۔ اندھیرے میں چلنے والے روپی کے پاؤں پر نئے زمانے کی روشنی پڑنے لگتی ہے اور روپی آخر کار ایک نئے سفر پر گامزن نظر آتی ہے۔

رہا سوال اندھیرا پگ کی رسم کی تفصیل بیان کرنے کا کہ سسرال میں ذرا اس رسم کی تفصیل سے قاری آگاہ نہیں ہوتا تو بھئی یہ رسم بعینہ اس شکل میں کیا میکے میں اس نے نہیں نبھائی؟ مصنفہ نے ہمیں تکرار سے بچایا ہے

اور پھر رسم اماوس کی ایک رات میں ہوتی ہے اس کی کون سی اور کیسی تفصیل اس ناول میں پیش کرنی چاہئے تھی۔ چونکہ ودھوا سسرال اور میکے دونوں جگہ یکساں حال ہی میں رہتی ہے اس لیے دونوں جگہ اس منظر نامے کی جزئیات ناول میں تکرار کا عیب پیدا کرسکتا تھا۔ رہا سوال رسم 'اندھیرا پگ' کا تو اس رسم سے ہم سب واقف ہیں اس کے لیے سماجی سائنس بھی ہم پڑھ سکتے ہیں یا رسوم سے متعلق کوئی کتاب پڑھ سکتے ہیں اس کے لیے ہم ناول نگار پر کیوں تکیہ کریں۔ یہاں ہمیں توسیمن دی بوانے اپنی کتاب میں سماج کے جس Bad Faith کا ذکر کیا ہے اس کی یاددلائی گئی ہے۔ ناول نگار نے تو 'اندھیرا پگ' کو ایک استعارہ بنایا ہے اور ہمیں پورے ناول کی روشنی میں اس استعارے کی معنوی جہت پر غور کرنا چاہئے۔ روشنی جہاں اندھیرا زیادہ ہوتا ہے وہیں سے پھوٹتی ہے۔ ظلم کے خلاف ظالم کے گھر سے ہی آواز اٹھتی ہے کیونکہ ظالم صرف دوسروں پر ہی ظلم نہیں کرتا بلکہ اس کی فطرت ہی ایسی ہے کہ اس سے اپنے بھی محفوظ نہیں رہ پاتے۔ ان سبکے باوجود یہ ضرور ہے کہ کہیں کہیں زبان اور Episode میں تال میل اور بعض مناظر کے بیان میں غیر ضروری طول اور کہیں تشنگی ضرور ہے لیکن ناول کے کلی ٹون پر بہت بڑا اعتراض نہیں کیا جاسکتا۔

اس جائزے کے بعد زیر مطالعہ ناولوں میں مذکورہ بالا لغزشوں کے باوجود یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ناول کا مستقبل روشن ہے۔ مطالعہ کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ اردو میں ۸۰ کے بعد کے خواتین ناول نگاروں نے زیادہ تر عصمت چغتائی کی روایت کو اپنانے اور اس کی توسیع کرنے کی سعی کی ہے یعنی Sexual Politics سے عورتوں کی زندگی میں جو المناکیاں پیدا ہوتی ہیں ان مسائل پر زیادہ توجہ دی گئی ہے۔ اس میں کوئی دورائے نہیں کہ 'اندھیرا پگ' کی مصنفہ ثروت خان نے ناول نگاری کی صنف سے حد درجہ آگاہ ہونے کا ثبوت دیا ہے اور امید ہے کہ وہ عصمت چغتائی کی روایت سے بھی آگے کی کڑی ثابت ہونگی۔

ترنم ریاض نے قرۃ العین حیدر والی روش اختیار کر رکھی ہے لیکن عصمت چغتائی اور جیلانی بانو وہ ناول نگار ہیں جنھوں نے شدت سے ہر خاتون ناول نگار کو متاثر کیا ہے۔ فی زمانہ ٹیڑھی لکیر اور ایوان غزل کے مقابلے اردو خواتین ناول نگاروں کا کوئی متن ایسا نظر نہیں آتا جس میں عورت کی ذات، وجود، صنف اور اس کی سیاست اس کے انفراد اس کے مستقبل پر اس گہرائی کے ساتھ نظر ڈالی گئی جس نوع کے ناولاتی رمزیے کی مثالیں ایوان غزل میں نظر آتی ہیں۔ لیکن اردو ناول کا قاری اندھیرا پگ میں اپنے پیش روؤں کی بازگشت محسوس کرنے میں کوئی دشواری محسوس نہیں کرے گا۔

ثروت خان۔۔۔ایک ''بنداس'' ادبی شخصیت

عذرا نقوی

بہار اردو اکادمی پٹنہ میں مشتاق احمد نوری صاحب نے سن دو ہزار سولہ میں وومن اردو کنونشن کا اہتمام کیا تھا۔ بہار کا میرا پہلا سفر تھا تقریباً پینتیس برس بیرونی ممالک میں گزار کر وطن واپس آئی تھی، یہاں کی ادبی سرگرمیاں ابھی میرے لئے اجنبی تھیں۔ پٹنہ کے ہوٹل میں جہاں ہم لوگوں کے ٹھہرنے کا انتظام تھا وہاں ریسپشن میں مجھے بتایا گیا کہ فلانے کمرے میں مجھے ثروت خان کیساتھ رہنا ہے۔ سہ پہر کا وقت تھا میں نے کمرے کی گھنٹی بجائی تو نیند میں دُھت ایک دراز قد، صحت مند قسم کی خاتون نے دروازہ کھولا، کمرہ میں اندھیرا تھا میں کچھ سہم سی گئی۔ حالانکہ بے چاری نے اخلاق سے میرا استقبال کرنے کی کوشش بھی کی تھی مگر بُرا ہو نیند کا، وہ پھر سو گئیں۔ میں نے کمرے کی بتی نہیں جلائی تھوڑی دیر آرام کرنے کی ٹھانی۔ جب نیند کی دیوی کے قبضے سے ثروت آزاد ہوئیں، منہ ہاتھ دھو کر تازہ دم ہو گئیں، تو اپنے پیارے سے ٹونک کے لہجے میں کہا۔ ''میں شرمندہ ہو رہی تھی باجی کہ آپ کیا سوچ رہی ہوں گی کہ یہ کیسی عورت ہے۔ مگر میں اودے پور سے دہلی اور دہلی سے پٹنہ کے سفر میں سو ہی نہیں سکی تھی۔ بالکل بے ہوش ہو کر سوئی تھی''۔

تین دن ہم ساتھ رہے، ثروت کے بے تکلف انداز، دلچسپ باتوں اور زندہ دلی نے مجھے اجنبیت کا احساس نہیں ہونے دیا۔ مجھے یاد آ گیا کہ ایک بار کانپور میں غضنفر صاحب نے افسانہ کے بارے میں ایک سیمنار کیا تھا میں سعودی عرب سے ہندوستان آئی ہوئی تھی وہاں میری پہلی بار نگار عظیم اور ثروت سے مختصر کی ملاقات رہی تھی۔ میں نے شکر ادا کیا کہ کوئی سنجیدہ، بہت لئے دئے رہنے والی خاتون میری روم میٹ نہیں تھی ورنہ محتاط طریقے سے نپی تلی گفتگو تین دن تک کرتے رہنا میرے بھی بس کی بات نہیں تھی۔ اس سیمنار میں شامل ساری خواتین سے ایسا رشتہ استوار ہو گیا ہے کہ جس کا ٹوٹنا اب ناممکن ہے۔

سیمنار میں ثروت نے افسانے کے سیشن میں اپنا بہت اچھا اور مشہور افسانہ ''لوک عدالت'' اپنے

مخصوص انداز میں پڑھا۔ہمیں مغالطہ تھا کہ ہم ہی ڈرامائی انداز سے افسانہ پڑھتے ہیں۔ثروت نے مشاعرے میں بھی خود ہی شامل ہوکر اپنی شاعری بھی سنا ڈالی، ترنم سے بھی پیش کرنے کی کوشش کی، مجھے بہت باغ و بہار خاتون لگیں ثروت خان۔ایک غیر ادبی سا لفظ''بنداس'' ہے جو ثروت کی شخصیت پر مجھے یاد آتا ہے۔ جو جی میں آتا ہے لکھتی ہیں، کہتی ہیں اور اعتماد سے کر گذرتی ہیں۔انہوں نے مجھے اپنی ایک کتاب پٹنہ میں ہی عنایت کی''شورش فکر'' جس میں دیگر مضامین کے ساتھ ایک سوانحی قسم کا دلچسپ مضمون''ثروت کی کہانی، میری زبانی'' بھی شامل تھا جو میں نے وہیں پڑھ ڈالا۔ میں جو کچھ ثروت سے پٹنہ کی پہلی سہ روزہ ملاقات اور''ہم رومی'' میں ان کی زندگی اور ادبی سفر کے بارے میں نہیں جان سکی تھی اس کی کمی اس مضمون نے پوری کر دی۔ایک معزز ادبی گھرانے سے تعلق ہونے کے باوجود ثروت نے اپنا ادبی سفر کافی دیر سے شروع کیا اور جب شروع کر دیا تو کہیں رکنے کا سوال ہی نہیں ہے۔ انہوں نے مجھے اپنا ناول''اندھیرا پگ'' دیا جو میں نے گھر واپس جا کر اولین فرصت میں پڑھ ڈالا کیونکہ یہ بہت ریڈیبل ہے اور اس میں انہوں نے راجستھانی تہذیب میں عورتوں کی سماجی مقام کو بخوبی پیش کیا ہے۔'شورش فکر' میں ان کے تنقیدی مضامین پڑھے اور ان سے باتوں کے دوران مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ تنقید کے میدان میں بہت سر گرم رہنے والی ہیں۔ پٹنہ میں وہ اکثر اپنے مخصوص انداز میں کہتی تھیں''اپن کو تنقید کے میدان میں بھی کام کرنا چاہئے۔خواتین تنقید نگار بہت کم ہیں اردو ادب میں''

دو ہزار سترہ میں بھی ایک اور نسائی ادب کا سیمنار پٹنہ میں نوری صاحب نے منعقد کیا ثروت سے پھر ملاقات ہوئی۔خوش مزاج خوش پوشاک، باتونی، جوشیلی، جذباتی''بنداس'' ثروت اب میرے لئے اجنبی نہیں تھی۔ اسی سیمنار میں ایک سیشن کی صدارت کرتے ہوئے میں نے خواتین قلم کاروں کے بہناپے یعنی Feternity کی بات کہی، جس کو بعد میں شہناز نبی نے بھی اپنی تقریر میں پر زور انداز میں پیش کیا اور تسنیم کوثر نے عملی جامہ پہنایا، جس کے نتیجے میں ہماری نسائی ادبی تنظیم 'بنات' نے دہلی میں جنم لیا۔سوشل میڈیا پر لوگ لاکھ بحث کرتے رہیں کہ نسائی ادب کو الگ سے کسی زمرے میں رکھیں یا نہ رکھیں لیکن ہماری بین الاقوامی ادبی نسائی تنظیم 'بنات' قائم ہو گئی ہے اور انشااللہ اکتیس اکتوبر ۲۰۱۸ء کو ایک سال کی ہو جائے گی۔ثروت اس کی سرگرم ممبر ہی نہیں خازن بھی ہیں افتتاحی پروگرام میں انہوں نے بہت جوش و خروش سے مستقبل کے پروگراموں کے لئے مشورے دئے تھے لیکن پھر اندازہ ہوا کہ بہت صبر آزما کام ہے، دھیرے دھیرے قدم جمیں گے۔اب ہماری یہ ثروت خان ہی اوراودے پور میں یوم تاسیس کا زبردست پروگرام ترتیب دے رہی ہیں۔ یقیناً بہت زبردست پروگرام ہوگا۔

ثروت خان ماشااللہ نانی اور دادی بن چکی ہیں لیکن بچوں کی سی ایک شوخی اور کھلنڈرا پن ان کے مزاج میں ہے، خوش اور پر جوش رہتی ہیں اور دوسروں کو بھی خوش رکھنے کی تمام تر کوشش کرتی ہیں۔ حال ہی میں 'بنات' کی کشمیر شاخ نے دو روز جشن نسائی ادب کا اہتمام کیا تھا۔ ثروت کشمیر کی وادی میں اور بھی مست ہوگئیں تھیں۔ کشمیری لباس میں تصاویر یں اتروائیں، شکارے میں بیٹھ کر گانے گائے اور مقالات کے سیشن میں ایک بہت ہی زبردست مقالہ بعنوان ''اکیسویں صدی کا اردو نسائی فکشن اور اس کے امتیازات'' پیش کیا اور جس زوردار انداز سے پڑھا اس کے بارے میں کسی نے صحیح کمنٹ کیا کہ ثروت خان نے مقالہ پڑھا نہیں ''منوایا'' تھا۔

میں نے کہا نا کہ یہ بنداس خاتون جب ٹھان لے تو کر گذرتی ہے۔ ابھی حال ہی میں ان کی تنقید کی کتاب شائع ہوئی، کتاب کا نام بھی بہت اعتماد کے ساتھ بھاری بھرکم سا رکھا ''نقدِ ثروت''۔ اس کا اجراء غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی کے زیر اہتمام ''ایوانِ غالب'' میں ہوا۔ اہم بات یہ ہے کہ اس کتاب کا انتساب انہوں نے ''بنات'' کے نام کیا۔ یہ وعدہ انہوں نے ''بنات'' کی افتتاحی تقریب پر کیا تھا اور پھر وفا بھی کیا۔ اس اجراء کی تقریب میں بنات کی صدر نگار عظیم بھی اسٹیج پر موجود تھیں۔ مقتدر پروفیسران موجود تھے جن میں سے کچھ نے پڑھ کر کچھ نے بغیر پڑھے کتاب پر اور ثروت کے فن پر گفتگو کی۔ کتاب مجھے تاخیر سے ملی، پھر بھی میں نے کچھ مضامین پڑھ کر ایک منظوم تبصرہ کرنے کی کوشش کی۔ وہ اگر بنداس ہیں تو ہم بھی کم ''بنداس بناتی'' نہیں۔ بتاتی چلوں کہ بنات کے ممبران ایک دوسرے کی بناتی بہنیں کہتی ہیں۔ میں نے مثنوی کے انداز میں یہ تبصرہ لکھا ہے۔

ثروت نامہ

نسائی ادب کا یہ جاہ ہو جمال۔ کہ روشن ہے ایوان غالب کا ہال

ذرا شہ نشیں کی تو دیکھو بہار۔ ہیں مہمان سارے بہت ذی وقار

ہے ''یہ نقدِ ثروت'' کی محفل کی رات ۔ ہے موجود ساری کی ساری ''بنات''

ہے اس واسطے بھی اہم یہ کتاب ۔ بنامِ ''بنات'' اس کے ہے انتساب

تھا ثروت کو مدت سے یہ ہی ملال۔ خواتین نقاد ہیں خال خال

انہیں فکر یہ ہی ستاتی رہی۔ نئے شہر امکاں دکھاتی رہی

اس فکر کا دیکھیے یہ کمال۔ لکھی ''شورش فکر'' نامی کتاب

ہو اشوق تنقیدیوں ہم سفر۔ کے جیسے ملے ہوں نئے بال و پر

اسی شوق کی کار فرمائی ہے۔ کہ ان کی نئی یہ کتاب آئی ہے
بہ ظاہر طبیعت میں ہے اضطراب۔ مگر دیدہ ریزی سے لکھی کتاب
کہیں پر نہ بقراطیت کا گماں۔ بہت ہی رواں ان کا طرز بیاں
شگفتہ بیانی میں ممتاز ہیں۔ کہیں شاعرانہ سے انداز ہیں
نمایاں سماجی سروکار ہے۔ کہیں ناصحانہ سی گفتار ہے
مضامیں کا مجموعہ پر بہار۔ نہیں ہے کہیں بھی قلم کو قرار
کہیں شاعری پر کئے تجزئے۔ کہیں فن افسانہ پر تبصرے
کہیں تانیثی تنقید پر تبصرہ۔ نسائی ادب کا کہیں تذکرہ
کہیں فن خطاطی پر گفتگو۔ کہیں اپنے اجداد کے رو برو
کبھی مرکز فکر ماحولیات ۔ کہیں آغا جانی کی ہوتی ہے بات
غضنفر کی موجود ہے مثنوی۔ کسی شاعرہ کونہیں لفٹ دی
کہیں تذکرہ سید احمد کا ہے۔ کہیں خسرو کی ٹونک آمد کا ہے
کیا معتبر باب تحقیق کو۔ بہم ہیں حوالے بھی تصدیق کو
کروں کس طرح بات اپنی تمام۔ مگر پھر بھی کرنا ہے اب اختتام
دعا ہے سفر یوں ہی جاری رہے۔ ادب کی یونہی آبیاری رہے

قلم کار حضرات سے گذارش ہے کہ اِن پیج (InPage) میں
کمپوز شدہ اپنی تخلیقات پروف ریڈنگ کے بعد ہی ارسال کریں۔
(ادارہ)

ثروت خان کا ناول ''اندھیرا پگ'' ایک مطالعہ

ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی

ہیگل نے ناول کو ''نثر کا رزمیہ'' یا مہا کاویہ کہا تھا۔ شاید اس لئے کہ انسانی زندگی جس اتھل پتھل اور شکست فرد کے خارجی عوامل وعناصر کے ساتھ داخلی تضاد و تصادم اور اس کے محرکات کو بھی اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ اسی طرح اردو کے معتبر ناقد پروفیسر آل احمد سرور نے لکھا ہے کہ ''کسی ملک کے رہنے والوں کے تخلیق کی پرواز کا انداز وہاں کی شاعری میں ہوتا ہے مگر اس کی تہذیب کی روح اس کے ناولوں میں جلوہ گر ہوتی ہے۔'' یعنی زندگی، سماج اور نظام معاشرت کے ہر پہلو کی بہ حیثیت مجموعی بہترین عکاسی کرنے کی جیسی اور جتنی گنجائش ناول میں ہے وہ کسی اور صنف ادب میں میسر نہیں آسکتی۔ اسی لئے ادب میں انسان اور سماج کے مابین رشتوں اور بدلتی ہوئی قدروں کی تحقیق وتلاش میں ماہرین سب سے پہلے ناول کی طرف مراجعت کرتے ہیں۔ اردو ناولوں نے بھی اپنا ڈیڑھ صدی کا جو طویل سفر طے کیا ہے اس میں ہر منزل پر سماجی، معاشی اور سیاسی وتہذیبی مسائل کی تصویر کشی کو اس نے بنیادی رجحان کی حیثیت سے جگہ دی ہے۔ بالخصوص آزادی کے بعد اردو ناولوں کے طویل سلسلے اور موضوعاتی تنوع کو دیکھا جائے تو ان میں موضوع، مواد اور اسلوب کی رنگارنگی کے ساتھ ساتھ، برصغیر کے مختلف علاقوں کی تہذیبوں، قدروں اور مسئلوں کی تصویریں بہ آسانی دیکھی جاسکتی ہیں۔ کہیں ہندو مسلم مشترکہ تہذیب اور جاگیر دارانہ زوال کا نوحہ ملتا ہے تو کہیں بہار، پنجاب کے مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے۔ کسی نے حیدرآباد کے سقوط، جاگیردارانہ ماحول کی عکاسی کی ہے تو کسی نے بمبئی، دلی اور کراچی جیسے بڑے شہروں کی مشینی زندگی پر کہانی کی عمارت کھڑی کی ہے۔ ''میرے بھی صنم خانے، بستی، دوگز زمین، شب گزیدہ، راجہ گدھ، پھول جیسے لوگ، مٹی کے حرم، شہر نگاراں، فائر ایریا، فرات، تین بتی کے راما، مکان، دویہ بانی'' اور ''شہر میں سمندر'' جیسے ناولوں میں تہذیبوں اور قدروں کا تنوع اور مختلف علاقوں کی زندگی اور مسائل کی دھڑکنوں کو واضح طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔ ان ناولوں کا اپنے علاقوں کی تہذیب سے گہرا رشتہ ہے اور ان میں ہر ناول ایک خاص نظام فکر اور ایک خاص طرز معاشرت کی

نمائندگی کرتا ہے۔ گویا ایک ذہنی تاریخ ان ناولوں میں محفوظ ہوگئی ہے جس میں ہم صدیوں سے جوجھتے جدو جہد کرتے انسانوں کی تصویریں دیکھ سکتے ہیں۔

ثروت خان کا پہلا مگر اہم ناول ''اندھیرا پگ'' بھی اسی سلسلے اور اسی فکر کی ایک مضبوط کڑی کی شکل میں سامنے آیا ہے۔ اس کا موضوع بیوہ عورت کی زندگی ہے جو ظاہر ہے نیا نہیں ہے اور نہ پہلی مرتبہ کسی ناول میں برتا گیا ہے مگر اسے جس خاص راجستھانی پس منظر میں برتا گیا ہے وہ پس منظر اسے اہم بنا دیتا ہے۔ جو حقائق یہاں پیش کیے گئے ہیں وہ حقائق اسے اہم بناتے ہیں اور ہماری نظروں سے اوجھل جس تہذیب، کلچر اور نظام کو نہایت کھلے بند ھے انداز میں دکھایا گیا ہے وہ نظام اور کلچر اس ناول کو معتبر اور منفرد بناتا ہے۔

ناول ''اندھیرا پگ'' صرف ۱۵۵ صفحات پر مشتمل ہے اور اسے ۱۳ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اوسط کے اعتبار سے محض ۱۰ یا ۱۱ صفحات میں اس ناول کا Episode بدل جاتا ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ مصنفہ ہمیں بہت ساری باتیں جلدی جلدی سنا دینا چاہتی ہیں۔ آج جب ضخامت وطوالت کے اعتبار سے افسانے کو ناول اور ناول کو داستان بنانے کا فیشن چل پڑا ہے، ثروت خان نے اس فیشن کی طرف بالکل توجہ نہ دے کر اپنی فنکارانہ ایمانداری کا ثبوت پیش کیا ہے۔ وہ چاہتیں تو طویل مکالموں، ذیلی واقعات، لڑائی جھگڑوں اور گاؤں کی سیاست وغیرہ سے اسے مزید ضخیم کر سکتی تھیں مگر انہوں نے اس موضوع اور مرکزی کردار پر توجہ مرکوز رکھنا زیادہ اہم سمجھا ہے اور یہی اختصاص اس ناول کی مطالعیت کو مہمیز کرتا ہے۔

ناول کا قصہ راجستھان کے ایک گاؤں ''دیش نوک'' کے حلقے میں بنا گیا ہے لیکن لوکیشنز شہر اور دوسرے قصبوں سے بھی اخذ کیے گئے ہیں۔ ''دیش نوک'' ایک ایسا گاؤں ہے جہاں سیاحوں کی آمد کے باوجود خوش حالی اور ترقی کا نام ونشان نہیں ہے۔ جہالت ایسی ہے کہ یہاں میٹرک پاس لڑکوں کا ملنا محال ہے، لڑکیوں کی تعلیم کا تو سوال ہی نہیں۔ ہاں پروہتوں نے اپنی وراثتی علم یعنی تنتر منتر، کریا کرم کانڈ کو فروغ دے رکھا ہے جو نسل درنسل چلا آرہا ہے۔ گھر کے مرد جہاں وید پران کے پنڈت ہیں وہیں عورتیں ان پڑھ، حویلی کی اونچی دیواروں میں قید، جہالت کی لعنت سے لپٹی ہوئی نسائیت کے پاس مرد کی چادر بننے کے سوا دوسرا کوئی چارہ نہیں۔ نچلا طبقہ محنت مزدوری کرتا ہے اور پنڈت ان کا استحصال۔ گاؤں کی ترقی کا یہ حال ہے کہ پرائمری اسکول برائے نام، آنگن باڑی اور ڈسپنسری معشوق کی موہوم کمر۔ لوگ جادو ٹونا اور جھار پھونک پر زیادہ بھروسہ کرتے ہیں۔ جس کا نتیجہ بھیرو جیسی عورتوں اور مریضوں کی موت ہے۔ راجستھان کا علاقہ چونکہ ہندوستانی کی راجدھانی دہلی کے پہلو میں ہے

اس لئے عورت کی بپتا پڑھتے ہوئے حیرت بھی ہوتی ہے کہ جہاں ایک طرف عورت اکیسویں صدی میں جینز جیکٹ میں ملبوس آسمانوں کی بلندیوں کا سفر کر رہی ہے وہیں دیش نوک کی عورتوں کو اپنی زندگی اپنی مرضی سے جینے کا بھی حق حاصل نہیں۔ یہ عورتیں اپنی زندگی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتیں کیوں کہ سماج نے ایسی آئیڈیولوجی اور نظم مرتب کر رکھا ہے جو مذہبی اور سماجی اصولوں کے نام پر اسے غلاموں سے بدتر زندگی جینے پر مجبور کرتا ہے۔

اسی دیش نوک میں پنڈتوں کی حویلی اس قصے کو جنم دیتی ہے جو اس ناول میں بنا گیا ہے۔ کہانی کا مرکزی کردار ''روپی'' پنڈت رتن سنگھ کی بیٹی ہے، ذہین و فطین، تعلیم کے ساتھ بہت ساری خوبیوں کی مالک۔ اس کی نہایت شائستہ، سلجھی ہوئی اعلیٰ ذہن کی مالک پھوپھی راج کنورا سے اعلیٰ تعلیم کے لئے شہر لے جانا چاہتی ہے۔ مگر دیش نوک کی لڑکیوں پر رسم ورواج کا پہرہ ہے۔ وہاں لڑکی کی اعلیٰ تعلیم کے بارے میں سوچا بھی نہیں جاسکتا۔

چنانچہ تمام احتجاجوں کے باوجود روپی اور راج کنور کے سارے خواب اور تمنائیں زندگی کے حقیقی سانچے اور اس فرسودہ نظام کے سفاک شکنجوں میں قید کردیئے جاتے ہیں۔ سپنوں کا اندھیرے میں روشنی کی کرن کی طرح ابھرنا اور خوابوں کا لہولہان ہوکر پسپا ہوجانا اس ناول کے پہلے حصہ کا دائرہ کار ہے۔ اس حصہ میں جب روپی کی تمناؤں کے نرم و نازک پر کتر دیئے جاتے ہیں اور رواجوں کی بھینٹ چڑھ کر صرف سترہ سال کی عمر میں وہ سسرال روانہ کردی جاتی ہے، قصہ جذباتی اور ذہنی کشمکش کی بھٹی میں کھولتا رہتا ہے۔ آسمان میں اڑنے کی چاہت اور پاتال میں دھنسنے کی مجبوری روپی کے ساتھ ساتھ قاری کو کرب والم میں مبتلا کرتی ہے مگر وہ ناول نگار کے اشارے پر جینے مرنے کے لئے مجبور ہے۔

یہ کرم والم اس وقت منتہا تک پہنچ جاتا ہے جب شادی کے چند مہینوں کے بعد روپی ''بیوہ'' ہو جاتی ہے۔ یہاں سے ناول کا اصل موضوع شروع ہوتا ہے اور قاری کو رسموں، رواجوں اور فرسودہ بندشوں میں جکڑے اس نظام سے متعارف کراتا ہے جب قدرت کے ایک سفاک فیصلے کو لوگ عورت کی نحوست سے تعبیر کرتے ہیں اور نازوں کی پلی روپی شاندار حویلی کے تنگ، تاریک، سیلن زدہ، بدبودار، چاروں طرف سے بند کوٹھری میں بدرنگ ساڑی میں تحتِ انسانی سطح پر زندگی گزارنے پر مجبور کردی جاتی ہے تا کہ اُس کی خواہشات زندہ نہ ہونے پائیں۔ پھوپھی، ماں، باپ، بھائی کوئی اسے نجات دلا دینے کی طاقت نہیں رکھتا۔ پھوپھی تو اسی وقت بے بس ہو جاتی ہے جب وہ اپنی بھتیجی کو لانے سسرال جاتی ہے جہاں روپی ایک کال کوٹھری میں محبوس ہے اور پانی میں سوکھی روٹی ڈبو ڈبو کر کھاتی، ڈیڑھ روپے کی ٹائر کی چپل پہنتی، سر جھاڑ، منہ پھاڑ حالت میں سسک سسک کر جی رہی ہے۔ پھوپھی

لاکھ کوشش کے باوجود اسے وہاں سے نکال کر نہیں لا پاتی کیونکہ بھتیجی کو اس کوٹھری سے نکال کر لانے کے لئے اماوس کی رات کا انتظار کرنا ہوتا ہے۔ ہاں اماوس کی کالی رات میں تاکہ اس کا سایہ کسی جاندار پر نہ پڑ سکے۔ اس سفر کو ''اندھیرا یگ'' کا نام دیا گیا ہے جو اس ناول کا سرمایہ ہے۔

''اندھیرا یگ'' کی رسم ڈیڑھ ماہ کے بعد ادا ہوتی ہے اور روپی اپنے گھر واپس آجاتی ہے۔ مگر المیہ اس وقت حیرت انگیز رخ اختیار کر لیتا ہے جب اس کی دشا پر آٹھ آٹھ آنسو بہانے والا گھر بھی چند لمحوں کے بعد اسے ویسی ہی زندگی جینے پر مجبور کر دیتا ہے جیسی زندگی وہ اپنی سسرال میں جی رہی تھی۔ کیوں کہ نظام تو وہی ہے، رسم و رواج تو وہی ہیں، انہیں بدلنے کی طاقت کون رکھتا ہے۔ ''یہ ایک ایسا مضبوط گڑھ ہے جسے تسخیر کرنا اچھے اچھوں کے بس کا نہیں...... ہندوستانی کلچر و تہذیب کی دہائی دیتا یہ نظام کہ جس کو بدلنے کی سعی بھی کی جائے تو مخالفت کرنے والے کو گھر کا بچہ بچہ بھر کر ظلمتوں کے گھیرے میں قید کر دے گا''۔ اسی لئے تو نازوں کی پلی روپی کو جب گھر کی ملازمہ ''دھونی'' اس حالت میں دیکھتی ہے تو بے اختیار کہہ اٹھتی ہے۔......

''بھگوان کسی کو ودھوا نہ کرے۔ یوں روز مرنے سے تو اچھا ہے کہ ودھواستی ہو جائے تو ایک بار میں پاپ کٹے۔''

یہیں پر قاری کے ذہن میں یہ جھما کے ہوتے ہیں کہ راجستھان میں آخر عورتیں اتنی آسانی سے ستی کیوں ہو جاتی ہیں؟ انہیں زندگی سے موت کیوں بھلی لگنے لگتی ہے؟ یقیناً اس کی وجہ وہ نظام اور تہذیب ہے جو اسے موت سے بھی بدتر، غلیظ اور دردناک زندگی عطا کرتی ہے۔

کہانی یہیں ختم نہیں ہوتی۔ روپی کی حالت دیکھ کر اس کی پھوپھی ایک بار پھر گھر والوں سے لڑتی ہے اور اسے علاج کے بہانے شہر لا کر تعلیم و ترقی کی روشنی سے متعارف کراتی ہے۔ روپی ذہین تھی، جلد ہی میڈیکل ٹسٹ میں کامیاب ہو کر ڈاکٹر بننے کی راہ پر دوڑنے لگتی ہے۔ مگر اس کے گاؤں کا فرسودہ نظام یہاں بھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ گاؤں والوں کو خبر ملتی ہے تو پورا گاؤں اس کے خلاف اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور مجبور کر دیا جاتا ہے کہ اسے واپس گاؤں لایا جائے۔ جس گاؤں کی ترقی اور بھلائی کے لئے وہ پڑھ رہی تھی وہی گاؤں اسے پھر بند کوٹھری میں قید کر دیتا ہے۔ لیکن اب روپی کا ارادہ مضبوط ہو چکا تھا۔ اسکے احتجاج نے طاقت حاصل کر لی تھی، اس لئے جب اپنے باپ کے ظلم اور کالے کرتوتوں کا اسے علم ہوتا ہے تو نہ صرف یہ کہ اس کے خلاف بغاوت کرتی ہے بلکہ پولس بلا کر سب کو گرفتار کروا دیتی ہے۔ اسی وقت گاؤں کی پشتینی حویلی کی باؤلی سے کئی گم کردہ چہرے باہر آتے ہیں اور صدیوں

سے اس نظام کے ہتھے چڑھنے والے معصوموں سے متعارف کراتے ہیں۔ اور اس نظام کے پرخچے اڑانے کے بعد جب روپی اس روشن، شفاف اور چمکتے راستے پر چل پرتی ہے جو اسے اس کی منزل تک پہنچائے گا تو گھر کے لوگ بھی اسے روکنے کی ہمت نہیں کر پاتے۔ گویا مصنفہ نے اس تاریک اور فرسودہ نظام کی پشت پر روشنی کی اس کرن کو دیکھ لیا ہے۔ جو اندھیرے کے ہی بطن سے پیدا ہوتا ہے اور اندھیرے کو نگل کر سماج میں نئی روشنی پھیلاتا ہے۔

ناول کا قصہ مختصر ہے۔ اس کہانی پر ایک افسانہ بھی لکھا جا سکتا تھا۔ لیکن ناول کا اصل جوہر اس کی جزئیات نگاری، چھوٹے بڑے کردار اور دیش نوک کی زندگی، تہذیب اور نظام ہے۔ یہ کردار صرف دیش نوک یا اس کے آس پاس ہی مل سکتے ہیں۔ روپی کے علاوہ راج کنور، سبھدرا، ٹھاکر رتن سنگھ، راج کمار، رمیا، دادی اور رونی دھونی اس کے اہم کردار ہیں۔ مگر سب سے مضبوط کردار ''روپی'' یعنی روپ کنور کا ہے جو شروع سے ہی احتجاج، بغاوت اور ترقی یافتہ ذہن کی علامت کے طور پر سامنے آتی ہے۔ وہ عام لڑکیوں کی طرح سب کچھ قسمت کے نام پر قبول کرنے کو تیار نہیں اور نہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھنے پر یقین رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہر مرحلے پر اپنی کوشش بھر ظلم کے خلاف احتجاج ضرور کرتی ہے اور دلائل ایسے دیتی ہے کہ سوائے ڈانٹ ڈپٹ کے مخاطب کے پاس کوئی جواب نہیں ہوتا۔ وہ بڑی بے باکی سے اپنے باپ سے کہتی ہے:

''میں پوچھتی ہوں باپو، آخر کب تک ہم اس سسٹم کی بھینٹ چڑھتی رہیں گی۔ یہ تو کمیونسٹوں سے بھی بدتر ہے، ذہن، مشن، وژن سب کا ناش کرنے والا ...... میں ہاڑ مانس کا لوتھڑا نہیں بننا چاہتی، مجھے ادھیکار چاہئے۔ آپ نے شاستر پڑھے ہیں، کیا آپ نہیں جانتے، سماج نہیں جانتا کہ خود شاستروں کی رچنا استری نے کی ہے۔ پھر ہماری کرنی ماتا بھی تو استری ہی تھیں۔ باپو میں استری کی اسی کھوئی ہوئی استھتی کی تلاش میں ہوں۔ آپ لوگ کب تک ان جھوٹی مریاداؤں میں جکڑے رہیں گے۔''

روپی بیوہ ہونے کے بعد جب اپنی زندگی میں آئی تبدیلی کو دیکھتی ہے تو چکرا کر رہ جاتی ہے۔ اسے سمجھ میں نہیں آتا کہ اس میں اس کا کیا دوش ہے؟ وہ جانوروں کی طرح جینے پر کیوں مجبور کی جا رہی ہے؟ اس کے اپنے اس پر ظلم کیوں ڈھا رہے ہیں؟ اس کے ذہن میں طرح طرح کے سوال پیدا ہوتے ہیں اور جب جواب نہیں ملتا تو اپنی ماں سے پوچھتی ہے......

''ماں کیا جیون کیول بیاہ تک سیمت ہے؟''

''ماں کیا جیون کا کوئی اور ادیشیہ نہیں؟''

''ماں کیا استری اُپ بھوگ کی وستو ماتر ہے؟''

''ماں ہماری پرمپرا ابلیدان ہی کیوں مانگا کرتی ہے؟ ہماری سوتنتر تا کو گرہن کیوں لگایا جاتا ہے؟''

''ماں سماج کی پرمپرائیں اچھائیں دبانے کے لئے کیوں بنائی جاتی ہیں؟''

''ماں کیا تم نے سوچا ہے دبائی ہوئی اچھاؤں کے برے پرینام پوری منشیہ جاتی کو بھگتنے پڑتے ہیں۔''

انہیں سوالات پر ٹکا ہے ناول کا تانا بانا، اور ناول ان سوالوں کے درمیان سے ایک نئی کہانی، نئی منزل کا راستہ تلاش کرتا ہوا اپنے سفر پر چل پڑتا ہے۔ اس سفر میں روپی ایک مظلوم مگر مضبوط کردار کی شکل میں نظر آتی ہے۔ اردو ناول میں پیغام آفاقی کے ناول ''مکان'' کی ہیروئن ''نیرا'' کے بعد دوسرا نسوانی کردار ایسا نظر آیا ہے جو زندگی کی جدو جہد میں اپنے ایقان، صداقت، موت سے بے خوفی اور استقامت کے ذریعہ اپنی راہ خود بناتا ہے۔ نسوانی کردار کو اتنی مضبوطی اور استقلال کے رنگ میں رنگ کر کم پیش کیا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے نیرا اور روپی اردو ناول کے دو مضبوط اور روشن کردار کے روپ میں یاد کئے جائیں گے۔ احتجاج اور حالات سے لڑنے کی جرأت مندانہ کوشش ان کرداروں کو نمایاں اور اہم بنا دیتی ہے۔

ناول کا دوسرا اہم کردار روپ کنور کی پھوپھی راج کنور کا ہے۔ یہ شہر میں رہتی ہیں، اس لئے دنیا کی ترقی سے بخوبی واقف ہیں۔ ان کے شوہر اور بچے ان سے بہت پیار کرتے ہیں اور ان کے ہر فیصلے میں ساتھ دیتے ہیں۔ راج کنور اپنی بھتیجی سے بیٹی کی طرح پیار کرتی ہیں اور ان کے ہر فیصلے میں ساتھ دیتے ہیں۔ اور اس کے دکھوں سے اتنی پریشان رہتی ہیں کہ دل کو روگ لگا بیٹھتی ہیں۔ انہیں کی کوششوں سے روپی شہر آپاتی ہے۔ یہ روپی کے لئے گھر اور خاندان سے ہی نہیں گاؤں کی پنچایت سے بھی لڑ جاتی ہیں اور اپنے جیتے جی ان کے سامنے سر جھکانے کو تیار نہیں ہوتیں۔ یہ مثبت اور تعمیری انداز فکر کی حامل ایک آئیڈیل عورت کا روپ ہیں۔

ناول میں تیسرا اہم کردار روپی کی دادی کا ہے۔ یہ چونکہ اس فرسودہ نظام میں پل بڑھ کر بوڑھی ہوئی ہیں، اس لئے حویلی کی روایتوں اور گاؤں کے سرد و گرم سے واقف ہیں۔ یہ اپنی پوتی سے محبت کرتی ہیں، اس کی کامیابی سے خوش بھی ہوتی ہیں مگر چونکہ اُن کے ذہن میں زندگی بھر عورت کا روایتی تصور رہا ہے اس لئے پوتی کی آزادی حلق سے نیچے نہیں اتار پاتیں۔ انہیں ہضم نہیں ہوتا کہ کیا عورت بھی اتنی آزاد ہو سکتی ہے؟ کیا بیوہ بھی اتنی خوش اور مسرور ہو سکتی ہے؟ چنانچہ جب انہیں شہر سے روپی کی کامیابی اور خوشی کی خبر ملتی ہے تو بے اختیار ان کا شعور جھنجھوڑنے لگتا ہے......

''کیا ودھوائیں بھی اتنا سکھ بھوگ سکتی ہیں؟ کیا انہیں نیا سنسار جینے کا ادھیکار دیا جاسکتا ہے؟ نہیں، کداپی نہیں! ہمارے زمانے میں تو ......اور پھر پلنگ پر دراز ہو، آنکھیں بند کرلیتیں۔ کچھ دیر کروٹیں بدلتیں پھر ٹھنڈی پڑ جاتیں۔'' (ص:۸۷)

دادی کا کردار اس معنی میں علامتی بھی ہے کہ یہ اس نظام کی سختی، انسانوں کے دو غلے پن اور اہل خانہ کے فکر و عمل میں تضاد کی طرف اشارے کرتا ہے۔ مثلاً روپی جب سسرال میں مجبور و محبوس ہے تو گھر کے سبھی افراد اداس ہیں۔ یہاں تک کہ دادی بھی ریت رواج کے بندھنوں کو برا بھلا کہتی ہیں۔

''عجیب ریت ہے، کوئی میکے والا خیر خبر نہیں لے سکتا۔ ایک ایک دن نکالنا بھاری پڑ رہا ہے۔ نہ معلوم کیا بیتی ہوگی بچی پر اس ڈیڑھ ماہ میں......''

''ایک طرف تھالی رکھ کر اپنے پلو سے آنسوؤں کو پونچھا۔'' تھالی اٹھالو بہو۔ کھالیا۔ جوان پوتی رانڈ ہو جائے تو بھلا بوڑھی ہڈیوں کو سوستھ رکھنے کا کیا اُدیشہ ہے؟''

وہی روپی جب ''اندھیرا اگپ'' رسم کے بعد گھر لوٹتی ہے تو دادی اس کا اپنی ماں کے ساتھ ایک رات سونا بھی گوارا نہیں کرتیں کیوں کہ یہ صدیوں سے چلے آرہے رسم و رواج کے خلاف ہے۔ وہ روپی کو جھنجھوڑ کر اٹھا دیتی ہیں۔''اٹھ روپی، چل نکل یہاں سے اپنے ٹھکانے۔ تیری ماں تو پاگل ہوئی ہے۔'' اور پھر روپی کی ماں سے کہتی ہیں۔

''تم ہوتی کون ہو سماج کے نیم قاعدے توڑنے والی۔ مامتا ہم بھی رکھتے ہیں ...... پر یوں انرتھ نہیں کرتے، بیوہ کے ساتھ اتنی دیا ٹھیک نہیں ......'' اسی طرح روپی کو تھوڑا تیز چلتے ہوئے دیکھتی تو فوراً ٹوکتی ہیں......

''بھاگتی کیوں ہے روپی! بھاگنے سے رکت کی گتی بڑھ جاتی ہے۔ سانسیں اوپر نیچے ہونے لگتی ہیں۔ پھر اچھائیں جاگنے کا ڈر رہتا ہے۔ یہ کیا الہڑ کنواریوں کی طرح بھاگا کرتی ہے۔''

ناول میں کئی نسوانی کردار ہیں۔ مثلاً ماں سبھدرا، روپی کی چاچی، سہیلی رمّیا اور کھوسٹ بڑھیا۔ یہ کردار قصے کے ارتقا میں تو اہم ہیں ہی، اس معاشرے کے مختلف رخوں اور رواجوں سے آشنا کرانے میں بھی ان سے مدد لی گئی ہے۔

ناول میں مرد کی صورت میں کوئی توانا کردار نہیں ہے۔ ٹھاکر رتن سنگھ کا کردار نسبتاً زیادہ دیر تک سامنے رہتا ہے مگر رسموں رواجوں اور روایتی اصولوں سے اتنا بندھا ہوا ہے کہ روپی کی آزادی میں وہ کوئی مدد نہیں کرسکتا۔

اسی کی وجہ سے روپی کی جلدی شادی ہوتی ہے اور اسی کی وجہ سے روپی شہر سے واپس لوٹنے پر مجبور ہوتی ہے۔ رتن سنگھ کا کردار اس معاشرے میں دو غلے پن اور دوسرے اصولوں کی علامت بھی ہے جہاں مردوں اور عورتوں کے لئے الگ الگ پیانے مقرر ہیں۔ جہاں بے قصور عورتوں کو اچھائیں دبانے کے لئے جانور سے بدتر زندگی جینے پر مجبور کیا جاتا ہے اور مردوں کو اچھاؤں کی پورتی کے لئے گھر کی ملازماؤں کے ساتھ بلا تکار تک کی اجازت دی جاتی ہے۔ حد تو یہ ہے کہ روپی کے حاملہ ہونے کے بعد گھر کے سارے افراد مل کر اسے مار دیتے ہیں اور کسی کا ضمیر ملامت بھی نہیں کرتا۔ جبکہ بے قصور بیوہ کو اصولوں کے نام پر بند کوٹھری میں قید کیا جاتا ہے۔ فکر وعمل کا یہ تضاد ہی استحصال، ظلم اور سفاکی کی مختلف داستانیں رقم کرتا ہے۔

ناول کا دوسرا مرد کردار راجکمار ہے۔ یہ گاؤں کے غریب گھرانے سے تعلق رکھتا ہے اور دور سے ہی ''روپی'' پر فدا ہے۔ یہ ایک بزدل، مجبور اور معاشرے کے قانونوں میں جکڑا ہوا عاشق ہے جو بغاوت اور بہادری کا کوئی خواب بھی دیکھنے سے ڈرتا ہے۔ اس کے سامنے روپی کی شادی ہوتی ہے، وہ بیوہ ہوتی ہے اور پھر شہر چلی جاتی ہے۔ اس کے دوست اسے للکارتے ہیں مگر کبھی اظہار محبت کی ہمت نہیں کر پاتا۔ روپی کے دکھ پر دکھی ہوتا ہے اور اس کے شہر جانے پر خوش ہوتا ہے مگر عملی طور پر روپی کی مدد کے لئے ایک قدم بھی بڑھانے سے ڈرتا ہے۔ روپی جب اپنے باپ اور گھر والوں کے خلاف پولس کو خط بھیجتی ہے تو راجکمار کا ہی سہارا لیتی ہے۔ یہاں پر قاری کو تھوڑا تعجب بھی ہوتا ہے کہ جب راجکمار سے روپی کی کہیں ملاقات ہی نہیں ہوئی اور نہ دونوں میں شناسائی ہے تو وہ راجکمار سے خط کیسے بھجواتی ہے؟ اور راجکمار پر ہی بھروسہ کیوں کرتی ہے؟ ظاہر ہے یہ قصہ کا ایک نازک موڑ ہے جہاں مصنفہ کو احتیاط سے کام لینا چاہئے تھا۔ بہر حال راجکمار کا کردار اپنے اندر کوئی کشش نہیں رکھتا، سوائے اس کے کہ دل کا اچھا آدمی ہے۔ اور حویلی والوں اور ان کے بنائے ہوئے اصولوں اور ڈھکوسلوں سے اسے شدید نفرت ہے۔ اسی لئے روپی اخیر میں جب گاؤں سے آزاد ہو کر شہر کی طرف قدم بڑھاتی ہے تو اس کے پیچھے پیچھے راجکمار بھی چل پڑتا ہے۔

ناول میں راکمار کے دوست بھی ہیں جو راجکمار سے زیادہ ہمت رکھتے ہیں مگر عملی قدم اٹھانے سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں۔ ایک کردار اللہ رکھا ہے جو ہندو مسلم مشترکہ کلچر کی خوبصورت مثال ہے۔ یہ بھی استحصال کا شکار ہے کیوں کہ ایک بڑے گھر کی بیٹی سے اس نے پیار کیا تھا۔ نتیجہ میں اسے دیش نکالا کی سزا بھگتنی پڑی۔ روپ پیشور سنگھ ہے جو ایک الگ قسم کے قبیلے سے تعلق رکھتا ہے اور وہاں کی غلیظ رسموں کی وجہ سے HIV میں مبتلا ہو کر جی رہا ہے۔ گویا

ناول میں مختلف قسم کے کردار ہیں۔ ہر کردار کے دامن میں کھونے ،لٹ جانے ،مرنے ، مٹنے کی ان گنت داستانیں ہیں۔سب خوں آشام، ہر چہرا الجھاہوا، ہر کردار کا جگر چھلنی۔ یہ سب مل کرہمیں راجستھان کے مختلف کلچرز کی ان گنت زمینی حقیقتوں سے روبروکراتے ہیں۔

یہاں واقعات جس قدرزیادہ ہیں اثرات ان سے بھی زیادہ۔ پوراناول جذباتی اور ذہنی کشمکش کی بھٹی میں کھولتارہتا ہے۔بکھراؤاورتعمیر،ظلم اوراحتجاج دونوں مرحلوں میں یہ بھٹی کبھی بجھتی نہیں۔اس لئے قاری ایک بے چین روح کی طرح ناول نگار کے اشارے پر جیتا مرتا رہتا ہے۔ یہ اضطراب، بے چینی، خواب، حقیقت کا گھماسان،آسمان میں آزادا ڑان کی چاہت اور پنجرے میں قید ہونے کی مجبوری۔یہی اس ناول کا اصل کرب ہے اورالمناک حقیقت۔مصنفہ اس حقیقت کی مختلف تصویریں ایک فوٹوگرافر کی طرح اتارتی ہیں اور قاری تک پہنچاتی ہیں۔اس تصویرکشی میں ان کے اندرکافن کا تمام واقعے،حادثے اورالمیے پر بہت خاموشی کے ساتھ اپنا احتجاج درج کراتارہتا ہے۔

''معمہ بن کررہ جانے والی نسائیت ...... کہ جس کے سوالیہ وجود کے آگے تمام مفکر،تمام دانشورہی کیا تمام خدائی چکرا جاتی ہے۔آخراس عورت کو چاہئے کیا۔ کیوں یہ بار بار معمہ بن کرسب کو پریشان کرتی رہتی ہے۔ کوئی ہے جو اسے سلجھا سکے۔لیکن سلجھنے سلجھانے کی نوبت تو جب آتی ہے جب الجھایا جائے ......کون الجھاتا ہے اسے ...... یہ نظام ...... یہ رواج ...... یہ روایتیں ...... یہ وراثتیں ......کہاں ہیں اصلاحی تحریکیں، کہاں ہیں مساوات کے ڈھنڈورے،کہاں ہیں سماجیات کے نمائندے؟ ہےکوئی جو آئے اوراس آلودہ فضا سے اسے باہر نکال سکے؟''

احتجاج کا یہی رویہ''اندھیرا پگ'' کامرکزی نقطہ ہے جوناول کی رگ رگ میں سمایا ہوا ہے۔

ثروت خان نے اپنے ناول میں موضوع،فکراور تکنیک کے ساتھ اسلوب و اظہار پر بھی قدرت کے ذریعہ فنکارانہ ہنرمندی کا ثبوت پیش کیا ہے۔ ناول پہلے صفحے سے ہی قاری کو اپنی گرفت میں لینے کی قوت رکھتا ہے۔چھوٹے چھوٹے فقرے، جامع اور مختصر جملے،استعاروں تمثیلوں میں لپٹے مکالمے بہت کم لفظوں میں بہت زیادہ کہہ کر قاری کو بیک وقت معنی کی مختلف دنیاؤں کی سیر کرا دیتے ہیں۔اس میں وہ موزونیت اور لطافت نہیں جو شاعرانہ نثرکا خاصہ ہے۔لیکن سیدھے سادے خشک الفاظ کی اوٹ سے گہری سوچ اور عصری حقائق سے الجھنے والی فکر کی کرنیں اس طرح پھوٹتی ہیں کہ ذہن چکاچوند ہو جاتا ہے۔تخیلی رنگینی سے عاری اس نثر میں جوتصویریں بھی ابھرتی ہیں وہ واضح اور روشن ہیں۔ عام طور پرناول نگار کے نثری کمال کا اظہاراس کی فضا نگاری اور پیکرتراشی وغیرہ

میں زیادہ واضح طور پر ہو پاتا ہے۔ ثروت خان کے ناول میں بھی ایسی جگہوں پر حسن بیان کی انفرادیت کو بخوبی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ جہاں انہوں نے اپنی نثر میں شعریت اور لطافت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً روپی کا پیکر ملاحظہ ہو:......

''سترہ سال کا نازل سا سراپا، معصوم سا اجلا اجلا...... گھنیرے بال، ہرنی سی چال، گڑیا سا چہرہ، ڈب ڈب کرتی پیاری سی آنکھیں، گال پر سرخی، سرخی کے ہلکورے، ہلکورے میں گھرے گھرے گڑھے، گڑھوں میں شوخی کے بھنور......اور بھنور میں ڈوبتا تیرتا اس کا وجود۔'' (ص:۴۶)

''چاندنی کی نرم سفید چادر میں ملبوس کائنات پری پیکر بنی اتراتی شرماتی خراماں خراماں آگے بڑھ رہی ہے......صادق کو ور مالا پہنانے کی گھڑی جو آنے والی ہے۔ اس پیری پیکر کے قدموں میں تارے جھلملا رہے ہیں، پُروائی ہوا نے خیر مقدم کے لئے پروں کو پھیلا دیا ہے۔ وہ اڑتی اڑاتی جب گیلری میں رکھے شاداب گملوں کے پاس سے گزری تو پودوں کی ٹہنیاں جھوم اٹھیں اور لہرا کر راج کنور کی پنڈلیوں سے ٹکرائیں۔ گویا انہیں بھی اس مدماتی فضا میں شریک ہونے کی دعوت دے رہی ہوں۔'' (ص:۱۰)

ثروت خان نے جو تمثیلیں اور استعارے پیش کئے ہیں وہ بہت نئے نہیں ہیں اور نہ پیش پا افتادہ ہیں۔ انہوں نے عام مشاہدے میں آنے والی چیزوں کو مثال بنایا ہے مگر اس طرح کہ پیش کش میں بے ساختگی اور نیا پن در آیا ہے۔ مثلاً......

''روپی ایسے دبک گئی جیسے چوزا مرغی کے پروں میں سما جاتا ہے۔''

''تین دن سے مسلسل ایک نہ ٹوٹنے والی لڑی کی طرح آسمان سے دھول کے بادل برس رہے تھے۔''

ثروت خان کو زبان پر عبور حاصل ہے۔ خاص طور سے ہندی اور اردو زبانوں کا امتزاج بڑے خوبصورت ڈھنگ سے موجود ہے جو لطف دیتا ہے۔ جہاں دھرم ادھیکاریوں والی ہندی سے گریز کیا گیا ہے وہیں عام روزمرہ کے ہندی الفاظ اتنی بے تکلفی سے برتے گئے ہیں کہ ان کی موجودگی کا احساس ہی نہیں ہو پاتا۔ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ تھوڑے سے تغیر و تبدل کے بعد اس ناول کو دیوناگری رسم الخط میں بھی آسانی سے پیش کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ''بیوی کی طرف متعارفانہ انداز سے دیکھا'' جیسے جملے تکلیف بھی دیتے ہیں کہ قاری اس انداز نظر کا مطلب سمجھ ہی نہیں سکتا۔

قصے میں ربط و تسلسل کی کچھ کمی کا احساس ہوتا ہے۔ مثلاً روپی کا وِدھوا ہونا قصے کا ایک اہم حصہ ہے مگر

اس کے ذکر سے پوری طرح احتراز کیا گیا ہے۔ نہ اس کے شوہر کا پتہ چلتا ہے اور نہ اس کی موت کا۔ شادی کے بعد اچانک اگلے باب میں روپی وِدھوا دکھادی جاتی ہے۔ جہاں اتنی ساری تفصیلات ہیں کم از کم ایک آدھ صفحہ روپی کے شوہر اور اس کی موت کا ضرور ہونا چاہئے تھا اور اس کی موت سے روپی پر طاری ہونے والے جذبات کا اظہار بھی لازمی تھا۔ اس ذکر سے نہ صرف ناول کے پلاٹ میں ترتیب و ربط کی کمی دور ہوتی بلکہ وہ تشنگی بھی ختم ہوتی جو اس واقعے کی عدم موجودگی سے پیدا ہوتی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ ناول کے اختتام پر مصنفہ جلد بازی کا شکار ہوگئی ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے وہ ناول کو جلد ختم کر کے قصہ نپٹانا چاہتی ہیں۔ قصورواروں کو سزا کے ساتھ سماج میں تبدیلی اور روپی کے نئے سفر پر قدم بڑھانے کی داستان مزید دلکشی اور تاثیر کا تقاضا کرتی ہے۔ اسی طرح ''اندھیرا پگ'' کی رسم کے بارے میں قاری کو اشتیاق رہتا ہے کہ یہی ناول کا سرمایہ ہے۔ اس رسم کی ادائیگی کی تفصیلی بہت موثر نہیں ہوسکی۔ اسے بہت جذباتی اور دردانگیز واقعہ ہونا چاہئے تھا جو قاری کے دل کو مٹھیوں میں جکڑ لے۔ مگر یہ رسم بہت سرسری انداز میں گزر جاتی ہے اور احساس بھی نہیں ہوتا۔

ان کمیوں کے باوجود سیاسی، سماجی مسائل پر لکھے جارہے خشک ناولوں کے مقابلے میں یہ زیادہ دلچسپ ناول ہے۔ نذیر احمد سے پریم چند تک ''بیوہ'' کے موضوع پر مختلف ناول لکھے گئے مگر جس پس منظر میں اختصار و جامعیت کے ساتھ موجودہ عہد کی عورت کی بپتا اس ناول میں پیش کی گئی ہے وہ سب سے الگ ہے اور زیادہ المناک وکرب انگیز بھی۔ اس میں عورت کا دکھ ہی دکھ ہے، اس کی اداسیاں ہیں، اس کے غموں کی پرچھائیاں ہیں مگر غم سے نجات کے تمام راستے بند ہیں۔ اس قدر بند ہیں کہ پڑھنے والوں کے دلوں کا بوجھ کم کرنے کے لئے مصنفہ کو شاعری، مزاح یا ظرافت کی کوئی چھوٹی سی کھڑکی بھی نہ مل سکی۔

واضح ہو کہ یہ ناول محض وقت گزاری کے لئے یا تفنن طبع کے طور پر لکھا بھی نہیں گیا ہے۔ اس کا اخلاقی پس منظر اتنا مضبوط، مستحکم اور مربوط ہے کہ مصنفہ کے وجود، ناول کے مقصد اور اس مقصد کے دائرہ کار کو نظر انداز کر کے اس ناول کی مجموعی قدر و قیمت کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا۔ ثروت خان کے شعور کی ایک سطح بہت نمایاں ہے اور ناول کی ہر سطر میں اپنے ہونے کا احساس دلاتی ہے۔ وہ سطح عبارت ہے موجودہ انسانی معاشرے میں عورت کے وجود کی معنویت سے۔ اس کی تقدیر اور گردوپیش کی دنیا میں اپنی شراکت سے۔ تانیثیت نے ہمارے زمانے میں ایک اہم معاشرتی قدر کے علاوہ ناگزیر وجودی مسئلے کی حیثیت بھی اختیار کر لی ہے۔ اس

مسئلے کے اظہار کی جو صورتیں معاصر شاعری یا فکشن میں نظر آتی ہیں وہ سب کی سب تخلیقی اعتبار سے توجہ کی مستحق نہیں۔ایسی تخلیقات کا سیلاب ہے جن میں سب کچھ کہہ دیا جاتا ہے۔انہیں یہ پتہ ہی نہیں کہ اچھی تخلیق کہیں کہیں تفصیل کی بجائے تخفیف کی پابند بھی ہوتی ہے۔

''اندھیرا پگ'' میں الم آلودگی کی ایک مستقل آنچ،ایک اداسی اور ملال کی مدھم سی کیفیت بالعموم موجود ہے تو اسی لئے کہ مصنفہ نے اپنے جذبے یا شعور یا نقطۂ نظر یا اخلاقی موقف یا سماجی معنویت کے سلسلے میں مبالغہ سے گریز کیا ہے۔درد اور دکھ عورت کی تقدیر کے بجائے ایک دائم و قائم حیثیت کے طور پر اس ناول میں پائے گئے ہیں۔

اس لئے مجھے بار بار یہ احساس ہوا ہے کہ یہ کہانی افراد کی نہیں بلکہ ایک انسانی اجتماع،ایک معاشرے، ایک تہذیب کی کہانی ہے۔اس تہذیب کے مظاہر پر مصنفہ کی گرفت بہت مضبوط ہے۔

چنانچہ راجستھانی زندگی سے متعلق اشارے،استعارے اور تفصیلات کا بیان بھی اس ناول میں بہت سلیقے سے کیا گیا ہے۔ان تفصیلات کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے مصنفہ نے کافی عرصہ اس کی تلاش اور جمع کرنے میں گزارا ہے اور ایک پروجیکٹ کی طرح جزئیات کے حصول میں Work کیا ہے۔مگر ناول میں ان اشاروں یا تفصیلات کا مقصد راجستھانی تہذیب سے مصنفہ کی قربت یا شناسائی کا ثبوت مہیا کرنا نہیں ہے۔انہوں نے تو اپنے آپ کو صرف ان ازلی اور ابدی سوداگروں کی گرہ کشائی کا پابند کر لیا ہے جن سے راجستھان اور بالخصوص دلیش نوک کی عورت دوچار رہتی ہے۔

اس لئے یہ ناول محض ایک کہانی نہیں اپنے کرداروں کے ساتھ اپنے عہد کے اسلوبِ زیست اور احساسات کا جیتا جاگتا،استحصال اور احتجاج کی حدت سے معمور منظر یہ سامنے لاتا ہے۔

مختصر یہ کہ ناول کی Perfect تکنیک،اپنے کرداروں کی تفصیلی جانکاری،ان کی زبان اور محاوروں سے ایسی آشنائی اور کرداروں اور ان کے ماحول کی اتنی پر اثر عکاسی کسی تخلیق کار کے پہلے ناول میں مشکل سے ملتی ہے۔

اس لحاظ سے ''اندھیرا پگ'' کو بڑا ناول نہیں مگر کامیاب اور بڑی تخلیق ضرور کہا جاسکتا ہے۔یہ اس اعتبار سے بھی اہم ہے کہ یہ اردو میں ایک بڑے ناول نگار کی بشارت دے رہا ہے اور اس میں ایک بڑی کتاب کا نقش ابھر رہا ہے۔

امید کی جاسکتی ہے کہ مصنفہ کا اگلا قدم ہمیں ایک نئی دنیا، نئے آسمان اور نئی منزل سے زیادہ فنکارانہ طور پر روشناس کرائے گا۔

نقاش نقش ثانی بہتر کشد زاول

میری لیڈر: ثروت خان

ڈاکٹر صادقہ نواب سحر

ساہتیہ اکادمی سے رینو بھان صاحبہ کا فون آیا تھا۔ اودے پور یونیورسٹی میں ''اِسمتا'' کے تحت خواتین قلمکاروں کے ایک سیمینار کا انعقاد کیا گیا تھا۔ یہ پروگرام میرے لیے خوشی کا خزانہ لاتے ہیں کہ کچھ ادیبوں سے ملاقات ہو جاتی ہے۔

یونیورسٹی میں سب ثروت خان کو ڈھونڈ رہے تھے۔ وہ اس پروگرام کی مقامی کنوینر تھیں۔ شاید ان دنوں ان کے بیٹے کی شادی کے سلسلے تھے۔ وہ آئیں اور ہمیں اپنے ہال کی جانب لے چلیں۔ میں دیکھ رہی تھی ان قلمکار خاتون کو۔ اونچا قد، گورا رنگ، ذہین مسکراہٹ، ساڑی میں ملبوس وہ کسی بڑی کمپنی کی ایگزیکیوٹیو نظر آ رہی تھیں۔ اناؤنسمینٹ اور بات چیت کے دوران محسوس کیا کہ وہ بڑی ڈیرنگ اور ڈیشنگ خاتون ہیں۔

جب میں نے اُن سے کہا کہ ''آپ کے ناول اندھیرا پگ کی شہرت سنی ہے۔ کہیں بھی دستیاب نہیں۔'' آؤٹ آف پرنٹ ہے۔ تو انہوں نے مجھ سے فوراً کہا ''پڑھیں گی۔ پتہ میسیج کر دیجئے۔''

اس سیمینار میں میری ملاقات غزال ضیغم سے بھی پہلی بار ہوئی تھی۔ غزال ضیغم کی محبت بھی ایسی ہی ہے۔ میرے ناول کو بڑی خلوص کے ساتھ سراہا۔ میں نے سیمینار میں افسانے کے علاوہ دو نظمیں بھی پڑھی تھیں۔ ان کی یہ بات میں کیسے بھول سکتی ہوں، ''نیا دور کے مدیر وضاحت حسین خواہ مخواہ اچھی شاعری نہ ملنے کی شکایت کرتے ہیں۔'' وہ مجھ سے وہ نظمیں ماہنامہ 'نیا دور' کے لے گئی تھیں۔

ثروت خان سے دوسری ملاقات ساہتیہ اکادمی کے دادر، ممبئی برانچ کے ہال میں ہوئی۔ پروگرام کے بعد ہم انہیں ان کے ہوٹل پہنچانے گئے تھے۔ یہاں ان سے بے تکلف باتیں ہوئیں۔ اور سچ پوچھئے تو یہاں سے ان سے دوستی کا آغاز ہوا۔ انہوں نے اندھیرا پگ کی زیراکس کاپی مجھ تک پہنچائی۔ جسے میں نے بڑی خوشی سے پڑھا۔ پچھلے کچھ برسوں سے قومی کونسل کی میٹنگوں کے بہانے سال میں ان سے دو بار ملاقات ہوتی ہے۔ پچھلے سال پٹنہ میں بہار ساہتیہ اکادمی کے خواتین کے قومی اجلاس میں ان کا لیکچر سن کر دنگ رہ گئی۔ اس خاتون میں کتنا آتش فشاں

تیار ہے۔ایک سیشن کے خطبۂ صدارت میں بڑے تعجب کے ساتھ میں نے انہیں اپنی لیڈر مان لیا تھا۔عام طور پر خواتین محفلوں میں بولتی نہیں۔ہم سب کی طرف سے ثروت خان نے اپنی آواز پہنچا دی تھی۔ان کا لب ولہجہ بہت کچھ راجستھانی ہے۔میں نے محسوس کیا ہے کہ جب بھی وہ کسی بات کو ٹھان لیتی ہیں،تو بس ٹھان لیتی ہیں۔۔ Self Determination سے لبریز لوگ مجھے اچھے لگتے ہیں۔اپنے ساتھی قلمکاروں کے لیے ان کے دل میں ذرا سی بھی حسد نہیں۔اودے پور میں ملاقات کے کچھ دنوں بعد ہی ایک لڑکی نے مجھے فون کر کے مجھ سے میرا ناول' کہانی کوئی سناؤ متاشا' مانگا تھا۔وہ ڈاکٹر ثروت خان کی اسٹوڈنٹ تھی اور اس ناول پر ایم فل کرنا چاہتی تھی۔بدقسمتی سے پہلے ایڈیشن کی آخری کاپی میرے پاس بچی تھی۔بعد میں کئی ایڈیشن آئے اور آرہے ہیں۔اس وقت میں نے اس سے معذرت چاہ لی تھی۔وہ ناول اُسے ثروت خان نے دے دیا تھا۔میرے دوسرے ناول' جس دن سے......!' پر ثروت خان نے ستائشی جملے کہے۔ماہنامہ آج کل،دہلی میں ''وہیل چیئر پر بیٹھا شخص'' افسانہ شایع ہوا تھا۔ثروت خان کا فون آیا۔خوشی کا اظہار کیا۔کافی دیر تک اس افسانے پر بات کرتی رہیں۔

یہ سوال اکثر ہوا میں گردش کرتا رہتا ہے کہ آخر عورتیں لکھتی کیوں نہیں۔اس کا جواب یہ بھی تو ہے کہ آگے آنے والی لکھاریوں کو آگے بڑھنے سے روکنے کے حربے بھی تو کئی ہیں۔اپنے زمانے کے ہنرمندوں کے ساتھ یہ برتاؤ تو صدیوں سے چلا آرہا ہے۔ایک لویہ نے اپنا انگوٹھا یوں ہی تو نہیں گنوایا تھا۔اس معاملے میں ثروت خان اپنی مثال آپ ہیں۔وہ جو ہیں،سو ہیں۔انہیں اس سے مطلب نہیں کہ کوئی انعام پا رہا ہے،کوئی واہ واہی حاصل کر رہا ہے،کوئی زیادہ چھپ رہا ہے۔اسکے لئے میں ان کی ستائش کرتی ہوں۔دھاردار قلم،تیز تنقید کی روشنی سے آراستہ زبان و بیان کی مالک جب مجھ سے پوچھتی ہیں،''آپ چپ کیوں رہتی ہیں،بولتی کیوں نہیں؟'' میں جواب دیتی ہوں،''آپ نپٹ لیتی ہیں۔میں نہیں کرسکتی۔اس لئے چپ رہتی ہوں۔''

میں نے ماہنامہ' اردو دنیا' میں،اپنے ایک مضمون میں ان کے بارے میں لکھا ہے،

''افسانہ نگاری سے ناول نگاری کی طرف راغب ہونے والی نئی نسل کی ابھرتی خواتین میں ملا تلائی، اودے پور،راجستھان کی متوطن،ثروت خان کا نام ادبی حلقے میں خاصہ اہم ہے۔ان کا پہلا ہی ناول' اندھیرا پگ' ۲۰۰۵ء میں طبع ہو کر منظر عام پر آیا اور ادب کے سنجیدہ حلقے کو چونکا گیا۔اس کا موضوع بھی عورت کے استحصال سے عبارت ہے۔جس میں ایک مجبور بیوہ کی زندگی کو بری عمدگی سے راجستھانی معاشرے کے پس منظر میں پیش کیا گیا ہے۔یہ ناول راجستھان کی تہذیبی،تمدنی اور معاشرتی زندگی خاص طور پر راجستھانی پروہتوں اور پنڈتوں کے

مذہب کے پردے میں خواتین پر کئے جانے والے استحصال کی نقاب کشائی کرتا ہے ناول جس مقصد کے لیے لکھا گیا ہے اس کا دائرہ کار نہایت وسیع ہے۔ اس کی سب سے بڑی خوبی اس کا جادوئی بیانیہ ہے جو اس کی کامیابی کی ایک علامت ہے۔ ہندوستان میں طبقۂ نسواں کا استحصال کوئی نیا موضوع نہیں ہے لیکن ناول نگار کا کمال اس کے انداز پیشکش میں مضمر ہے۔ ثروت خان نے اس ناول کے موضوع کو منفرد بنانے کے لیے ایک طرح کا تہذیبی معاشرہ پیدا کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ مصنفہ نے موضوع کی وضاحت اس طرح سے کی: ''دلیش نوک، کہ جسے گورنمنٹ کے ریکارڈ میں ایک خوشحال گاؤں دکھایا گیا تھا، لیکن یہاں خوش حالی کو چھوڑ کر سب کچھ تھا۔ جہالت ایسی کہ میٹرک پاس ملنا محال تھا۔ لڑکیوں کی تعلیم کا رواج تو بالکل نہیں تھا، ہاں پروہتوں نے اپنی وراثتی علم یعنی تنتر منتر، کریا کرم کانڈ کو فروغ دے رکھا تھا جو نسل در نسل چلا آرہا تھا۔ گھرانے کے مرد جہاں سنسکرت، وید، پُران کے پنڈت تھے وہاں عورتیں ان پڑھ تھیں۔ حویلی کی اونچی دیواروں میں قید، جہالت کی لعنت سے لپٹی ہوئی نسائیت کے پاس مرد کی چادر بننے کے سوا دوسرا کوئی چارہ نہیں تھا۔''

(ناول، اندھیرا پگ، ثروت خان، ص ۳۵)

اس ناول میں مردوں کے ظلم وستم سے عورت کے بچاؤ کی جستجو کی بھی عکاسی ملتی ہے جو قابل تعریف ہے۔ دراصل ثروت خان اپنے ناولوں کے ذریعے طبقۂ نسواں کو مرد سماج کی بربریت سے نجات دلانے کی کوشش کرتی ہیں۔ ثروت خان کو ہندوستانی سماج میں صدیوں سے پائی جانے والے سماجی عدم مساوات کی روایت نے بے چین کر رکھا ہے، وہ سماجی نابرابری، حقوق نسواں، سماج میں طبقۂ نسواں کی حق تلفی پر ملامت کا اظہار کرتی ہیں، اس تعلق سے ایک مضمون میں لکھتی ہیں: ''لیکن حریت و مساوات ہے کس چڑیا کا نام؟۔۔ یہاں سارا کھیل تو مردانہ اقتدار و امتیاز کا ہے۔ نسائی وجود کی نفی کا ہے۔ نہ باہمی رابطے ہیں، نہ قربتیں، نہ آپسی ہمدردیاں ہیں، نہ انسانیت کا رکھ رکھاؤ۔ اگر کچھ ہے تو وہ یہ کہ رسم و رواج کی پابندیاں۔ طبقۂ نسواں کے لیے، مذہب کی جکڑ بندیاں۔ طبقۂ نسوں کے لئے اخلاق کی پاس داریاں، طبقۂ نسواں کے لیے، شرم و حیا کی حد بندیاں۔ طبقۂ نسواں کے لیے، اور ساری بے شرمیاں طبقۂ کرخت کے لیے۔ عورت کی طرف سے احتجاج بھی ہے تو ڈرا ڈرا سا، بغاوت بھی ہے تو سہمی سہمی سی، فراریت بھی ہے تو رُکی رُکی سی، چال بازیاں بھی ہیں تو دبی دبی سی، بدلہ بھی ہے تو نرم گرم سا۔ جھنجھلاہٹ بھی ہے تو، اداس اداس سی۔'' (ثروت خان، طبقۂ نسواں کے مسائل اور معاصر اردو ناول، ماہنامہ شاعر، بابت مارچ ۲۰۱۳ء، صفحہ ۵) ثروت خان نے اس ناول میں سماجی روایتوں، تہذیبی وراثتوں اور ہمارے نظام زندگی کو طبقۂ

نسواں پر ہورہے مظالم کا ذمہ دار قرار دینے کی کوشش کی ہے۔

ثروت خان جس قدر دبنگ اور ڈیشنگ نظر آتی ہیں، اُسی طرح نرمی اور شائستگی سے لبریز اُن کی شخصیت ہے۔ اپنے سینئرس کا دل سے احترام اور اپنے جونیئرس کو گلے لگاتی، سمجھاتی، غور وخوض کی دعوت دیتی نظر آتی ہیں۔ اودے پور میں وہ ہر برس اب اردو کی کلاسیں بھی لیتی ہیں۔ انہوں نے ٹھان رکھی ہے کہ وہ اہلِ اودے پور کو بغیر ہدیہ کے اردو پڑھائیں گی۔ سکھائیں گی — اس لئے ۱۶/اگست سے ۳۰/ستمبر یعنی ڈیڑھ ماہ سخت محنت کر کے وہ ۱۸/برس کے بڑے نوجوانوں، ادھیڑوں اور بزرگوں کو الف، ب ت سے اردو سکھاتی ہیں۔ ان کی کلاس میں ۸۰/فی صد غیر مسلم حضرات ہوتے ہیں۔ جن کے ذوق وشوق کے متعلق وہ مجھے اکثر بتاتی رہتی ہیں۔ میں فیس بک پر اُن کی اس کاوش کو جی بھر کر سراہتی ہوں۔

وہ سوشل ایکٹی وسٹ بھی ہیں۔ ریلیاں نکالتی ہیں، احتجاج کرنے سڑکوں پر اُترتی ہیں۔ مردوں کے کندھے سے کندھا ملا کر بلکہ آگے آگے رہ کر ملک اور سماج کی ناہمواریوں پر سخت احتجاج کرتی ہیں تو یہی احتجاج اُن کے افسانوں میں بھی نظر آتا ہے۔ جہاں نہ عورت کو بخشتی ہیں نہ مرد کو — ان کے افسانوں کو پڑھیں تو ان میں ایک سچّے اور اچّھے انسان کی تلاش نظر آتی ہے۔ اور جب تلاش کے باوجود سفاکیاں نظر آتی ہیں تو ثروت خان کا قلم زہر اگلتا ہے — حقیقت کو برہنہ کرتا ہے، سچائی کا دیدار کراتا ہے۔ اُن کے افسانوں کے نسوانی کردار بے خوف ہیں، بے باک بھی ہیں اور عملی اقدامات کرتے نظر بھی آتے ہیں — مرد کرداروں کو اُن کے افسانوں میں متوازن رویّہ اختیار کرنے کی خاموش تربیت دی گئی ہے۔ ثروت کو عورت کی عزت بہت پیاری ہے — معاملہ کسی کا بھی ہو، اگر ان کے سامنے ہے تو وہ خاتون قلم کاروں کی ڈھال بنی نظر آتی ہیں۔ بے لوث اور بے فکر انداز میں۔ مجھے اُن کی یہی سب باتیں بہت متاثر کرتی ہیں۔ شوخی وظرافت کا پہلو، بھی اُن کی سرشت میں شامل ہے دوستوں میں خوب مست رہتی ہیں مہنگے کپڑے پہنتی ہیں۔ اسٹائلش زیورات جو بہت کم ہوتے ہیں، خریدتی ہیں — ان سب چیزوں کا مجھے بھی شوق ہے، اُنہیں بھی — اسی لئے مجھے ان کا یہ انداز بھی بے حد اچھا لگتا ہے۔

تنقید میں ثروت خان کا اپنا منفرد انداز ہے۔ نہ صلے کی پرواہ نہ ستائش کی تمنا — تب ہی تو دوٹوک بات نظر آتی ہے ان کی تنقید میں — لیکن دلیلوں اور ثبوتوں کے باہم — سوالات کرتی ہیں تو جوابات بھی دیتی جاتی ہیں۔ بحث کو آگے بڑھانا اور خود ہی مکالماتی انداز میں نقادانہ جواب دے کر معاشرہ کی دکھتی رگوں پر ضرب لگانا انہیں آتا ہے۔ یہی وہ سب باتیں ہیں۔ جو معاصرین سے ان کو منفرد کرتی ہیں — اور اسی لئے وہ مجھے پسند ہیں۔

نسائی احتجاج کی تخلیقی جہت: ثروت خان

پروفیسر سیما صغیر

مہذب سماج کی تعمیر میں عورت کا کردار سب پر عیاں ہے۔ وہ بھی جو اکیسویں صدی میں بھی ہٹ دھرمی پر قائم ہیں، وہ بھی اس کے قائل ہیں کہ باعزت سماج کی تشکیل کے لیے عورت کی منصفانہ سوچ اور تخلیقی شرکت ہر حال میں ناگزیر ہے۔ کل کے جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام کے حبس زدہ ماحول سے خواتین کو آزادانہ ماحول میسر کرانے کی سعی بیگم سلطان جہاں اور رشیدۃ النساء سے شروع ہوتی ہے۔ خواتین میں بیداری کی اِس مہم کو سلطانہ سعید، تہذیب فاطمہ، عظمت النساء، فضل فاطمہ، طیبہ بیگم، محمدی بیگم، صغریٰ ہمایوں، رضیہ ناصرہ، اُم الحلمیہ، فاطمہ بیگم، ز.ب. کیلہ، م.ز. بیگم، زبیدہ خاتون، مہر آرا بیگم، طاہرہ دیوی وغیرہ نے اپنے فن پاروں میں طبقۂ نسواں کے مسائل ومصائب کو مختلف زاویوں سے پیش کیا۔ حجاب امتیاز علی اور نذر سجاد حیدر نے مفاہمتی انداز میں مزاحمتی رنگ شامل کیا جسے دیکھ کر رشید جہاں نے احتجاجی رویہ اختیار کیا۔ عصمت چغتائی نے اپنے باغیانہ تیور سے اندازِ تخاطب کو بدلا۔ اِس بدلے ہوئے منظرنامہ کو رضیہ سجاد ظہیر، شکیلہ اختر، سرلا دیوی، صغرا مہدی، صدیقہ بیگم وغیرہ نے تقویت پہنچائی۔ خدیجہ مستور، واجدہ تبسم، جیلانی بانو، جمیلہ ہاشمی، الطاف فاطمہ، بانو قدسیہ وغیرہ نے اِس جانب خصوصی توجہ دی۔ قرۃ العین حیدر نے انسانی تاریخ کے مختلف ادوار میں عورت کی پُر وقار شبیہ کو پیش کی۔ رضیہ فصیح احمد، زاہدہ حنا، فاطمہ حسن، ذکیہ مشہدی، نوشابہ صدیقی وغیرہ نے اپنی تخلیقات کا یہ بھی مطمح نگاہ بنایا کہ عورتوں پر ہونے والا ہر طرح کا استحصال ختم ہو بلکہ سماج میں عورتوں کو بھی وہی مقام ومرتبہ حاصل ہو جو مردوں نے اپنے لیے طے کر رکھا ہے۔ فرزانہ باری کہتی ہیں:

> ''مرد اور عورت کا فرق فطری ہے لیکن سماج میں ان کا کردار فطرت نے نہیں بلکہ رواج نے متعین کیا ہے اور یہ بدلا جا سکتا ہے۔ اور وہ اس طرح کہ سماج نے عورت کو جن انسانی حقوق سے محروم رکھا ہے وہ اسے دیے جا سکتے ہیں''۔

ساجدہ زیدی، زاہدہ زیدی، ادا جعفری، کشور ناہید، فہمیدہ ریاض، پروین شاکر، زہرا نگاہ، رفیعہ شبنم عابدی، ترنم ریاض، شہناز نبی، عائشہ یوسف، عذرا پروین وغیرہ نے اپنے اشعار میں استحصالی نظام کی بدلی ہوئی صورتوں کو اُجاگر کیا ہے۔

تجھے مناؤں کہ اپنی انا کی بات سنوں
الجھ رہا ہے، میرے فیصلوں کا ریشم بھی

میں سچ کہوں گی، مگر پھر بھی ہار جاؤں گی
وہ جھوٹ بولے گا اور لاجواب کردے گا

(پروین شاکر)

دی جس نے محمدؐ کی رسالت پہ گواہی
اب اس کی گواہی کا بھروسہ نہیں ہوتا ہے

(زہرا نگار)

سمٹے ہوئے پروں کو کسی دن میں کھول کر
اُڑ جاؤں گی فضاؤں کے تیور ٹٹول کر

(شہناز نبی)

ستم شناس ہوں لیکن زباں بریدہ ہوں
میں اپنی پیاس کی تصویر بن کے زندہ ہوں

(کشور ناہید)

یہ تیور ثروت خان کے یہاں بھی نظر آتے ہیں۔انھوں نے سماج کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور مغرب و مشرق کے مزاج و مذاق کا مشاہدہ بھی۔ انھوں نے اپنے فن پاروں میں مختلف زاویوں سے صدیوں سے رائج نامساوی سلوک کو اُجاگر کیا ہے۔جس میں بالواسطہ طور پر عورت کی تحقیر و تضحیک سمٹ آئی ہے۔

زمانہ نے اُسے کیوں کمتر جانا؟ اس کی ذہانت، فکر و دانش کو کیوں وقار و اعتبار نہیں ملا؟ اُس کے عملی عزائم اور قوتِ بازو پر کیوں طنز کیا گیا؟ انھوں نے عورت و مرد کی تخصیص و تمیز کو اپنی تنقید کا اس طرح نشانہ بنایا کہ غیر

منصفانہ عمل خود بخود قاری کے روبرو ہوتا ہے۔ثروت خان نے افسانوی اور غیر افسانوی ادب میں پردہ اور پس پردہ کی فکر اور تبدیلیٔ وقت کے مزاج کو بخوبی جذب کیا ہے۔اس کی نمایاں مثال ’’اندھیرا پگ‘‘ اور ’’کڑوا کریلا‘‘ ہے۔ وہ بے حد حساس، باشعور اور سیکولر مزاج مسلم خاتون ہیں۔اُن کی عملی زندگی سے انسانی ہمدردی اور غریبوں کے تحت جذبہ ترحم کا پتا چلتا ہے۔انھوں نے اپنے تمام فن پاروں میں اکیسویں صدی کی دہلیز پر دستک دیتے ہوئے ان گنت موضوعات کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کیا ہے۔قدامت پرستی کے خلاف نڈر ہو کر صدائے احتجاج بلند کی ہے۔موجودہ سماج کی فرسودہ روایات اور نئی پُرانی نسل کے بیچ حائل گتھیوں کو موضوع بنا کر متحرک کرداروں کی تخلیق کی ہے۔اُن کے ادب پاروں میں ناول ’’اندھیرا پگ‘‘ کو سب سے زیادہ شہرت حاصل ہوئی ہے۔مصنفہ نے اِس ناول کے تعلق سے لکھا ہے:

> ’’معاشرہ کروٹیں بدل بدل کر انگڑائی لے کر اُٹھ کھڑے ہونے پر آمادہ ہے ایسے میں جدو جہد حاصل اور لا حاصل کے بھنور میں پھنسی نسوانیت کی پُکار اپنے وجود، اپنی شناخت اور اپنے شعور و ادراک کا احساس کراتی ---اگر گونج میں تبدیل نہ ہوئی تو لاتعداد ’اندھیرا پگ‘ لکھے جاتے رہیں گے!!‘‘۔

نسائی ادب کے تعلق سے دیکھیں تو اِس ناول میں بے حد متحرک کرداروں کے وسیلے سے قدیم وجدید رسم و رواج کے ٹکراؤ کو اس زاویے سے پیش کیا گیا ہے کہ بیوہ کی فریاد راجپوتانے میں بغاوت کی شکل اختیار کرتی ہے۔ بقول صغیر افراہیم اس ناول میں مرد کی حاکمانہ برتری اور تضحیک آمیز رویے کو شکست اور عورت کو آزادی اور قوتِ گویائی عطا ہوتی ہے، جس کے نتیجہ میں ’’اندھیرا پگ‘‘ روشنی کا مینارہ ثابت ہوتا ہے۔

پیغام آفاقی لکھتے ہیں:

> ’’ثروت خان کا دماغ ناول نگار والا دماغ ہے اور دل نقاد والا ہے... مجھے ثروت کی کہانیاں ادھوری ادھوری سی لگتی تھیں۔ میں اُن سے کسی بڑی چیز کی توقع کرتا تھا اور میں تب چونکا تھا جب ثروت نے کچھ دنوں کے بعد مجھے فون پر بتایا کہ انھوں نے ایک ناول مکمل کر لیا ہے...اندھیرا پگ نام کا یہ ناول اردو ادب میں ایک اضافہ ہے‘‘۔

علی احمد فاطمی نے اسے فکر و نظر، مزاحمت و احتجاج سے پُر ناول قرار دیا ہے۔وہ تجزیاتی مطالعہ سے نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ برہمن گھرانے کی چُلبلی لڑکی جسے پیار سے روپی کہا جاتا ہے، دلیش لوک راجستھان کی رہنے والی

ہے۔ یہ روپی بیوہ ہوجانے کے بعد ''اندھیرا پگ'' کی رسم سے جس طرح گزرتی ہے، اُس کا موثر بیان سماج کو جھنجھوڑنے والا ہے۔

''اردو ناول: تعریف، تاریخ اور تجزیہ'' کے مصنف نے لکھا ہے کہ ثروت خان نے ایک بیمار معاشرے کی منظر کشی کرتے ہوئے ''اندھیرا پگ'' میں جرات مندانہ قدم اٹھایا ہے۔ انھوں نے اِس ناول میں راجستھان کی لسانی، تاریخی، تہذیبی اور ثقافتی فضا کو ہم آہنگ کرتے ہوئے زندگی کے تضاد کو اُجاگر کیا ہے۔ انور پاشا کے مطابق ناول ''اندھیرا پگ'' اردو کی عام موضوعاتی روایت سے ہٹ کر ایک نئے اُفق کا پتا دیتا ہے۔ بیانیہ کا انداز نہ صرف قاری کو اپنی گرفت میں لیتا ہے بلکہ اس کی ذہنی تطہیر کا کام بھی انجام دیتا ہے۔ ناقدین نے اسے اردو میں تانیثی نقطہ نظر سے لکھے جانے والے ناولوں میں گراں قدر اضافہ قرار دیا ہے، جو ایک تازہ ہوا کے جھونکے کی طرح قاری کے جمالیاتی حس کے دریچے کو کھولتے ہوئے ایک سنجیدہ ڈسکورس کی طرف آمادہ کرتا ہے۔

مولا بخش نے اسے Episodic ناول قرار دیتے ہوئے تقابلی مطالعہ کیا ہے اور پھر اس مطالعہ میں تانیثی فکر ور جحان کے زاویے سے پرکھا ہے:

> ''ثروت نے راجستھانی لوک گیتوں، اساطیر اور رسوم کے مروجہ بیانیے کی Mixing سے وہاں کی زندگی یعنی مقامیت کو اُبھارا ہے اور اس مقام پر عورت کے شدائد کا بیان خلق کیا ہے جس میں Native Resource Oriented Language کا فنکارانہ استعمال بطور مکالمہ اور گیت کے ہوا ہے''۔

ثروت خان کے افسانے اور مضامین بھی قاری کو نہ صرف جھنجھوڑتے ہیں بلکہ غور وفکر پر مجبور کرتے ہیں۔ ناول ''کڑوے کریلے'' نہ صرف طنز ملیح سے بھرپور ہے بلکہ یہ ہمارے دقیانوسی معاشرے کو بصیرت اور بشارت دے رہا ہے۔ اس ناول میں ایک بڑی تبدیلی کا نقش اُبھر رہا ہے، جسے روڑھی وادی اور فرسودہ نظام کے خلاف اعلانِ جنگ کہا جاسکتا ہے۔ ثروت خان نے اس ناول کو موجودہ سماجی کلچر کو سامنے رکھ کر لکھا ہے اور اس میں منظر علاقائی نقطہ نظر سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے لہٰذا لاشعوری طور پر ثقافت، رہن سہن، طور طریقے، فرسودہ نظام، دوہرا کردار، عورتوں کے مختلف حالات اُبھر کر سامنے آئے ہیں۔ ثروت خان نہ صرف معلّمہ ہیں، بلکہ فیمینزم کی ہم نوا ہیں اور یہ جُرات انھیں اپنے قرب وجوار کے ماحول اور آزادانہ پرورش کی بدولت میسّر آئی ہے۔ تبھی تو راجستھانی تاریخ، تہذیب اور ثقافت کے پس منظر میں مظلوم طبقہ اُبھرتا ہے۔ فضا اور ماحول، مکالموں اور کرداروں

کے تعلق سے انھوں نے تبدیلیٔ وقت کو پینٹ کیا ہے جس کی گواہی اُن کا تخلیقی اور تنقیدی ادب دیتا ہے۔ وہ شروع سے سوشل ایکٹی وسٹ رہی ہیں اور اپنے عمیق مشاہدہ کو فنی اور فکری خوبیوں کے ساتھ فنکارانہ ڈھنگ سے پیش کرتی ہوئی نظر آتی ہیں کہ ان کے فن پاروں میں مردوں کے ظلم وستم سے عورت کے بچاؤ کی جستجو ملتی ہے۔

فکشن میں، ناول نگار کے علاوہ ثروت خان کی ادبی شخصیت کا دوسرا نمایاں پہلو افسانہ نگار کی شکل میں اُبھرتا ہے۔ ''ذروں کی حرارت'' زندگی کے تجربات کا خوبصورت اظہار ہے۔ پیغام آفاقی، علی احمد فاطمی، صغیر افراہیم، غضنفر، احمد صغیر، نسترن احسن فتیحی شہاب ظفر اعظمی اور شاہد پٹھان نے مذکورہ افسانوی مجموعہ کا تفصیلی مطالعہ کرتے ہوئے اپنی مدلّل رائے سے قاری کو باخبر کیا ہے۔

پیغام آفاقی، ثروت خان کی کہانی ''لوک عدالت'' کو شک وشبہ، بُغض وعناد اور دنگا وفساد کے مثلث میں ہی نہیں رسم ورواج، روایت اور عقائد کے دائروں میں بھی دیکھتے ہیں۔ تو ہم، قدامت اور مفاد پرستی میں مابین رابعہ، نور جہاں، میمونہ، شاکرہ، ذکیہ ہیں۔ علاقہ گجرات کے قریب راجستھان کا ہے۔ کرداروں کی شناخت راجپوت اور مسلمان کے توسط سے ہوتی ہے لیکن چکّی کے پاٹ میں پستی ہے عورت، اور یہی عورت ادب کی عدالت میں ایک مقدمہ قائم کرتی ہے۔ اُن کی کہانیاں زندگی اور معاشرہ کو سمجھنے میں معاونت کرتی ہیں اور ایک واضح زاویۂ نظر دیتی ہیں۔

صغیر افراہیم ''اردو افسانہ: تعریف، تاریخ اور تجزیہ'' میں لکھتے ہیں کہ ترقی پسندی ہو، جدیدیت یا پھر مابعد جدیدیت کا زمانہ، خواتین افسانہ نگاروں کے یہاں عورت کا نفسیاتی تجزیہ کیا جائے تو یہ بات اُبھر کر سامنے آتی ہے کہ وہ سماج میں باعزت طریقہ سے اپنا مقام ومرتبہ تو چاہتی ہے مگر صحت منداقدار کی پامالی پر نہیں، مغربیت کو پسند کرتی ہے مگر مشرقیت کو مجروح کر کے نہیں۔ اس کی ازلی نیکی اور فطری شرافت سماجی فلاح و بہبود پر اکساتی ہے اور جب جب اس کو مواقع میسر آتے ہیں وہ انسانی فلاح و بہبود میں سرگرم نظر آتی ہے۔ یہ عناصر اپنی تمام تر تابانیوں کے ساتھ ''ذروں کی حرارت'' میں نظر آتے ہیں۔ انھوں نے راجستھان کے اُس حسن کو اردو ادب میں بکھیرا ہے جس کی اشد ضرورت تھی۔

ناقدین نے اُن کے افسانے ''وہ لاجواب تھی'' کو ماحولیاتی جبر کے طور پر دیکھا ہے بلکہ موضوع اور اسلوب دونوں کو اسی مخصوص زاویہ نگاہ کے تحت احاطہ تحریر میں لیا ہے۔ ایک طرف چرند و پرند، حیوانات و نباتات کا مطالعہ ہے تو دوسری طرف فضا اور ماحول کو حسین و خوشگوار بنانے کا ہُنر۔ ایسے میں مرکزیت ایک جھیل کو حاصل

ہو جاتی ہے۔فنی کمال یہ ہے کہ عورت اور جھیل کے وجود کو مدغم کر دیا گیا ہے تبھی تو فنکار اور نقاد کے ساتھ ساتھ قاری کو بھی اپنے علاقے، قرب و جوار، فضا و ماحول سے محبت و انسیت محسوس ہوتی ہے۔

'لوک عدالت' میں ثروت خان نے فساد زدہ شہر کے عبرتناک منظر کو موضوع بنا کر گجرات اور راجستھان کی سیاست کو ہی پینٹ نہیں کیا ہے بلکہ اس کینوس میں وہاں کی اہم رسموں کی جھلک بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ تانے بانے کو بُننے والا کردار جعفری پس منظر بنتا ہے تو بیگم جعفری اصل منظر کی شکل اختیار کرتا ہے۔ واقعہ کے دہلا دینے والے منظر و پس منظر کو ثروت خان نے افسانے کے قالب میں بخوبی ڈھال دیا ہے۔تنقیدی رُجحانات اور بدلتے ہوئے افکار مجموعہ ''''شورشِ فکر'' میں اُبھرتے ہیں۔ مدلل اور موثر انداز اور تیکھا لہجہ تقریباً تمام مضامین میں نظر آتا ہے۔تنقید، تخلیق اور صحافت کی خوبیوں کو جذب کرتے ہوئے بیشتر مضامین غیر منصفانہ عمل کا ردعمل قرار پاتے ہیں اور حساس قاری سے بہت کچھ مطالبہ کرتے ہیں۔

شورشِ فکر: ایک مطالعہ

پروفیسر قمر جہاں

'شورشِ فکر' کی مصنفہ 'ثروت خان' ہیں۔ 'شورشِ فکر' اُن کی تنقیدی فکر کا آئینہ ہے۔ کتاب کی ضخامت کل تین سو بیس صفحات پر مشتمل ہے۔ مختلف عنوانات کے تحت کتاب کو چار حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا 'تانیثی ادب' اس مرکزی سرخی کے اندر کئی ذیلی عنوانات توجہ طلب ہیں۔ خاص طور سے 'طبقۂ نسواں اور معاصر اردو ناول'، 'نئی عورت'، 'نئے مسائل اور حقیقت پسند افسانہ'، 'تبدیلی کی زد میں معاصر افسانہ'، 'نسائی ادب کی سمت و رفتار......'، 'رشید جہاں کی فکر کل اور آج'، 'رشید جہاں اور تانیثی افسانہ......'، 'پنجابی کلچر اور ایک چادر میلی سی' میں لپٹی رانو، 'کرشن چندر کے افسانوں میں نسائی کرداروں کی معنویت'، 'ترقی پسند افسانے میں نسوائی کرداروں کے فکر و عمل کا ارتقائی سفر'، 'اردو کے تانیثی ادب میں طنز و مزاح کے عناصر'، 'میرا کا تصورِ عشق اور اس کی معنویت'، دوسرا مرکزی عنوان 'ادب عالیہ' ہے۔ اس حصہ میں شامل عنوانات ملاحظہ ہوں۔ میواڑ کے صوفی سنتوں کی شاعری، مراثی انیس میں انسانی رشتے اور معاصر شاعری میں ان کی تلاش، غالب کی فکری جہت (کلامِ فارسی کے آئینہ میں) تیسرا مرکزی عنوان ہے ''بیسویں صدی میں اردو ادب'' اس زمرے میں 'اختر شیرانی کچھ نجی حوالے'، 'سجاد ظہیر کا کرب'، 'سلام مچھلی شہری'، 'کشمکش کے آئینے میں'، 'ازم سے پرے — ایک شاعر راہی شہابی — سب سے اہم عنوان ''معاصر ادب'' ہے۔ اس ذیل میں محمد حسن کا ناول 'غمِ دل وحشتِ دل' کا تجزیاتی مطالعہ، ایک انوکھا ناول 'پار پرے' قمر رئیس کی شعری کائنات، وارث علوی کی تنقید کے تخلیقی رموز، تخلیق اور تنقید کے تقاضے اور سب سے آخر میں ''ثروت کی کہانی، میری زبانی'' ہے۔ خود مصنفہ کے قلم سے اپنی سیرت و شخصیت کا بیان بے حد دلچسپ اسلوب میں کیا گیا ہے۔ کہا ہی جاتا ہے کہ من آنم کہ من دانم......

ثروت خان اپنی واقفیت اور علمیت کا ایسا دلکش منظر نامہ پیش کرتی ہیں کہ ہم جو ایک طویل عرصے تک انہیں صرف تخلیقی ادب کا راہ رو سمجھتے تھے اور ان کا مشہور ناول ''اندھیرا پگ'' سے اُن کے ادبی وقار کو سمجھنے اور

سمجھانے میں لگے ہوئے تھے۔ بلاشبہ ناول سے قبل ہی صنف افسانہ میں بھی اپنی دلچسپی درج کرادی تھی اور یہ احساس دلایا تھا کہ ع

زرا نم ہو تو یہ مٹی بہت

زرخیز ہے ساقی!

ثروت خان کی تنقیدی بصیرت کا اندازہ محترمہ کے درجِ بالا مضامین سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ ساتھ ہی ان کے اندازِ گفتار اور طرزِ تحریر میں مزاحیہ لب و لہجہ کی جو خوش آہنگی شامل ہے وہ قابلِ تعریف ہے — چند حوالوں سے میں اپنے اس خیال کے لیے شواہد پیش کرتی ہوں:

''مارچ کے مہینے کے اختتام نے سیمیناروں کو لگام دی تو ذرا منہمک ہو کر اس بات پر غور کیا کہ آخر دورِ حاضر میں ہم اَدبی رویّوں کی اس قدر چھان پھٹک کیوں کر رہے ہیں؟ کیوں دیگر موضوعات کے ساتھ ساتھ نسائی ادب پر تفکر و تدبر کیا جا رہا ہے؟ کیوں ہمارے نقاد شمس الرحمٰن فاروقی تانیثی نظریہ تحریر، نظریہ قرأت، ہم جنسی کی تانیثیت، رحم مرکوز تانیثیت اور ہر عورت کی یعنی سفید کے ساتھ بلیک کی تانیثیت کی فکر کے بھولوں سے گھرے نظر آتے ہیں؟ کیوں دورِ حاضر میں اردو ادب ہی نہیں بلکہ پورے ہندوستانی ادب اور اس کے کلچر اور اس کی ترسیل کا رشتہ ہماری زندگی سے کہیں نہ کہیں منسلک ہونے کے بجائے منقطع ہونے کا قوی امکان پیدا ہونے لگا ہے؟''

(بحوالہ مضمون ''نسائی ادب کی سمت و رفتار اور چیلنجز'' از شورشِ فکر۔ ص ۴۶)

یہی نہیں مختلف اور متنوع سوالات کے جال بنتی ہوئی وہ اپنی دانشوری کا اظہار اس انداز میں کرتی ہیں:

''......اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ روایتی انداز کی باتیں کر کے کیا ہم اس صورتِ حال سے چھٹکارا پا سکتے ہیں؟ یعنی پُرانے افکار، پُرانی کسوٹیوں پر متذکرہ بالا مسائل کے حل کی تلاش کتنی اور کس حد تک کارگر ثابت ہو سکتی ہے؟ کیا آج نسائی ادب کی سمت و رفتار کا تعین اور عصرِ حاضر کے چیلنجز کو روایتی اصول و ضوابط اپنے کاندھوں پر جھیل پانے کی قوت رکھتے ہیں؟ آج کے فن پاروں کو ان کی کتنی اور کس حد تک ضرورت ہے یا پھر کچھ نیا ایسا ہو جو معاصر دُنیا کی تبدیلیوں کا عکاس ہونے کے ساتھ ساتھ نباض بھی ہو؟ زندگی کو سمت و رفتار کی فہم بھی عطا کرے اور دورِ حاضرہ کے وسیع عالمی تناظر کے چیلنجز کو قبول کرنے کی ہمت و قوت بھی بخشتا ہو، آج کا نسائی ادب کیا نئی فکر، نئے رجحان اور فن کی نئی اور پیچیدہ تکنیک سے واقفیت اور اس کا استعمال اپنے فن پاروں میں کس طرح اور کس حد تک کر رہا ہے؟ اس تکنیک کا موضوع سے کیا تعلق ہے؟ کیا زندگی کی پیچیدگی نے اس پر اثر ڈالا ہے؟ یا یہ کہ آرٹ پر خوف

غالب کیوں آجاتا ہے؟ نسائی ادب کے زبان و بیان میں مینہ کی پہلی بوند سے پیدا شدہ سوندھی خوشبو، علاقائیت کی کھنک، ثقافت کی ریمپ (Ramp) اورشہری و دیہی زندگی کے Festivals کو حقیقت نگاری کے کون کون سے تقاضوں کے تحت برتا گیا ہے؟ کہیں یہ تقاضے الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا کے اثر سے Create تخیل کی بھینٹ تو نہیں چڑھ گئے کہ جس میں علم تو ہوتا ہے لیکن عمل دخل غائب ہوتا ہے......''

ایضاً۔ص ۴۷

عبارت طویل ضرور ہوگئی ہے مگر جب تک کے پُورا حوالہ موجود نہیں ہو، بات سمجھ میں آتی نہیں ہے۔ اس طویل اقتباسات سے آپ نے اندازہ کیا ہوگا کہ ثروت خان کی فہم اور دانشوری کا پلڑا ان کی ظاہری شخصیت کی طرح وزن اور وقار کا حامل ہے — ثروت صاحبہ کی تحریر سے ہمارا تعارف ''اندھیرا پگ'' (ناول) کے سفر میں ہوا تھا لیکن ان کی شخصیت سے قریب ہونے کا موقع بہار اردو اکادمی پٹنہ کے گذشتہ دو سیمیناروں میں ہوا ہے جو باضابطہ خواتین کو ایک دوسرے سے متعارف کرانے کے لیے ہی منعقد کیا گیا تھا۔ سکریٹری مشتاق احمد نوری نے واقعی یہ ایسا نوری کارنامہ انجام دیا ہے کہ جس کے لیے خواتین کئی جنم تک انہیں دعائیں دیتی رہیں گی — عورت کی دانشوری ہمیشہ سے مشکوک رہی ہے، شاید اسی لیے ایک مرد کی گواہی کے مد مقابل دو عورتوں کی گواہی کو قابل قبول سمجھا گیا ہے۔ خواتین ہمارے سماج میں صنفِ نازک کے نام سے اپنی شناخت کراتی ہیں، اور صنفِ دوم کہلا کر خوش ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر ثروت خان نے نسائی ادب کے سمت و رفتار اور چیلنجز پر ایک بھرپور نظر ڈالی ہے اور عورت کے اِس دبّو پن سے اُس کو باہر لانے کے لئے قلم کو توڑا ہے۔ پھر اندازِ نگارش کا کمال یہ ہے کہ بڑی بڑی باتوں کو نہایت اختصار میں تشبیہہ و استعارے کے اسلوب میں پیش کر گئی ہیں۔ ذیل کی تحریر کو غور سے پڑھیے اور محترمہ کی انشاء نگاری سے لطف لیجیے:

''......لیکن ہمیں! یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ شیر کی خالہ بھی ہوتی ہے اس خالہ کے پاس بہت سی کلائیں ہیں آج کی عورت قلم کار انہیں کی ترجمانی کر رہی ہے اس نے ناہمواری میں بھی ہمواری پیدا کر لی ہے ......آج کی شاعری، افسانوں، ناولوں میں اسکی ترجمانی ہو رہی ہے، حالات اور اس کے تقاضے کیسے بھی ہوں اس نے جان لیا ہے کہ سُدھار تو اُسے ہی کرنا ہے، یہ ہُنر تو اس کے خالق نے اُسے ہی عطا کیا ہے، چاہے اسے ''آدھی دنیا'' کہیے یا دوم درجے کی، چاہے نفسیات کے ماہرین سے تصدیق کروا لیجیے، چاہے میڈیکل سائنس سے۔ عورت پوری دنیا میں پھول کھلانے کے ہی خواب دیکھتی ہے یہاں مرد قلم کاروں سے مقابلہ کی بات ہرگز نہیں ہے، گودوں کے پالوں

سے کیا مقابلہ؟''

ایضاً۔ص ۵۱

اور پھر اسنئ بدر زبیری کے اس شعر کا برمحل استعمال ۔

قابلِ غور رہوں　　　　اب میں کچھ اور رہوں

کے ساتھ محاسبہ کے عمل سے گزرنا اور یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ:

''آج کی قلم کار اس للکار کے ساتھ آگے بڑھنے اور عالمی منظرنامے کو اپنے قلم کی گرفت میں لینے کی قوت سے معمور ہے......ان تمام قلم کاروں کی تحریریں شاہد ہیں کہ آج نسائی ادب احساس محرومیت کے دائروں سے صحرانوردی کرتے کرتے گلستان میں آ گیا ہے، اپنی دنیا اور اپنی کائنات میں۔ لیکن یہ سب کچھ اتنی آسانی سے نہ ملا ہے نہ مل رہا ہے۔ ترقی کے ہر میدان کی طرح ادب کا میدان بھی خواتین کے لیے چیلنج بھرا ثابت ہوا ہے۔''

ایضاً۔ص ۵۰

درج بالا مضمون میں موصوفہ نے تانیثی ادب کے امکانات، آثار و احوال اور تانیثی تشخص کی سمت و رفتار اور چیلنجز کا اختصار میں ہی سہی مگر بہت عمیق مطالعہ پیش کیا ہے۔ موضوع سے متعلق ان کی علمیت، عالمانہ ہے۔ ان کا تنقیدی اسلوب خشک اور تھکا دینے والا نہیں ہے۔ یہاں بوریت اور اضمحلال نہیں، سرسبز اور شاداب تخلیقیت سے کام لیتے ہوئے ثروت صاحبہ نے اپنا انفراد قائم کیا ہے۔ فی الحال تو میں نے موصوفہ کے صرف ایک ہی مضمون سے بحث کی ہے لیکن آپ کی واقفیت کے لیے یہ کہنا چاہوں گی کہ ''شورشِ فکر'' میں صرف کتاب کا نام مجھے پسند نہیں آیا ہے، نام کے علاوہ تمام مضامین، فکر میں شورش بیدار کرنے کی بجائے ایک ایسی سدا بہار کیفیت کا احساس دلاتے ہیں جو خود ان کی شخصیت کا اثر ہے تر و تازہ، بالغ اور باشعور ادبی کردار جو جانِ محفل بننے کی بھرپور صلاحیت کی حامل ہے۔ بعض مضامین کے عنوانات ہی آپ کی توجہ کو پہلی نظر میں اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں۔ جیسے تبدیلیوں کی زد میں معاصر افسانہ، طبقۂ نسواں اور معاصر اردو ناول، محمد حسن کا ناول، غمِ دل وحشتِ دل، ثروت کی کہانی میری زبانی وغیرہ نسائی تنقید کا ایک خوبصورت نمونہ ہے اور مختلف موضوعات پر زیرِ بحث کتاب نیرنگ ساماں تنقیدی و تاثراتی مطالعہ ہے جس میں حکمت بھی ہے، ادبیت بھی اور تنقیدی نقطۂ نگاہ بھی۔ شورشِ فکر کا یہ تنقیدی سفر ہمارے پیشِ نگاہ مسرت سے بصیرت تک کا وہ سفر ہے جہاں راستے میں کانٹے نہیں ہر طرف پھول ہی پھول ہے — اور بقول مصنفہ:

''......عورت پوری دنیا میں پھول کھلانے کے ہی خواب دیکھتی ہے، یہاں مرد قلم کاروں سے مقابلہ کی بات ہرگز نہیں ہے......''

ثروت خان نے عملی تنقید کے ساتھ ساتھ نظریاتی اصول وضوابط کی پیش کش میں بھی دلچسپی دکھائی ہے، اس مجموعۂ مضامین میں بیشتر ایسے مضامین ہیں جو براہِ راست تانیثی موضوعات سے وابستہ ہیں۔ ایک نظر فہرستِ مضامین پر ڈالی جائے تو یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ تانیثی ادب اور عہدِ حاضر کے مسائل پر ان کی نگاہ محض ایک عورت کی نظر نہیں ہے بلکہ اس میں دانشورانہ غور وفکر کا رجحان نمایاں ہے۔ دیباچہ کی شروعات ہی ان الفاظ سے ہوتی ہے کہ:

''......ادبی تنقید کے میدان میں تخلیق کار کا فکری اور نظریاتی نظام ایک روایتی ادبی نقاد سے یکسر علیحدہ ہوتا ہے۔ تخلیق کار اشیاء کو اپنے طور پر جانچتا پرکھتا ہے (یہاں لفظ اشیاء نگارشات کے معنی میں استعمال ہوئے ہیں) اس کی تخلیقی صلاحیت اور تنقیدی شعور مشترکہ طور پر اُس کی فکری بصیرت کی آبیاری کرتے ہیں اور یہی فکری بصیرت کبھی کبھی تخلیق کار کا رُخ تنقید کی طرف موڑ دیتی ہے اور جب وہ تنقید کرتا ہے تو اس کا پیرائیہ بیان بھی تخلیقی نثر کے حُسن سے مُزیّن ہوتا ہے۔'' (حوالہ دیباچہ۔ ص ۷)

یہ صحیح ہے کہ محترمہ کی بنیادی شناخت ایک فکشن نگار کی حیثیت سے ادبی حلقے میں متعین ہو چکی ہے۔ ان کا تنقیدی شعور بھی ساتھ ساتھ فروغ پا رہا ہے۔ فی الحال تنقیدی مضامین کا صرف ایک مجموعہ ۲۴ر مضامین پر مشتمل ۲۰۱۴ء میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی سے منظرِ عام پر آچکا ہے اور عصرِ رواں کے ادبی مزاج و معیار کی تفہیم میں ایک سعی مستحسن کہا جائے گا — اکثر مقامات میں موصوفہ کی تنقید تاثراتی تنقید کی مثال بن گئی ہے۔ اُن کا بے باک لہجہ قاری کو کبھی پسند آتا ہے تو کبھی ناپسند بھی — مثال کے لیے ذیل کی تحریر ملاحظہ کیجیے:

''...... جب اپنی تخلیق کے لیے ایسا جذبہ اُمڑے اور وہ جوس پیدا ہو جو ماں کی چھاتیوں میں بھر آتا ہے، اس جوش کو ماں اپنے آنچل میں چھپالیتی ہے تا کہ کسی کی نظر نہ پڑے، نظر نہ لگے چشم بد دور۔ لیکن جو نقاد فنکار کے اس آنچل کے نیچے پہنچ جاتے ہیں سب کچھ دیکھ لیتے ہیں، محسوس کر لیتے ہیں اور کمال یہ کہ پھر اُسے سب کو بتا بھی دیتے ہیں......''

پشت کی تحریر

ہمارے خیال میں وارث علوی سے محترمہ کو حد درجہ عقیدت تھی، یہ اسی عقیدت اور احترام کا نتیجہ ہے کہ

وہ موصوف کی تنقید کے تخلیقی رموز کی تہہ میں پہنچتے پہنچتے ماں کے آنچل کے اندر جھانکنے کو جذبۂ فخر سے پیش کر رہی ہیں۔حالاں کہ خواتین کو نسائی تنقید میں اس قدر بھی عورت پن کا مظاہرہ زیب نہیں دیتا ہے۔جذباتیت اور عصبیت دونوں ہی اچھی تنقید کے شایانِ شان نہیں ہے۔ثروت خان یقینی طور پر کافی بولڈ عورت ہیں، اکثر مقامات میں حق بولنا اور حق لکھنا بھی معیوب نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔تعجب ہے کہ انہوں نے پشت کی تحریر پر یہ اقتباس پیش کر کے عورت کی نسائیت کو کیوں بے حجاب کر دیا ہے جبکہ یہ اندازِ نگارش بہت عام نہیں ہے، عام طور سے وہ ذہانت سے لبریز جملے لکھتی ہیں، وارث علوی ان کے پسندیدہ ناقد تھے۔اس کتاب کے انتساب میں بھی وارث علوی کا نام شامل ہے—اپنے مضامین سے متعلق یہ آگہی بھی ایک دم درست ہے کہ:

''ان مضامین میں کہیں آپ کو اضطراب نظر آئے گا تو کہیں غم وغصہ، کہیں فکر مندی نظر آئے گی تو کہیں سنجیدہ گفتگو، جو آپ کو میرے درد اور کرب سے قریب کر دے گی۔''

صفحہ 8

ثروت خان کی تنقید کی زبان میں طرحداری اور جمالیاتی حس مضمر ہے اور یہی وہ ہُنر ہے جو تانیثی تنقید میں محترمہ ثروت خان کے وجود کو لائقِ اعتبار بنا رہا ہے۔مجموعی طور پر دورِ حاضر کے نسائی ادب میں تنقید کے میدان میں ہم ایک ایسی خاتون فکشن نگار کو بے باکی اور بے خوفی سے دانشوری کی طرف بڑھتے دیکھ رہے ہیں، جس کی ضرورت اردو ادب کو شدت سے تھی۔

امید ہے ثروت خان جوش کے ساتھ ہوش نہ کھو کر اسی طرح اردو تنقید میں بھی اپنے قلم کے جوہر دکھا کر فہم کو بیدار کرنے کی سعی میں کوشاں رہیں گے۔

راجستھان کا دیدار کرواتا ناول اندھیرا پگ

ڈاکٹر احمد صغیر

''اندھیرا پگ'' ثروت خان کا ناول ہے جو ۲۰۰۵ء میں شائع ہوا۔ اس ناول میں راجستھان کے اعلیٰ طبقے کے حالات زندگی کو اجاگر کیا گیا ہے۔ آج بھی راجستھان میں مردانہ سماج حاوی ہے اور عورت محض جنسی تعلقات بنانے اور بچہ پیدا کرنے کے علاوہ مزید کچھ نہیں سوچ سکتی۔ یہاں تک کہ عورتوں کی تعلیم پر بھی کوئی خاص توجہ نہیں دی جاتی۔ بہت ساری دقیانوسی رسم و رواج آج بھی اس سماج میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ثروت خان نے ''اندھیرا پگ'' میں ان ہی روڑھی وادی اور فرسودہ نظام کے خلاف اعلانِ جنگ کیا ہے۔ ایک عورت جب عورت کے مسائل پر قلم اٹھاتی ہے تو اس کا درد، اسکا کرب، اس کی بے بسی اور مجبوری سب ابھر کر سامنے آجاتی ہے۔ اس ناول میں بھی ایسا ہی ہوا ہے۔ روپ کنور جو رتن سنگھ کی بیٹی ہے حویلی میں رہ کر شوخ، چنچل اور نئے مزاج کی پروردہ ہے۔ کیونکہ اس کی پھوپھی راج کنور جو شہر میں رہتی ہے۔ روپ کنور کی زندگی میں وہ تمام خوبیاں دیکھنا چاہتی ہے جو اس کے باطن میں پوشیدہ ہیں۔

''اندھیرا پگ'' راجستھان کے ایک گاؤں دیش نوک کی کہانی ہے۔ حویلی میں روپ کنور دھیرے دھیرے پروان چڑھتی ہے۔ وہ اکیلی لڑکی ہے جو گاؤں میں تعلیم حاصل کر رہی ہے۔ جبکہ گاؤں والے اس کی مخالفت کر رہے ہیں۔ آگے کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے اس کی پھوپھی اسے شہر لے جانا چاہتی ہے لیکن روپ کنور کا باپ رتن سنگھ اپنی بہن کو سمجھاتا ہے:

''راج آخر تم سمجھتی کیوں نہیں۔ ہمیں یہ سب کرنا پڑے گا ورنہ برادری سے باہر کر دئے جائیں گے۔ ہمارے پیشے پر آنچ آئے گی۔ جمانوں کو کیا منہ دکھائیں گے۔ اس کی پڑھائی کو لے کر پہلے سے ہی قصبہ کے لوگوں کا ورودھ جھیل رہے ہیں۔ لوگ مذاق بنانے لگے ہیں کہ اب اس حویلی کی لگائیاں بھی پنڈت بنیں گی اور تم آگے پڑھوانے کی بات کرتی ہو۔ تمہیں معلوم ہے کہ اس بات پر پنچایت بیٹھ سکتی ہے۔ تم خود سوچو، تم تو بیاہ کر شہر چلی گئیں،

جنوائی سابزنس میں ہیں۔کریا کرم، تنتر منتر ودھیا سے ان کا اب کوئی لینا دینا نہیں رہا......لیکن ہم کہاں جائیں؟ دو بھائی اور ہیں۔ان کی شادی بیاہ بال بچے سبھی کچھ ہیں۔سب سے بڑا ہوں۔'' بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے ...... '' آگا پیچھا تو مجھے ہی دیکھنا ہے نا۔آخر ایک کے پیچھے اتنے ہیں ......'' یہ کہتے کہتے رتن سنگھ بھاری گلے، ڈھیلے کندھے اور بوجھل قدموں سے اپنے کمرہ کی جانب بڑھ گئے۔''

ان باتوں کو سن کر روپ کنور کے جوان خون میں گرمی پیدا ہو جاتی ہے۔اس لئے باپ سے سوال کرتی ہے:

''میں پوچھتی ہوں باپو، آخر کب تک ہم اس سسٹم کی بھینٹ چڑھتے رہیں گے۔یہ تو کمیونسٹوں سے بھی بدتر ہے، ذہن، مشن، وژن سب کا ناش کرنے والا۔ میں ہاڑ مانس کا لوتھڑا نہیں بننا چاہتی، مجھے ادھیکار چاہئے۔آپ نے شاستر پڑھے ہیں کیا آپ نہیں جانتے، سماج نہیں جانتا کہ خود شاستروں کی رچنا استری نے کی ہے۔پھر ہماری کرنی ماتا بھی تو استری ہی تھیں۔باپو میں استری کی اسی کھوئی ہوئی اَستھتی کی تلاش میں ہوں۔''

تمام کوششوں کے باوجود روپ کنور کی شادی کم عمری میں ہو جاتی ہے اور چار مہینوں کے بعد ہی وہ بیوہ بھی ہو جاتی ہے۔ ہندو سماج میں بیوہ کی جو حالت ہے اُسے دیکھ کر کوئی بھی مہذب سماج کانپ جاتا ہے۔ بیوہ کو مکان سے دور ایک الگ کوٹھری میں رکھا جاتا ہے۔کھانا پینا بھی معمولی ملتا ہے۔روپ کنور کو بھی اسی طرح زندگی گذارنی پڑتی ہے اُس کی پھوپھی اور چچا روپ کنور کو سسرال سے لانے جاتے ہیں لیکن سسرال والے کہتے ہیں کہ آماوس کی رات کو ہی روپ کنور کو میکے بھیجا جائے گا۔اور اس اماوس کی رات کو بیوہ کے باہر نکل کر اپنے میکے جانے والی رسم کو ہی ''اندھیرا پگ'' کہتے ہیں۔روپ کنور کی ساس اور راج کنور کی، اس بات پر بحث ہو جاتی ہے۔اُس کی ساس کہتی ہے۔'' کیا خاک سنوں! آپ کی اپنی باتیں اپنے پاس ہی رکھو۔ نئے زمانے کی نئی باتیں ہمیں نہیں سہاتیں۔لو بھلا مجھ سے کہتی ہیں کہ انہوں نے گنجی بڑھیا کو مخاطب کر کے کہا۔روپی کو ہمارے ساتھ بھیج دو، نہ اماوس کی رات، نہ اندھیرا پگ کی رسم، چلیں آئیں دن دہاڑے بیوہ کو لینے، نہ پردہ نہ زردہ، حویلی سے بیوہ باہر جائے گی تو دن کے اجالے میں دس کی نظر اس پر پڑے گی کہ نہیں۔''

بالآخر اماوس کی رات روپ کنور کو اس کے والد اور چچا لے جاتے ہیں۔مائکے آنے کے بعد بھی اسے الگ کمرے میں رکھا جاتا ہے۔یعنی ایک نرک سے نکل کر دوسرے نرک میں آجاتی ہے۔اس لئے روپ کنور اپنی ماں سے کہتی ہے:

''ماں کیا جیون کیول بیاہ تک سیمت ہے؟
ماں، اِستری اُپ بھوگ کی وستو ماتر ہے؟
ماں، کیا جیون کا کوئی اور ادیشیہ نہیں؟
ماں، ہماری پرمپرائیں بلیدان ہی کیوں مانگا کرتی ہیں؟ ہماری سوتنتر تا کو گرہن کیوں لگا دیا جاتا ہے ماں، سماج کی پرمپرائیں، اچھائیں دبانے کے لئے ہی کیوں بنائی جاتی ہیں؟

ماں کیا تم نے سوچا ہے۔ دبائی ہوئی اچھاؤں کے برے پرینام پوری منشیہ جاتی کو بھگتنے پڑتے ہیں۔''

لیکن روپ کنور کی پھوپھی تمام مخالفت کے باوجود اسے شہر اپنے گھر لے کر آ جاتی ہے۔ مقابلہ جاتی امتحان کی تیاری کرواتی ہے۔ اور اس کا داخلہ میڈیکل کالج میں ہو جاتا ہے۔ گاؤں والوں کو یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ روپ کنور کی طبیعت بہت زیادہ خراب ہے۔ اس لئے علاج کے لئے شہر بھیج دیا گیا ہے۔ شہر آ کر روپ کنور کی زندگی میں تبدیلی آ جاتی ہے اور تمام غموں کو بھول کر ایک نئی زندگی کا آغاز کرتی ہے۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ ڈاکٹر بن کر گاؤں والوں کی خدمت کرے لیکن گاؤں والوں کو کسی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ روپ کنور شہر میں تعلیم حاصل کر رہی ہے۔ اس لئے پنچایت رتن سنگھ کو ایک ہفتے کی مہلت دیتی ہے کہ وہ اسے واپس بلا لے۔ رتن سنگھ اور اسکا بھائی، روپ کنور کو لانے شہر جاتے ہیں لیکن رتن سنگھ کی بہن مخالفت کرتی ہے۔ روپ کنور بھی واپس جانے کو قطعی تیار نہیں ہوتی لیکن رتن سنگھ رات میں روپ کنور کو بے ہوش کر کے چپکے سے گاؤں لے کر آ جاتے ہیں اور سرپنچ کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اور پھر سے روپ کنور کی زندگی جہنم بن جاتی ہے۔

ایک اور کہانی حویلی میں جنم لیتی ہے۔ رونی اور دھونی دو نوکرانیاں جو سگی بہنیں ہیں گھر میں کام کرتی ہیں۔ ایک دن جب رونی کسی کام سے رتن سنگھ کے کمرے میں جاتی ہے۔ رانی کو دیکھ کر رتن سنگھ کی جنسی خواہشات جاگ جاتی ہے اور وہ سب کچھ ہو جاتا ہے جو نہیں ہونا چاہئے تھا۔ یہاں تک کہ رتن سنگھ کی بیوی سبھدرا جب رتن سنگھ کے کمرے میں آتی ہے تو دونوں کو دیکھ کر حیرت میں پڑ جاتی ہے۔ سبھدرا بے حد ناراض ہوتی ہے لیکن کہانی میں اس وقت نیا موڑ آتا ہے جب رونی حاملہ ہو جاتی ہے اور یہ بات حویلی میں پھیل جاتی ہے، تب سبھدرا رتن سنگھ کو بلا کر حالات سے واقف کراتی ہے۔ یہ اقتباس ملاحظہ فرمایئے:

''رونی کا چوتھا مہینہ چل رہا ہے۔''

''کیا؟'' رتن سنگھ کو جیسے کرنٹ لگ گیا ہو۔

''ہاں ......وہ آپ کے بچے کی ماں بننے والی ہے۔'' یہ کہتے ہوئے سبھدرا کو لگا کہ یہ زمین پھٹ جائے اور وہ اس میں سما جائے لیکن سوائے خون کا گھونٹ پی کر رہ جانے کے اور کوئی چارہ نہ تھا۔

''ک......ک......ک......یا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔'' بوکھلاہٹ میں وہ ہکلانے لگے۔

''جو کیا ہے اسے بھرو بھگتو......میں کیا جانوں......''

سبھدرا نے تمسخرانہ انداز میں جملہ پھینکا۔

''یہ نہیں ہو سکتا۔''

اچانک رتن سنگھ کا چہرہ سخت ہوتا چلا گیا۔ ''گروا دو بچہ۔''

''مجھے معلوم تھا آپ یہی کہیں گے لیکن اب میں کہتی ہوں اور سنیے۔ بچہ اس سنسار میں جنم لے کر رہے گا۔''

تمہیں معلوم ہے تم کیا کہہ رہی ہو۔'' رتن سنگھ نے حیرت واستعجاب سے کہا۔

''اچھی طرح''۔ بڑے اطمینان سے انہوں نے جواب دیا۔

''لوک لاج، میری عزت، حویلی کی مریادا''۔

''کس لوک لاج، کس عزت، کس مریادا کی بات کر رہے ہیں پنڈت جی۔'' انہوں نے بات کاٹتے ہوئے برسنا شروع کیا۔...... ''یہ سب کہنے کے آپ ادھیکاری نہیں رہے، اُس وقت کہاں گئی تھیں یہ سب باتیں، جب یہ کانڈ کر رہے تھے۔''

سبھدرا کا گلا بھر گیا لیکن بڑی ہمت سے وہ ضبط کر گئیں۔ رتن سنگھ کچھ نرم پڑ گئے لیکن پھر انہوں نے اپنی بات دہرا دی۔ جس پر سبھدرا رانی کو شدید غصہ آ گیا۔

''آپ نے تو زبان اٹھائی، تالو سے ماردی...... بچہ گرادو......کوئی مذاق ہے...... ماں کی جان کو خطرہ ہوتا ہے اس میں۔''

''خطرہ......خطرے کا آبھاس تو مجھے ہو رہا ہے۔ تمہارے فیصلے پر۔ کیوں اس دو کوڑی کی استری پر تمہارا لاڈ ٹپک رہا ہے۔ مر جانے دو دونوں کو۔''

اور وہی ہوا جو ہمیشہ سے مردانہ سماج میں ہوتا رہا ہے۔ روپّی کو مار کر باؤڑی میں دفن کر دیا گیا۔ اور روپّی کا قصہ یہیں ختم ہو گیا لیکن جب روپ کنور واپس آتی ہے۔ روپّی کے بارے میں معلومات فراہم کرتی ہے تو روپّی کی بہن دھوپّی سب کچھ بتا دیتی ہے کہ حویلی میں کیا ہوا۔ کیونکہ دھونی روپ کنور کے ساتھ اس کے کمرے میں سوتی تھی

اور تب روپ کنور ایک نئے روپ میں سامنے آتی ہے اور باپ کے خلاف محاذ کھول دیتی ہے۔

''ماں یہ گھور انیائے ہے۔آپ سب کورے آدرش وادی بنتے ہیں۔ میں جان گئی ہوں کہ اولاد تک کو جھوٹی شان کے لئے داؤ پر لگانے والے خود اندر سے کتنے کھوکھلے ہیں۔ بڑے بڑے کانڈ کریں اور شرافت کا سوانگ اس کلاکاری سے بھریں کہ جیسے اس سے بڑا پرماتما کوئی اور ہوگا ہی نہیں۔ ایسے لوگوں کی تو انتر آتما بھی نہیں ہوتی......دھکار ہے مجھ پر جو ایسے ماتا پتا کے گھر جنم لیا۔ پرسن لو ماں، میرا تو اب تک تم لوگوں نے جو حال کیا وہ کیا پر اس کیس میں میں تمہاری طرح چپ بیٹھنے والی نہیں ہوں۔ ایسے ڈھونگیوں کو تو سزا دلوا کر رہوں گی۔''

روپ کنور، دھونی اور راجکمار کی مدد سے یہ ساری باتیں پولس تک پہنچا دیتی ہے۔ پولس رات میں ہی حویلی پہنچ جاتی ہے اور باؤڑی کی کھدائی کی جاتی ہے۔ جہاں سے کئی عورتوں کے کنکال ملتے ہیں جو سونے کے زیور پہنے تھے اور رونی کی لاش بھی برآمد ہو جاتی ہے۔ پولس کاغذی کارروائی شروع کرتی ہے اسی درمیان سبھدرا دو تین کلو سونے کے زیورات انسپکٹر کے قدموں میں لا کر رکھ دیتی ہے اور لالچ میں آ کر پولس آفیسر معاملہ کو وہیں رفع دفع کر دیتا ہے۔لیکن ناول کا اختتام اس پر ہوتا ہے کہ روپ کنور دھونی کا ہاتھ پکڑے حویلی کا پھاٹک لانگھ کر آگے بڑھ جاتی ہے۔ کسی کی ہمت نہیں ہوتی کہ اُسے روکے۔ سبھدرا روکنا چاہتی ہے تو شوہر اور سسر انگلی کے اشارے سے منع کر دیتے ہیں۔''اسے جانے دو، جو ہوگا اس کا ڈٹ کر سامنا کریں گے۔''

ناول یہاں ختم ہو جاتا ہے لیکن ایک انقلاب چھوڑ جاتا ہے۔ ایک جنگ کی شروعات یہاں سے ہوتی ہے۔ ظاہر ہے روپ کنور کے چلے جانے کے بعد سرپنچ رتن سنگھ اور اس کے پریوار کے لئے نہ جانے کون سی سزا تجویز کرے اور رتن سنگھ اور اس کے پریوار کے لوگ اس سزا کے خلاف کون سا اقدام کریں گے؟ یہ ایک سوال ہے۔ اگر یہی مقابلہ رتن سنگھ اس وقت کرتے جب روپ کنور کو واپس لانے کی بات ہو رہی تھی تو رتن سنگھ کا کردار کھل کر سامنے آتا لیکن وہ اپنے سماج اور بنائے ہوئے غلط اصولوں کی پیروی کرتے نظر آتے ہیں۔ رتن سنگھ کا کردار دہرا ہے۔ ایک طرف وہ سماج کے غلط اصولوں کے پابند نظر آتے ہیں تو دوسری طرف ایک نوکرانی کے ساتھ جنسی تعلقات قائم کرتے ہیں اور جب وہ حاملہ ہو جاتی ہے تو اسے مار کر باؤڑی میں دفن کروا دیتے ہیں۔

''اندھیرا یگ'' میں دو کردار بے حد اہم ہیں۔ راج کنور اور روپ کنور۔ جو احتجاج کی بلند آواز بن کر ابھرتی ہیں۔ مردانہ سماج سے ٹکر لینا کوئی معمولی بات نہیں لیکن راج کنور اپنی بھتیجی میں وہ سب دیکھ رہی تھی جو حویلی کی دوسری عورتوں کے اندر نہیں تھا بلکہ یہ کہا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا جو کام راج کنور نہیں کر سکی تھی یعنی اعلیٰ تعلیم

حاصل نہیں کرسکی تھی۔ وہ کام اپنی بھتیجی کے ذریعہ کرنا چاہتی ہے۔ راج کنور کا کردار اس معنی میں بہت اہم ہو جاتا ہے کہ اس نے احتجاج کی نیوڈالی اور روپ کنور نے اس پر عمارت کھڑی کردی اگر راج کنور احتجاج کی آواز نہیں بنتی تو روپ کنور بھی اسی فرسودہ سماج کا حصہ بن کر سسک سسک کر اپنی زندگی گزارتی اور ایک دن بند کمرے میں اس کی موت ہو جاتی۔ ان دونوں کرداروں نے فرسودہ نظام کے خلاف جو احتجاج بلند کیا ہے۔ وہ ایک مشعل کی طرح ہے کہ یہ مشعل اس گاؤں کی دوسری لڑکیوں کے ہاتھوں میں بھی نظر آ سکتا ہے۔

ثروت خان نے اس ناول کو راجستھان کے کلچر کو سامنے رکھ کر لکھا ہے اور سارا منظر علاقائی نقطۂ نگاہ سے پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے، کچھ الفاظ ایسے ہیں جو اردو میں شاید پہلی بار آئے ہیں۔ 'انوٹھی'، 'گوٹھ'، 'لوگڑی'، 'کنڈ' وغیرہ۔ ان سب الفاظ کے راجستھانی معنی ہیں جسے سمجھنے کے لئے وہاں کی ثقافت کو سمجھنا ضروری ہے۔ بہت سارے جملے راجستھانی ہیں جسے پہلی بار کسی ناول میں استعمال کیا گیا ہے لیکن مصنفہ نے اس کے ساتھ اردو میں بھی لکھ دیا ہے تا کہ جملہ سمجھ میں آ جائے۔

یہ حقیقت ہے کہ علاقائیت ہی آفاقیت کا درجہ حاصل کرتی ہے۔ یہ ناول بڑا کینوس رکھتا ہے۔ جس میں راجستھان کی پوری ثقافت، 'رہن سہن'، طور طریقے، فرسودہ نظام'، 'دہرا کردار' عورتوں کے حالات ابھر کر سامنے آئے ہیں۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک اہم ناول ہے۔

بشیر بدر کی غزلوں میں معنی کی طلسم کشائی

پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی

بشیر بدر تخلیقیت شناس شاعر ہیں وہ محتاط اور سنجیدہ سائنسی ذہن رکھتے ہیں اسی لئے ان کی غزلوں میں بھرپور اعتماد ملتا ہے۔ انہوں نے الفاظ کے موتی کے ذریعہ مشاہدے اور تجربے کر فن کا ہنر عطا کیا ہے۔

مشاہدے اور تجربات کی تصدیق جو اس خمسہ کی مدد سے ہوسکتی ہے، مگر کچھ Assertions ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی تصدیق اس کے ذریعے سے نہیں ہوسکتی۔ اگر لا تعداد مشاہدات ان حقائق کو سہارا دیتے ہیں تو ان مشاہدات کی توجیہات ایک دوسرے سے مختلف ہوسکتی ہیں کیوں کہ ان کا انحصار اس بات پر ہے کہ توجیہ کرنے والا کون ہے۔ ایک فنکار اس حقیقت میں اس لئے یقین رکھتا ہے کہ یہ اس کا ذاتی تجربہ ہے۔ یا وہ اس کے مزاج اور اس کی طبیعت کے موافق ہے جو شئے اسے دوسروں سے الگ کرتی ہے وہ اکساتی ہے کہ اس حقیقت کو تسلیم کرے۔ مگر دوسرا فنکار اسے رد کردے گا محض اس بنیاد پر کہ اس کا پس منظر مزاج اور طبیعت پہلے فنکار سے مختلف ہے۔ چنانچہ جب بھی کسی کلیے کی قدر و قیمت کا اندازہ کیا جاتا ہے تو یہ ذہن میں رکھنا ہوتا ہے کہ انفرادی پسند اور نا پسند سے سمجھنے اور تجربے کی توجیہہ کرنے میں کس حد تک کارفرما ہیں۔ یہ انفرادی پسند و ناپسند دراصل خارجیت اور داخلیت ہیں جس طرح تعبیر (Denotation) اور تضمین (Cannotation) میں کوئی واضح درفاصل نہیں ہے اسی طرح خارجیت کے میدان اور داخلیت کی سرزمین کے درمیان بھی خط کھینچنا مشکل ہے۔ مثال کے طور پر بشیر بدر کی غزلوں کو لیتے ہیں، بعض پڑھنے والے اسے اچھا کہیں گے۔ بعض ناپسند کریں گے اور بعض لغو کہہ سکتے ہیں۔ آراء کا ایک جیسا ہونا مشکل ہے کیوں کہ کلام کا معیار کم و بیش ذاتی معیار ہیں۔ مگر اس کے باوجود ایک ناقد یہ حکم لگا سکتا ہے کہ کلام کیسا ہے اور اس کا فیصلہ اس سلسلے میں حتمی ہوگا۔ یہ اس لئے کہ ناقد کلام کے نظام

کی ایک خاص پیائش رکھتا ہے۔ کلام کے جانچنے کا ایک خاص معیار اپنا تا ہے جس سے کسی نتیجے پر پہنچا جا تا ہے۔ پھر جو بھی اس معیاری نظام کو تسلیم کرے گا وہ اس سے اختلاف نہیں کرسکتا۔ دوسرے لفظوں میں حقیقت کی پیائش کے لئے کوئی متقصہ آلہ موجود نہیں ہے۔ چنانچہ کوئی معروضی حقیقت بھی موجود نہیں ہے۔ جو کچھ فرد اپنے طور پر جانچتا ہے وہ اس کے ذاتی معیار پر مبنی ہے۔ وہ بہرصورت داخلی ہے۔ یہ داخلیت پسندی دراصل تخلیقیت شناسی ہے جس سے قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا ہے اور زندگی کے مختلف پہلو کو دیکھنے کا موقع فراہم ہوتا ہے۔ کسی ایسے شخص کی نظر سے جو فنکار ہے اور جسے نہ صرف واردات بلکہ واردات کا اعادہ اور اسے دوسروں تک پہنچانے کی خصوصیت ودیعت ہوتی ہے۔

بشیر بدر ایسے ہی تخلیقیت شناس شاعر ہیں ان کی غزلوں کے واسطے سے خارجیت یا مصروفیت کا کوئی جواز نہیں ملتا البتہ ان کے باطن کا اظہار ملتا ہے جو ہر پڑھنے والے کے اندروں کی آواز اور اپنی ہی کیفیت معلوم ہوتی ہے۔ ایسی خوبی ہر شاعر میں نہیں ہوتی ہے۔ مطالعے اور تجربے سے شاعری کرنے کا انداز جداگانہ ہوتا ہے اسی لئے ہر شاعر عظیم نہیں ہوتا۔ بشیر بدر کی عظمت اس میں ہے کہ وہ حساس اور تجزیاتی نظر رکھتے ہیں اور جو کچھ کہتے ہیں اس کہنے میں جواز پوشیدہ ہوتا ہے۔

کوئی پھول دھوپ کی پتیوں میں ہرے ربن سے بندھا ہوا
یہ غزل کا لہجہ نیا نیا، نہ کہا ہوا، نہ سنا ہوا
اک سمندر کے پیاسے کنارے تھے ہم، اپنا پیغام لاتی تھی موج ہوا
آج دو ریل کی پٹریوں کی طرح ساتھ چلنا ہے اور بولنا تک نہیں
گرم کپڑوں کا صندوق مت کھولنا ورنہ یادوں کی کافور جیسی مہک
خون میں آگ بن کر اتر جائیگی، صبح تک یہ مکاں خاک ہو جائے گا
ان میں ایک بھی بیل ایسی نہیں جو دیہاتی پرندے کے پر باندھ لے
جنگلی آم کی جان لیوا مہک جب بلائے گی واپس چلا جائے گا
یہاں لباس کی قیمت ہے آدمی کی نہیں
مجھے گلاس بڑا دے شراب کم کردے

تخلیقیت شناس غزلوں کے یہ اشعار تخلیقی عمل اور تخلیقی آگ کی روشنی رکھتے ہیں۔ داخلی

احساسات کے اظہار کے لئے خارجی وسائل کا استعمال بشیر بدر اس طرح کرتے ہیں۔

لب ترستے رہے اک ہنسی کے لئے
میری کشتی مسافر سے خالی رہی

تم ابھی شہر میں کیا نئے آئے ہو
رک گئے راہ میں حادثہ دیکھ کر

انسان کی بے حسی اور قانون کی مجبوری کو تخلیقیت شناس بنا کر بشیر بدر نے جو تغزل پیدا کیا ہے اس میں عصری حسیت بیحد نمایاں ہے۔ انہوں نے فطرت سے بھی لطف اندوز ہونے والی نظر پائی ہے۔ مسکراتی سحر، چہچہاتا ہوا دلفریب آفتاب، نرم ٹھنڈی ٹھنڈی چاندنی، مست و بے نور کر دینے والی معطر ہواؤں، نیلگوں آسمان کی بے کراں وسعتوں اور کھیتوں سے اٹھتی ہوئی سوندھی سوندھی خوشبو سے اپنی انفرادیت برقرار رکھی ہے۔ لیکن ان کا لہجہ اور ان کی آواز بالکل مختلف ہے :

سبز پتے دھوپ کی یہ آگ جب پی جائیں گے
اجلے فر کے کوٹ پہنے ہلکے جاڑے آئیں گے

خوش رنگ پرندوں کے لوٹ آنے کے دن آئے
بچھڑے ہوئے ملتے ہیں جب برف پگھلتی ہے

ہلکی ہلکی بارشیں ہوتی رہیں
ہم بھی پھولوں کی طرح مہکا کریں

بشیر بدر نے شاعری کو مہذب لہجے میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ فکر معتدل کے ساتھ لب ولہجہ کے نئے پن نے دوآتشہ کا کام کیا ہے۔ ان کی غزلوں کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں صرف شاعرانہ کیفیت کا تجربہ نہیں ملتا بلکہ دوسروں کے اندر شاعرانہ کیفیت پیدا کرنے کی خوبی بھی ملتی ہے۔

میں نے روکا نہیں وہ چلا بھی گیا
بے بسی دور تک دیکھتی رہ گئی

دعا آنسوؤں میں کھلا پھول ہے
کسی کے لئے بددعا مت کرو

ضعیف بوڑھی جو پل پر اداس بیٹھی ہے
اسی کی آنکھ میں لکھا ہے زندگی ہوں میں

جذبوں کے لطیف تر پہلو صرف استعاروں کے ذریعے ظاہر کئے جاسکتے ہیں اور استعارے کسی بڑے نقشے کے کٹے ہوئے ٹکڑے نہیں ہوتے کہ انہیں ایک دوسرے سے جوڑ کر نقشہ نئے سرے سے بنا دیا جائے۔ بشیر بدر کی غزلوں میں جو تجربہ مجسم نظر آتا ہے اس میں ان کی تحقیق و تفتیش اور سالمیت ملتی ہے جن پر وہ ایک ہیئت عائد کرتے ہیں، یہ تجربہ ایسا ہوتا ہے کہ اس کا ابلاغ بہت حد تک ممکن ہوتا ہے۔ لیکن بینادی طور پر وہ ایک مبلغ یا شارح نہیں بلکہ ایک صانع ہیں :

آنکھ موندے اس گلابی دھوپ میں
دیر تک بیٹھے اسے سوچا کریں
دیکھا تجھے، سوچا تجھے، چاہا تجھے، پوجا تجھے
میری خطا، میری وفا، تیری خطا کچھ بھی نہیں

بشیر بدر شعوری اور غیر شعوری طور پر وجود میں فلسفہ سے متاثر نظر آتے ہیں، دراصل ہر انسان بے نظیر (Unique) ہوتا ہے اور کسی نہ کسی بات میں وہ ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ قوانین مسلمہ قواعد اور مفروضات اس کے مسائل کا حل نہیں ہوتے اور نہ یہ بات تجرید نظر و فکر یا عقلیت سے سمجھی جاسکتی ہے۔ ہر انسان اپنی ذات میں ڈوب کر اپنے طور پر سچائی پا سکتا ہے اپنی ذات سے الگ ہو کر سچائی نہیں پا سکتا۔ لیکن انسان کی زندگی میں ایک خلا ضرور رہتا ہے۔ بشیر بدر کی زندگی میں بھی خلا ہے۔ خواہ بیوی کی جدائی کی وجہ سے ہو یا کسی اور وجہ سے :

میری چھت سے رات کی سیج تک کوئی آنسوؤں کی لکیر ہے
ذرا پڑھ کے چاند سے پوچھنا وہ اس طرف سے گیا نہ ہو
یہ کسک دل کی دل میں چبھی رہ گئی
زندگی میں تمہاری کمی رہ گئی
دل میں سوز غم ہیں تری یاد ہے تنہا تنہا
ایک اجلی سی پری پھرتی ہے بیماروں میں

اس حویلی میں اب کوئی رہتا نہیں
چاند نکلا کسے دیکھنے کے لئے

تیرے بدن پر میں پھولوں سے اس لمحے کا نام لکھوں
جس لمحے کا میں افسانہ، تو بھی ایک کہانی ہے

شاعر اپنی رستگاری کا خود ذمہ دار ہوتا ہے۔اس کا جوہر اس کا تابع ہوتا ہے۔اپنی پسند اور عمل کے لئے وہ ایک ادارہ کی حیثیت رکھتا ہے۔اس کی خواہش اس کی واحد ذات تک محدود نہیں بلکہ معاشرے کا ہر فرد اس سے متاثر ہوتا ہے، اس لئے اس پر ذمہ داری کچھ زیادہ ہی عائد ہوتی ہے۔جو کچھ وہ اپنے لئے یا دوسروں کے لئے کرتا ہے اس کی ذمہ داری اس پر ہوتی ہے، دوسروں کے لئے اچھائی کئے بغیر اپنے لئے اچھائی نہیں ہوتی اور وہ اپنے عمل کے معاملے میں بالکل آزاد ہوتا ہے۔خارجی عوامل اور محرکات اس کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنتے۔بشیر بدر بھی ایسی ہی کیفیت کے شاعر ہیں۔ان کی نظر میں ہر انسان ایک جزیرہ ہے۔ساتھ ہی ساتھ تخلیق کا سرچشمہ بھی ہے۔اسی لئے وہ شخصی میلان اور انفرادی رجحان کی طرف توجہ کرتے ہیں۔اور ادب کو زندگی کا آئینہ ہی نہیں سمجھتے بلکہ انسان کے وجود کو ثابت کرنے کا وسیلہ مقرر کرتے ہیں۔دراصل اسی میں ان کی تخلیقیت شناسی پوشیدہ ہے :

گرمیوں میں اس کے گیسو سائباں در سائباں
سردیوں میں اس بدن کو دھوپ کا دریا کہیں

اسی احتیاط میں وہ رہا، اسی احتیاط میں میں رہا
وہ کہاں کہاں میرے ساتھ ہے کسی اور کو یہ پتہ نہ ہو

اس کی بھی مجبوریاں ہیں میری بھی مجبوریاں
روز ملتے ہیں مگر گھر میں بتا سکتے نہیں

اپنے دکھ سکھ بہت خوبصورت رہے
ہم جئے بھی تو اک دوسرے کے لئے

شہر میں اب مرا کوئی دشمن نہیں
سب کو اپنا لیا میں نے تیرے لئے

جدید افکار میں بشیر بدر کا تازہ اور بالکل ہی نیا اپروچ رہا ہے۔ اور اس اپروچ سے انہوں نے اہم کام یہ کیا ہے کہ انسان کی فطرت اور اس کے رشتے کے درمیان ربط ہم آہنگی اور توازن قائم کرنے کی سعی کی ہے :

مری آنکھوں میں آنسو کی طرح اک رات آجاؤ
تکلف سے، بناوٹ سے، ادا سے چوٹ لگتی ہے
دل ، محبت ، دین، دنیا ، شاعری
ہر دریچے سے تجھے دیکھا کریں

آرزومندی انسان کا جبلی تقاضہ ہے۔ اس کا المیہ یہ ہے کہ ہزاروں خواہش ایسی ہوتی ہیں جن کے اظہار کی انسان میں سماجی ضابطوں کے خوف سے ہمت یا جن کی تکمیل اپنی بے بضاعتی کے سبب قدرت نہیں ہوتی، نہیں ان کا بیان جب کوئی شاعر کرتا ہے تو یک گونہ تسکین حاصل ہوتی ہے۔ شاعری کی طرح خواب بھی انہیں نا آسودہ خواہشات کی وقتی تسکین کا وسیلہ ہوتے ہیں۔ بشیر بدر کا کارنامہ یہ ہے کہ وہ تحت الشعور کے پردوں میں چھپی تمناؤں کو اشعار میں بے نقاب کر دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلوں میں نا آسودہ خواہشات کی جھلک دکھائی دیتی ہے اور پڑھنے والا بے اختیار تڑپ اٹھتا ہے :

بچپن سے میری عادت ہے پھول چھپا کے رکھتا ہوں
ہاتھوں میں جلتا سورج ہے دل میں رات کی رانی ہے
سوچا نہیں اچھا برا دیکھا سنا کچھ بھی نہیں
مانگا خدا سے رات دن تیرے سوا کچھ بھی نہیں
مرے بازوؤں میں تھکی تھکی ابھی محو خواب ہے چاندنی
نہ اٹھے ستاروں کی پالکی ابھی آہٹوں کا گذر نہ ہو
جی بہت چاہتا ہے سچ بولیں
کیا کریں حوصلہ نہیں ہوتا

بشیر بدر کی غزلوں کے لہجے میں نیا پن اور آگہی آج کی زندگی سے آتی ہے۔ آج کی یہ نئی زندگی ،اختراعات ایجادات ، ہلچل اور تیز گامی کے موجودات ہیں جن میں نئے احساسات ہیں اور بدلتی ہوئی

صورتوں کے نقشے میں فی زمانہ زندگی میں جو Obscurity ملتی ہے اس نے تنہائی اور خودنگری کا مزاج پیدا کیا ہے جس سے بشیر بدر بھی الگ نہیں رہے ہیں۔ ان کے امیجز میں تحریری صورتیں اندرون کو اظہار کا ایک راستہ دکھاتی ہیں جو محسوس سات تک جاتا ہے اور اس خودنگری اور تنہائی کے احساسات کو کانکریٹ بنانے کی کوشش کرتا ہے :

ایک ، ٹہنی دھند کی یلغار کو سہتی ہوئی
شاخ کی بانہوں میں گر کر جاودانی ہوگئی
ایک لڑکی اک لڑکے کے کاندھے پہ سوئی تھی
میں اجلی دھندلی یادوں کے کہرے میں کھو گیا
کوئی عشق ہے کہ اکیلا ریت کی شال اوڑھ کے چل دیا
کبھی بال بچوں کے ساتھ آ، یہ پڑاؤ لگتا ہے رات میں
وہ فراق ہو کہ وصال ہو تری آگ مہکے گی ایک دن
وہ گلاب بن کے کھلے گا کیا جو چراغ بن کے جلا نہ ہو

اسی سلسلے کا ایک شعر ہے :

سناٹے کی شاخوں پر کچھ زخمی پرندے ہیں
خاموشی بذات خود آواز کا صحرا ہے

درج بالا شعر میں وجود ہی اور جمالیاتی تناظر تلاش کرتے ہوئے نظام صدیقی لکھتے ہیں کہ ''سناٹے کی شاخ زخمی پرندے'' اور ''آواز کا صحرا'' جیسے پر تضاد اور پیچیدگی کے حامل بصری اور سماعی پیکروں کے فنی دروبست سے آج کی آدمی کے داخلی اور خارجی احوال کے ''حشر آگیں'' کرب سکوت کا بیک وقت انفرادی اور اجتماعی تصور ذہن میں ابھرتا ہے جو ایک تہذیبی بحران کا علامیہ ہے۔ آج کا پورا تہذیبی فزاپہ بشیر بدر کے اس مکمل اور بھرپور شعر میں قلمبند ہے، اس محشر بدوش خاموشی کی اتنی تخلیقی طرفگی اور جمالیاتی نادرہ کاری سے تصویر آفرینی انتہائی دل نشیں جاذب نظر اور فکر انگیز ہے جو ان کے غیر معمولی احساس اور شعلہ آسا تخیل، گداز قلب، شعور عصر اور ریاض فن کا ترجمان ہے جس کی وجہ سے یہ روحانی زلزلہ پیا خاموشی اور لازوال آرٹ میں ڈھل گیا ہے۔ جہاں آواز کی سسکی، سرگوشی اور چپ چاپ سناٹا باہم دگر

جمالیاتی استغراق کی کیفیت میں ہم آغوش ہیں۔

بشیر بدر کا ایک شعر ہے:

چاند ہاتھ میں بھر کر، جگنوؤں کے سر کاٹو اور آگ پر رکھ دو

موم بتی کی رانیں جب بلیڈ سے کھل جائیں چاقوؤں کے سر رکھ دو

اس شعر کو جنسی نفسیات کے موضوع پر منطبق کیا جاتا ہے۔ حالانکہ اس طرح کے اشعار کسی مسئلہ کا روعمل ہوتے ہیں، بشیر بدر کے اس شعر سے ایک فنکار کے خلوص کا اندازہ ہوتا ہے کہ کس درجہ حقیقت کی ترجمانی کی گئی ہے، جبکہ یہ شعر جنسی لذت کوشی کے لئے نہیں کہا گیا ہے۔ بشیر بدر نے اس کی تشریح کرتے ہوئے ایک انٹرویو میں بتایا تھا کہ یہ شعر دراصل ایک Short Story پر مبنی ہے، اس کا ایک کردار اپنے ساتھیوں سے وہی سب کچھ کہتا ہے جو اس شعر میں کہا گیا ہے۔ یعنی یہ شعر فساد پر ہے۔ اس میں پردہ نشیں عورتوں کے عفت مآب جذبے سے لے کر بدن کی پہلی اور مومیاتی رنگت کو پیش نظر رکھتے ہوئے فسادیوں کے ایک کردار سے کہلوایا گیا ہے کہ اگر یہ عورتیں Rape کے خلاف احتجاج کریں تو ان کے جسم کے چاند کو نو چا جائے۔ جگنوؤں یعنی ان کے بچوں کے سر کاٹ کر آگ پر رکھ دیئے جائیں، رانوں پر بلیڈ لگائے جائیں اور چاقوؤں کے زور پر ان کی عصمت لوٹی جائے۔

بشیر بدر کی غزلوں میں عصری حسیت کی جستجو اور دریافت، ایک اہم اور بامعنی عمل کی صورت میں سامنے آتی ہے لیکن ان میں طنز کے نشتر چھبے ملتے ہیں:

کوئی ہاتھ بھی نہ ملائے گا جو گلے ملو گے تپاک سے

یہ نئے مزاج کا شہر ہے ذرا فاصلے سے ملا کرو

دشمنی جم کر کرو، لیکن گنجائش رہے

جب کبھی ہم دوست ہوجائیں تو شرمندہ نہ ہوں

غرور اس پہ بہت سجتا ہے مگر کہہ دو

اس میں اس کا بھلا ہے غرو کم کردے

رات کا انتظار کون کرے

آج کل دن میں کیا نہیں ہوتا

آج دنیا جس افرا اور تفریح میں گھری ہوئی ہے اس سے یہ قوی امکان ہے کہ تمام مذاہب اور تہذیبیں اپنی قدریں کھو دیں گی اور بے راہ روی کی فاحشہ مچھلی ہر جگہ حکمراں ہوگی۔ اس واضح مستقبل کی عکاسی بشیر بدر نے یوں کی ہے :

سمندر سوکھ جائیں گے اور اک فاحشہ مچھلی
ہمارے ساحلوں اور جنگلوں کی حکمراں ہوگی

بشیر بدر کی غزلوں کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ عصری مسائل کتنے ہی کرخت ہوں اور چاہے کسی بھی نوعیت کے ہوں، وہ جمالیاتی لباس میں خوش اسلوبی سے ڈھالے ہوئے ملتے ہیں :

ڈالی گلاب کی میرے سینے سے آلگی
جھٹکے کے ساتھ کار کا رکنا غضب ہوا

سناٹے آئے ، دریچوں میں جھانکا ، چلے گئے
گرمی کی چھٹیاں تھیں وہاں کوئی نہ تھا

کوئی موسم ہو دن گئے بہاروں کے پھر سے لوٹ آئیں گے
ایک پھول کی پتی اپنے ہونٹ پر رکھ میرے ہونٹ پر رکھ دو

بید کے زرد موںڈھے پہ بیٹھی ہوئی شام نے اٹھ کے بتی جلائی نہیں
روشنی کا فرشتہ بڑی دیر تک دستکیں دے کے واپس چلا بھی گیا

اگر جغرافیائی زبان استعمال کی جائے تو بشیر بدر کی غزلیں پہاڑ اور وادیاں ہیں ان ہی پہاڑوں کے درمیان Delaware جنم لیتا ہے جو صاف شفاف جھیلوں میں سے اور اس علاقے کے ہزاروں چشموں سے نکلتا ہوا۔ وادی کے بہت موڑ کاٹتا ہوا۔ چھوٹی چھوٹی ندیوں کو ساتھ ملاتا ہوا عظیم ترین دریاؤں میں سے ایک بن جاتا ہے۔ پہاڑیاں اپنی چوٹیوں پر ہری بھری اور زرخیز ہیں۔ اگرچہ اس علاقے کی چوٹیوں میں چٹانوں کی بھی کمی نہیں اور یہ سبھی کچھ مل ملا کر اس علاقے کو وہ رومانوی تصویری کردار عطا کرتا ہے جو شدت سے دلوں کو مسحور کرنے والا ہے، درے کہیں کہیں تنگ مگر خوبصورت اور ہرے بھرے ہیں۔ ان میں سے کوئی چھوٹی سی ندی گھومتی ہوئی گزرتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی جھیلوں کے کناروں پر حسین اور زندگی سے بھرپور گاؤں آباد ہیں یا آبادی ندیوں کے کنارے ان مقامات پر ہے جو صنعتی پیداوار کے لئے موزوں

ہیں۔صاف ستھرے ہیں اور کھیت آسانی سے فصل دینے والے ہیں اور ان کی زمین سونا اگلتی نظر آتی ہے۔ اور دلکش مناظر وادی میں جا بجا نظر آتے ہیں:

یہ پتھروں کا ہے جنگل چلوں یہاں سے چلیں
ہمارے پاس تو گیلی زمیں کے پودے ہیں
لکڑیوں سے تراشی ہوئی لڑکیاں، ٹین کے نوجواں مختلف رنگ میں
دوست ہیں دوستی سے مگر بے خبر دشمن جاں ہیں لیکن خفا تک نہیں
وہ فرشتے آپ تلاش کریئے کہانیوں کی کتاب میں
جو برا کہیں نہ برا سنیں کوئی شخص ان سے خفا نہ ہو
ملک تقسیم ہوئے دل تو سلامت ہیں ابھی
کھڑکیاں ہم نے کھلی رکھی ہیں دیواروں میں
زمین ماں بھی ہے، محبوب بھی ہے، بیٹی بھی
زمین چھوڑ کے جاؤں کوئی سوال نہیں

بشیر بدر کی غزلیہ شاعری نظام صدیقی کے لکھنے کے مطابق اپنے دور کی روح میں گھومتا ہوا آئینہ ہے جس میں ان کی باطنیت کی وسعت اور ہمہ گیری اپنی پوری تابانیوں کے ساتھ جلوہ افروز ہے۔انہوں نے عظیم غزلیہ ادب کے زندہ، تابندہ اور پائندہ روایات سے انتخابی رویے کے ساتھ روحانی فیضان حاصل کرتے ہوئے اپنے زمانے کے تمام تہذیبی، سیاسی، سماجی اور فکری تبدیلیوں کے اثرات قبول کئے اور نئے دور کے نئے موضوعات مسائل افکار اور تناظر سے اپنی گہری حسّی وجدانی جذباتی اور فکری وابستگی کو ایک ایسا انوکھا اور دلکش شعری پیکر عطا کیا جو خود اپنی خوبیوں، خامیوں اور ان کے مقلدین کی بدترین ذہنی تناتخی گردشوں کے باوجود اردو کی غزلیہ ادب کی تواریخ کا ایک نیا اور منفرد باب ہے اور اپنی پیش رو غزل کا اگلا قدم بھی ہے۔

بشیر بدر کی غزل ان کے اپنے باطن کے کرب و درد میں ڈوبی ہوئی نہایت شائستہ آواز ہے جو خود نگر اور خودگر ہونے کے ساتھ ہمہ گیر مقصدی کردار کی حامل ہے اور بیک وقت ادبی اشرافیہ اور پرولتاریہ کے ذہنوں میں صدیوں تک گونجنے کی غنائی کیفیت سے مملو ہے۔انہوں نے غیر بالیدہ اور روایتی مقصد

بردار ترقی پسند اور فیشن گزیدہ جدیدیت پرست غزلیہ فکر خیال اور احساس کو برسوں کی فرسودہ عادت، بیجا تکرار، منصوبہ بند موضوعات، مقررہ لفظیات، بنے بتائے راستوں، گھسے پٹے محاورات، استعارے، علامات اور پیکر کی گہری گھاٹیوں سے نکال کر لمحہ سائنسی عہد کی مشینی زندگی کی گونا گوں پیچیدگیوں، متضاد کیفیتوں، خوش رنگ امیدوں، شدید محرومیوں، خدشوں اور نئے تقاضوں سے عہدہ براہونے کا غیر محسوس طور پر حوصلہ بخشتا ہے۔

بشیر بدر کی تخلیقیت شناس غزلوں میں الفاظ کی اصوات، ان کی رفتار، ان کا سلسلہ اتلافات، افکار کا رابطہ، زمانی، تمثالوں کی خیال افروزی، فرضی باتوں میں حقیقت کی جھلکیاں، آشنا حقیقتوں میں افسانوں کی سی دلچسپاں، کسی کلیدی لفظ یا ترتیب کے ذریعہ ایک پوری کیفیت کے معنوی کی طلسم کشائی اور ان سب سے بڑھ چڑھ کر الفاظ کی موسیقی اور ان کا آہنگی تو اتر بدرجہ اتم موجود ہیں۔

صحرا، سمندر اور سراب

(ظفر اقبال ظفر کی شاعری پر ایک نوٹ)

حقانی القاسمی

موبائل : 9891726444

ظفر اقبال ظفر کا تخلیقی سفر نصف صدی سے ذرا کم ہے۔ وہ اپنے اس سفر میں بہت سے مشاہدات، محسوسات اور تجربات کے عمل سے گزرے ہیں اور اُن ہی تجربات و حوادث کو انھوں نے شعری پیکر عطا کیا ہے۔ ان کے سامنے کلاسیکیت، ترقی پسندی، جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے بہت سے شعری رویے اور نمونے تھے، راہیں بھی بہت سی تھیں مگر انھوں نے عمومی راستے سے اجتناب برتا اسی لیے ان کی شعری صوت و صدا، طرز احساس و اظہار اپنے اقران سے ذرا الگ ہے۔

ظفر اقبال ظفر کو شعر کہنے کا سلیقہ آتا ہے اور احساس، اسلوب کی شائستگی کا ہنر بھی ہے۔ موضوعات کی عمومیت بھی ان کے انفرادی اظہار کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنتی۔ مطالعاتی وسعت، طویل تخلیقی ممارست اور ریاضت نے ان کے اندر فکری اور فنی پختگی پیدا کر دی ہے۔ ان کے شعروں میں کوئی سقم اور شکستگی نہیں ہے۔ وہ شاعری کے جمالیاتی معیارات اور فنی لوازمات کا پورا خیال رکھتے ہیں۔ ان کے یہاں جہاں خیال و الفاظ کی خوب صورتی، قوت اور روشنی ہے وہیں تکنیکی عمدگی، موسیقیت اور اصلیت جیسی خوبیاں بھی ان کی شاعری میں موجود ہیں مگر ان تمام خوبیوں کے باوجود بابِ شاعری میں ظفر اقبال ظفر کو وہ ظفر یابی نہیں ملی جس کے وہ واقعی مستحق ہیں۔ یہی وہ المیہ ہے جس سے بہت سے جینوئن تخلیق کاروں کو گزرنا پڑا ہے۔ زندگی میں بہت سے تخلیق کار نظر انداز کیے گئے اور بہتوں کو ناقدری کا شکوہ بھی رہا مگر ان شکایتوں پر اربابِ نقد نے توجہ نہیں دی جس کی وجہ سے فن کاروں کے تخلیقی احساس میں اضمحلال بھی آیا اور ان کے تخلیقی جذبے پر پژمردگی بھی چھائی رہی۔ ہاں کچھ خوش نصیب تخلیق کار ایسے ضرور ہوئے جنھیں زندگی میں اتنی پذیرائی تو نہیں ملی مگر موت کے بعد انھیں قدرے شہرت اور شناخت ضرور ملی اور تنقیدی حوالوں میں

بھی شامل کیے گئے۔ فرانز کافکا، سیلویا پلاتھ، ڈکنسن، ایڈگر ایلن پو، جان کیٹس یہ وہ بڑے نام ہیں جنھیں عالمی ادب میں امتیاز حاصل ہے مگر ان کی زندگی میں انھیں بھی نظر انداز کیا گیا اور ان کے فکری اور تخلیقی انتاجات کے حوالے سے تنقیدی گفتگو نہ ہوسکی۔ ظفر اقبال ظفر کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے کہ معاصر غزلیہ شاعری کے حوالے سے جو تنقیدی مطالعات سامنے آئے ہیں ان میں ان کا ذکر نہ کے برابر ہے خاص طور پر اتر پردیش کے شعری منظر نامے پر گفتگو کرنے والے بھی ظفر اقبال کو پیش منظر میں نہیں رکھتے۔ یہ بہت بڑی ناانصافی ہے جو ظفر اقبال ظفر اور ان کے جیسے کئی شاعروں کے ساتھ کی جاتی رہی ہے جب کہ ان کی شاعری میں وہ تمام خوبیاں اور خصائص ہیں جو ان کی عظمت کے ثبوت کے لیے کافی ہیں۔

ظفر اقبال ظفر کی غزلیہ شاعری کا کسی بھی تنقیدی زاویے سے مطالعہ کیا جائے تو وہ ان تمام معیارات پر کھری اترے گی جو اچھی اور عمدہ شاعری کے لیے متعین کیے گئے ہیں۔ موضوع کی معنویت، اسلوب کی تخلیقیت اور زبان کی صفائی اور سلاست کے اعتبار سے بھی ظفر اقبال ظفر کی شاعری پختہ نظر آتی ہے۔ ان کے یہاں کلاسیکی شعریات کی پاس داری کے ساتھ ساتھ نئی شعریات اور نئے شعور کا اظہار بھی ہے۔ انھوں نے بہت سی تحریکوں کے عروج و زوال کو بھی دیکھا ہے مگر ان کی شاعری کسی تحریک کے زیر اثر نہیں ہے۔ جدیدیت کے پیش کردہ وجودی مسائل کا اثر ضرور ہے مگر جدیدیت کی اسیری نہیں ہے۔ ان کی پوری شاعری فطرت اور مظاہر کائنات کے ارد گرد طواف کرتی ہے۔ ان کا شعری مجموعہ 'نمودِ سبز' نقوشِ فطرت کا تخلیقی مظہر ہے۔ ان کی شاعری میں وہی رموز و علائم، تشبیہات و استعارات اور لفظیات ہیں جن کا فطرت سے گہرا رشتہ ہے۔ عشرت ظفر مرحوم نے فطرت سے ظفر اقبال کی شاعری کے ارتباط و انسلاک کی طرف لطیف اشارے کیے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''ظفر اقبال ظفر نے اپنی غزل میں فطرت کے حوالے سے بہت گفتگو کی ہے ان کی غزلوں میں بہت کم ایسے اشعار ہیں جن میں مظاہر فطرت کا حوالہ نہ ہو''

اور حقیقت بھی یہی ہے کہ ظفر اقبال کے یہاں فطرت کے مظاہر و مناظر کا بہت عمدہ عکس و نقش ملتا ہے۔ فطرت سے متعلق جن لفظیات کا عمومی طور پر ذکر کیا جاتا ہے ان میں آسمان، زمین، چاند، سورج، ستارہ، صحرا، پھول، سمندر، پرند، پانی، آگ ہوا اور بادل شامل ہیں۔ ظفر اقبال ظفر نے اپنی شاعری میں فطرت کی ان لفظیات کے ذریعے اپنی ذہنی اور جذباتی کیفیات کی بہت عمدہ عکاسی کی ہے۔ ان لفظیات کے حوالے سے ظفر اقبال ظفر کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں جن سے ان لفظیات کی قوت، توانائی، تازگی کے ساتھ معنیاتی ابعاد اور کثرتِ مفاہیم کا اندازہ

ہو گا۔

آسمان فطرت کی ایک نا قابل تسخیر قوت ہے اور خدائی احساس کا مظہر بھی۔ یہ لا فانیت، وسعت اور بے کرانی کی ایک علامت ہے۔ مختلف ثقافتوں اور مذاہب میں آسمان کے تعلق سے مختلف علامتی تصورات ہیں۔ یہ بلندی رفعت اور نا رسائی کا بھی ایک اشاریہ ہے۔ ظفر اقبال ظفر کے یہاں آسمان کا استعمال اسی فطری مظہر کی وسعت اور نارسائی کے حوالے سے ملتا ہے کہ اگر یقین ہو تو گمان کو چھونا بھی آسان ہو جاتا ہے۔ آسمان تک رسائی دراصل ایک گمان ہی تو ہے مگر یقین سے آسمان کی بلندیوں کو بھی چھوا جا سکتا ہے۔ زمین و آسمان دونوں ہم رشتہ ہیں اور انسانی وجود سے ان دونوں کا بہت گہرا رشتہ ہے اور شاید اسی رشتے کی طرف شاعر نے بہت خوب صورت انداز میں اشارہ کیا ہے:

تھک کے بیٹھوں تو آسماں چھو لوں
گر یقیں ہو تو میں گماں چھو لوں

زمیں بچھائے ہوئے آسمان اوڑھے ہوئے
میں چل رہا ہوں سفر کی تکان اوڑھے ہوئے

زمین بھی زرخیزی اور لامحدود تخلیقیت کی ایک علامت ہے۔ نسائیت سے اس کی ایک خاص نسبت ہے۔ قدیم و جدید شاعروں نے بھی زمین کا علامتی اور استعاراتی استعمال کیا ہے۔ میر، آتش، یگانہ، فانی کے یہاں بھی زمین کی علامتی معنویتیں ملتی ہیں۔ جدید شاعروں میں منیر نیازی اور بانی کے یہاں زمین بطور علامت و استعارہ موجود ہے۔ میر کا ایک شعر ہے:

خاکِ آدم ہی ہے تمام زمین
پاؤں کو ہم سنبھال رکھتے ہیں

تو جدید شاعروں میں رؤف خیر کا ایک اچھا شعر ہے:

میں زمیں ہوں مگر میرے اندر
کوئی تو ہے جو آسمان سا ہے

ظفر اقبال نے اپنی شاعری میں زمین کے حوالے سے کئی شعر کہے ہیں جن میں اس کے علامتی اور عمومی تصورات سامنے آتے ہیں۔ یہ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔ جن میں زمین بطور علامت بھی ہے اور بطور عمومی

استعمال بھی۔

زمیں پر پاؤں دنیا کے کہاں ہیں
خلا میں پر کوئی لٹکا ہوا ہے

تمہارے پاؤں کے نیچے کوئی زمین نہیں
ہم اپنے سر پہ کئی آسمان رکھتے ہیں

چاند محبت، روشنی، تنہائی، حیرت، خوبصورتی، داخلی آگہی کی علامت ہے۔ شعور، لاشعور کے درمیان کی ایک کیفیت، مرد عورت کے رشتوں میں وحدت بھی اس میں شامل ہے۔ چاند معشوق اور محبوب کا استعارہ ہے۔ مہتاب، قمر، چاند، ہلال جیسے لفظوں کا استعمال شاعری میں کثرت سے ملتا ہے اور اسی سے جڑی ہوئی ماہ پارہ، ماہ رُخ اور مہ جبیں جیسی ترکیبیں بھی ہیں۔ ظفر اقبال ظفر نے چاند کو اسی علامتی مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ اس تعلق سے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

چاند اپنی چاندنی کے ساتھ رخصت ہو گیا
اور میرے احساس سے ایک روشنی لپٹی رہی

زندگی بھر تو رہا خواب ہی آنکھوں میں مری
پھر مرے پہلو میں یہ چاند کہاں سے آیا

سورج زندگی، توانائی، اعتماد، طاقت اور مثبت توانائی کے ساتھ ساتھ منفی علامات سے بھی تحفظ کی علامت ہے۔ طاقت اور امن کا مظہر ہے۔ اس کے کئی علامتی اور استعاراتی مفاہیم ہیں۔ قدیم شاعروں میں آرزو، سودا، مصحفی، شاہ نصیر، غالب، ثاقب لکھنوی، جلیل مانکپوری وغیرہ نے سورج کو بطور علامت استعمال کیا ہے۔ جدید شاعروں کے یہاں بھی بطور علامتی اور اسطوری کردار کے اس کا استعمال ملتا ہے۔ وزیر آغا، احسان دانش، زیب غوری، بانی، عبید اللہ علیم، اطہر نفیس، پرکاش فکری اور شہاب جعفری وغیرہ کے یہاں سورج کے استعمال کی کئی اہم مثالیں ملتی ہیں۔ قدیم شاعروں میں اصغر گونڈوی نے سورج کی معنویت کو اپنے شعر میں یوں روشن کیا ہے

کیا فیض بخشیاں ہیں رخ بے نقاب کی
ذرّوں میں روح دوڑ گئی آفتاب کی

تو وہیں جدید شاعروں میں احسان دانش نے بہت اچھا شعر کہا ہے:

فصیل شب سے کوئی ہاتھ بڑھنے والا ہے
فضا کی جیب سے سورج نکالنے کے لیے

ظفر اقبال ظفر نے بھی سورج کے تعلق سے بہت بامعنی شعر کہے ہیں:

ہر اک نگاہ کو حیرت میں ڈال دیتا ہوں
زمیں کی تہ سے میں سورج نکال دیتا ہوں

مقید کر لیا سورج کو کس نے
اندھیرا ہر طرف پھیلا ہوا ہے

ستارہ بھی فطرت کا ایک خوب صورت مظہر ہے۔اس کا تعلق بھی روشنی اور تحرک سے ہے۔قدیم و جدید دونوں شاعروں کے یہاں ستارہ بطور علامت موجود ہے۔ظفر اقبال ظفر نے بھی اپنی شاعری میں ستارے کو اس کی علامتی معنویت کے ساتھ استعمال کیا ہے:

جگنو دیکھا نہ ستارہ میں نے
شب کو اس طرح گزارا میں نے

کوئی صورت نہیں آنے کی اس کے
ستاروں کو بھی نیند آنے لگی ہے

پھول مسرت اور تازگی کی ایک علامت ہے۔ظفر اقبال ظفر نے اپنی شاعری میں پھول کی معنویت کو یوں واضح کیا ہے اور انسانی زندگی سے اس کے گہرے رشتے کو بھی بیان کیا ہے:

نہ پھول ہی کوئی رکھا نہ آرزو نہ چراغ
تمام گھر کو بیابان کر دیا میں نے

ہر پھول سے ٹپکنے لگا ہے لہو ظفر
مجھ کو جراحتوں کا شجر دے گیا ہے وہ

درخت بنیادی طور پر ذاتی ارتقا، وحدت اور زرخیزی، طبعی اور روحانی غذائیت کی علامت ہے۔اس کا انسانی زندگی اور اس کے ارتقا سے گہرا رشتہ ہے۔شجر اور درخت کا شاعری میں استعمال عام ہے اور اس کی کئی معنویتیں ہیں۔ قدیم شاعروں میں حاتم، میر، آتش، غالب، داغ، فانی، ثاقب تو جدید شاعروں میں ضیا جالندھری، طہور نظر، شکیب

جلالی، شہزاد احمد، کمار پاشی، شہریار، ظفر اقبال کے یہاں درخت کا استعمال ملتا ہے۔ حاتم نے جہاں یہ شعر کہا ہے:

پیری میں حاتم اب نہ جوانی کو یاد کر
سوکھے درخت بھی کہیں ہوتے ہیں پھر ہرے

تو وہیں سلیم شاہد کا ایک شعر ہے:

جن درختوں کی گھنی چھاؤں تھی وہ سب کٹ گئے
یوں لگا شاید مجھے جیسے میں بے گھر ہو گیا

ظفر اقبال ظفر نے بھی درخت کا رشتہ شادابی، تازگی اور ارتقا سے جوڑا ہے:

دل میں شاداب جو شجر تھا ظفر
خشک ہو کر بکھر گیا مجھ میں
وہ شجر سب کی نگاہوں میں کھٹکتا ہے بہت
راہ میں جس نے ہر اک کے واسطے سایہ کیا

سمندر بنیادی طور پر زندگی، طاقت اور فطرت کی ایک مضبوط قوت ہے۔ یہ انسانیت کا الوہی سرچشمہ ہے۔ انسانی زندگی سے سمندر کا ایک گہرا لگاؤ ہے۔ یہ ارتعاش اور تحرک کی بھی ایک علامت ہے۔ قدیم شاعروں میں سودا، میر، غالب، فانی، یگانہ اور جدید شاعروں میں ظفر اقبال، بانی، ناصر کاظمی، شہریار، عادل منصوری، بشیر بدر، آشفتہ چنگیزی کے یہاں مختلف مفاہیم میں سمندر کا استعمال ملتا ہے اور اس کی مختلف معنویتیں سامنے آتی ہیں۔ سودا کا ایک شعر ہے:

وہ سمندر ہے جس کا نہ کوئی پاٹ لگے
کشتی عمر مری دیکھیے کس گھاٹ لگے

ظفر اقبال ظفر نے بھی سمندر کو مختلف معنیاتی سیاق وسباق میں استعمال کیا ہے:

صحرا کی طرف ہے نہ سمندر کی طرف ہے
رخ ساری بلاؤں کا میرے گھر کی طرف ہے
سمندر سے بجھی ہے پیاس کس کی
سرابوں سے گزرنا چاہتا ہوں

ہے دشت میں سراب بھی چاروں طرف مرے
سیراب کرنے والا سمندر چلا گیا

پتھر صلابت، استقامت اور استحکام کی علامت ہے۔ یہ طاقت کا بھی مظہر ہے۔ قدیم شاعروں میں میر، درد، مصحفی، آتش، غالب، داغ، ریاض تو جدید شاعروں میں شکیب جلالی، ناصر کاظمی، مصحف اقبال توصیفی، زیب غوری اور شہر یار کے یہاں پتھر کا بہت ہی خوب صورت معنی خیز استعمال ملتا ہے۔ مصحفی کا ایک شعر ہے:

جس سنگ پہ خون کوہ کن تھا
وہ سنگ بھی تختہ چمن تھا

تو شکیب جلالی کا ایک شعر ہے

اور دنیا سے بھلائی کا صلہ کیا ملتا
آئینہ میں نے دکھایا تھا کہ پتھر برسے

ظفر اقبال ظفر نے بھی پتھر کو اس کی مختلف معنویتوں کے ساتھ اپنے شعروں میں استعمال کیا ہے:

انگلیاں زخمی ہیں اور پتھر سے ہے رشتہ میرا
نقش ہر دیوار پر ہے خون سے لکھا میرا
لوگ کہتے ہیں بستی انساں
آدمی ہیں یہاں تو پتھر کے

پانی تبدیلی، تحرک، حرکت اور بہاؤ کی علامت ہے۔ تزکیہ وتطہیر سے بھی اس کی مناسبت ہے۔ قدیم شاعروں میں میر، سودا، آتش، مصحفی، اور ثاقب لکھنوی کے یہاں اس کا استعمال ملتا ہے۔ جدید شاعروں نے نئے تلازمے کے ساتھ پانی پر شعر کہے ہیں۔ شکیب جلالی، ساقی فاروقی، شہزاد احمد، عزیز قیسی، عدیم ہاشمی، اعجاز عبید نے بہت اچھے شعر کہے ہیں۔ میر تقی میر کا ایک شعر ہے:

نمود کر وہیں بحر غم میں بیٹھ گیا
کہے تو میر اک بلبلہ تھا پانی کا

جدید شاعر شہزاد احمد نے پانی کو دوسرے مفہوم و معنی میں استعمال کرتے ہوئے کہا:

میں کہ خوش ہوتا تھا دریا کی روانی دیکھ کر

کانپ اٹھا ہوں گلی کوچوں میں پانی دیکھ کر

ظفر اقبال ظفر نے بھی پانی کو اس کے حقیقی مفہوم میں استعمال کیا ہے:

چار جانب ہے پانی ہی پانی
کیسے پاؤں سراغ ساحل کا

آگ بقا اور زندگی کی علامت ہے۔انسانی زندگی سے آگ کا بہت گہرا رشتہ ہے۔اس کے مثبت اور منفی دونوں مفاہیم ہیں جو اردو شاعری میں استعمال ہوئے ہیں۔قدیم شاعروں میں سراج اورنگ آبادی، میر، میرحسن، سودا، مصحفی، غالب، آتش، یگانہ، اصغر کے یہاں آگ کا مختلف معنیاتی سیاق وسباق میں استعمال ہوا ہے۔جدید شاعروں میں ظفر اقبال، اطہر نفیس، بانی، محمود ایاز، لطف الرحمٰن، شمس الرحمٰن فاروقی، احمد مشتاق وغیرہ نے عمدہ شعر کہے ہیں۔مصحفی کا شعر ہے:

لگ رہی ہے خانۂ دل کو ہمارے آگ ہائے
اور ہم چاروں طرف پھرتے ہیں گھبرائے ہوئے

جدید شاعر احمد مشتاق کہتے ہیں:

دلوں کی اور دھواں سا دکھائی دیتا ہے
یہ شہر تو مجھے جلتا سا دکھائی دیتا ہے

ظفر اقبال ظفر نے آگ کو مختلف معنویتوں کے ساتھ اپنی شاعری میں جگہ دی ہے:

آگ ہی آگ ہے ہر سمت یہاں
زد سے اس کی نہیں باہر کوئی
آگ سی محسوس ہوتی ہے بدن میں
ذہن میں گویا کمانیں ٹوٹتی ہیں

ہوا تبدیلی اور تباہی کی ایک علامت ہے جو ایک غیر مرئی قوت ہے۔یہ تعمیری بھی ہے اور تخریبی بھی۔اردو شاعری میں منفی اور مثبت دونوں طور پر ہوا کا استعمال ملتا ہے۔قدیم شاعروں میں سراج اورنگ آبادی، میر تقی میر، ذوق، نسیم دہلوی، جلیل مانک پوری، انیس، یگانہ نے ہوا کو مختلف معنویتوں میں استعمال کیا ہے تو جدید شاعروں میں احمد ندیم قاسمی، اختر ہوشیار پوری، حمید الماس، مظہر امام، زیب غوری کے یہاں ہوا کے مختلف تصورات اور مفاہیم نظر

آتے ہیں۔نسیم دہلوی کا شعر ہے:

گر یہی ہے باغ عالم کی ہوا
شاخ گل اک روز جھونکا کھائے گی

تو زیب غوری کا شعر ہے:

ہوا کے شور میں صدائیں سنتا کون
پکارتا رہا گرتے مکان کے اندر

ظفر اقبال ظفر نے بھی ہوا کو اس کے مختلف سیاق وسباق میں استعمال کیا ہے۔ یہ چند اشعار دیکھیں:

ہوا کا شور سننا چاہتا ہوں
خلا سے اپنا رشتہ چاہتا ہوں
الزام دوں ہواؤں کو میں کس طرح ظفر
اپنے شکستہ جسم کی دیوار میں ہی تھا

فطرت اور اس کے مظاہر سے متعلق ان ہی لفظیات سے ظفر اقبال ظفر کی شعری تشکیل ہوئی ہے۔اس لیے ان کے یہاں فطرت اور کائنات کی کیفیات کا بہت ہی پر اثر بیانیہ نظر آتا ہے۔ ماں بھی فطرت کا ایک خوبصورت مظہر ہے۔اس لئے ماں کے حوالے سے بھی ان کے یہاں بہت خوبصورت شعر ملتے ہیں۔

ساتھ میں ماں کی دعا اپنے ہمیشہ رکھو
یہ ہمیں غم سے نکلنے کا ہنر دیتی ہے
ماں کے قدموں تلے اللہ نے جنت رکھی
ماں کی ہر حال میں ہر طرح سے خدمت کی جائے

ظفر اقبال ظفر کے یہاں فطرت کی جن لفظیات کا استعمال ہوا ہے ان کی کئی معنیاتی جہتیں ہیں۔ایک ہی معنی یا مفہوم پر مرتکز نہیں ہیں بلکہ سیاق وسباق کے اعتبار سے ان کے مفاہیم بدلتے رہتے ہیں کہ دراصل فطرت بھی تغیر پذیر ہوتی رہتی ہے اور زمان ومکاں کے لحاظ سے اپنی صورت و کیفیت بدلتی رہتی ہے۔

موضوعات اور اسالیب دونوں زاویے سے ظفر اقبال ظفر کی شاعری کا جائزہ لیا جائے تو بہت سے اہم نکتے سامنے آئیں گے۔انھوں نے شعری کمپوزیشن کے عمومی موضوعات کے ساتھ ساتھ عوامی ترجیحات کے موضوعات

کو بھی اپنی شاعری کا حصہ بنایا ہے اور بدلتے زمانے کے مسائل، واردات، مشکلات، مصائب، آلام وآزار، جدید انسان کے بحران اور بے چہرگی پر بھی شعر کہے ہیں۔ جدید غزل کے جو مخصوص موضوعات ہیں مثلاً محرومی، مایوسی، نا امیدی، اداسی، انتشار، اضطراب، ٹوٹ پھوٹ، شکستگی، بے گھری، قنوطیت، یاسیت، بیگانگی، بےزاری، اجنبیت، تنہائی، تشکیک، بے تعلقی، خوف، عدم تحفظ، شکست وریخت، قدروں کا زوال وغیرہ یہ تمام ان کے موضوعاتی کینوس کا حصہ ہیں۔ آج کی متناقض اور متخالف زندگی کا منظر نامہ ان کی شاعری میں منقش ہے۔ ظفر اقبال ظفر کی شاعری میں یک رنگیٔ احساس نہیں بلکہ احساسات کی مختلف سطحیں ہیں جو وقت حالات یا سچویشن کے اعتبار سے بدلتی رہتی ہیں اسی لیے کبھی روشنی، کبھی اندھیرا، کبھی مسرت، کبھی اذیت، کبھی امید، کبھی ناامیدی، کبھی شگفتگی، کبھی شکستگی، زمین و زماں کے موسم کے ساتھ ساتھ ذہنی موسموں میں بھی تبدیلیاں آتی رہتی ہیں۔ یہ شعری احساس کسی ایک نقطے پر مرکوز نہیں ہے بلکہ سیال پانی کی طرح اپنی کیفیت اور رنگ بدلتا رہتا ہے۔ خیال اور احساس کو کسی ایک مقام یا مرکز پر قرار نہیں بلکہ یہ اضطراب کی کئی موجوں سے گزر کر منزلوں تک پہنچنے کی سعی کرتا ہے۔ یہی اضطرابی لہریں ظفر اقبال کی شاعری کو ہمارے احساس کا حصہ بنا دیتی ہیں اور پڑھنے والا بھی ان ہی کیفیتوں سے ہم کنار ہوتا ہے جن سے ان کی شاعری گزرتی ہے۔ کہیں تلاطم، کہیں تصادم، کہیں تفاہم، کہیں تقسیم وتفریق، کہیں ترابط وتوافق یہی ہے زندگی کا رنگ اور اسی رنگ کی آئینہ دار ہے ظفر اقبال ظفر کی شاعری۔ زندگی کے تضادات کو جس طور پر انہوں نے معاشرے میں محسوس کیا ہے اسی طور سے انھوں نے اپنی شاعری کا حصہ بنایا ہے۔ صحرا، پہاڑ، ندی، سمندر سب ان ہی تضادات کے استعارے ہیں۔ ان سے جو تصویر بنائی جاتی ہے وہی کلی تصویر ہوتی ہے کیوں کہ صرف انسانی ذہن ہی نہیں زمین وزماں بھی ان ہی تضادات کے عمل سے گزرتے ہیں۔ ظفر اقبال ظفر نے جہاں اپنے شعروں میں بے گھری کے کرب کا ذکر کیا ہے وہیں گھر کی عافیت وآسائش کا بھی بیان ہے، جہاں جڑوں سے جدائی کی بات ہے وہیں جڑوں سے پیوستگی کا بھی ذکر ہے۔ یعنی اپنی شاعری کے ذریعہ انھوں نے یہ بتایا ہے کہ ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں، زمانے بدلتے ہیں تو ذہنیتیں تبدیل ہوتی ہیں۔ قدریں بدل جاتی ہیں۔ سالمیت شکستگی کا روپ لے لیتی ہے تو کبھی اجنبیت قربت کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ تبدیلیوں کا یہی تدویری عمل حیات وکائنات کی حقیقت ہے اور اسی حقیقت کی عکاسی ظفر اقبال کی شاعری میں ہوئی ہے:

یہ شہر مرا ہے کہ آشوب کی بستی
انسانوں میں اب بوئے وفا تک نہیں آتی

یہاں تو آشنا ہیں سارے چہرے
سبھی کے ہاتھ میں خنجر کھلے ہیں

اے خدا کس کرب سے دو چار ہے میرا وجود
ٹوٹتے لمحوں کی یہ کیسی صدا ہے ہر طرف

انسانی زندگی کے یہ شعری منظرنامے ہیں۔انسان کی وجودی صورت حال کی یہ شاعرانہ تفہیم وتعبیر ہے جس میں اقدار کا زوال بھی ہے، بے چہرگی بھی، ماحول کی کثافت بھی ہے، بے وفائی و بے اعتباری بھی، خوف و دہشت بھی، ٹوٹتے، بکھرتے رشتوں کی کہانی بھی، شکستگی، افسردگی، آزردگی، آشفتگی، افتادگی، محزونی، لاحاصلی، بے رونقی بھی ہے اور انسانی کرب و اضطراب کا منظر بھی، انسانی معاشرے کے جو شب و روز، واردات، وقوعات، حادثات ہیں وہ سب موضوعاتی سطح پر ظفر اقبال کی شاعری کا حصہ ہیں۔

جدید غزل ان ہی طرح کے خیالات، جذبات اور محسوسات سے معمور ہے۔جدید دور کا شاعر اپنی آنکھوں سے جو کچھ دیکھ رہا ہے یا جو کچھ محسوس کر رہا ہے اسے وہ من وعن بیان کر دیتا ہے یہ ہمارے عہد کی وہ حقیقتیں ہیں جن کا ادراک معاشرے کے ہر حساس فرد کو ہے۔آج کی غزل کے یہ حاوی اور غالب موضوعات ہیں جن کے حوالے سے زیادہ تر جدید غزل کے شعرا شعر کہتے رہے ہیں۔ظفر اقبال ظفر کا بھی موضوعاتی دائرہ عصری حسیت سے جڑا ہوا ہے اس لیے ان کے یہاں بھی آج کے زمینی اور زمانی مسائل سے جڑے ہوئے شعر مل جاتے ہیں۔

اسلوبیاتی لحاظ سے بھی ظفر اقبال ظفر کی شاعری جدید غزل کی لفظیات، علامات، اشارات سے ہم آہنگ ہے۔انھوں نے جدید لفظیاتی نظام سے اپنا رشتہ جوڑا ہے اور زمانے کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ علائم و رموز میں جو معنیاتی تبدیلیاں پیدا ہوئی ہیں ان کا انھوں نے بطور خاص خیال رکھا ہے۔قدیم لفظیات اور اس کے تلازموں سے الگ انھوں نے جدید غزل کی لفظیات کو اپنی شاعری میں بہت ہی ہنرمندی کے ساتھ برتا ہے۔جدید غزل میں عموماً جن لفظیات، علامات اور استعارات پر زیادہ زور ہے پروفیسر مغنی تبسم کے مطابق ان کی فہرست کچھ یوں ترتیب پاتی ہے:

''سمندر، دریا، ندی، پانی، لہر، موج، گرداب، بھنور، برف، ساحل، ریت، کشتی، ناؤ، بادل، بادبان، پتوار، جزیرہ،، بارش، برسات، ابر، بادل، تالاب، کنواں، دلدل، بارش، تشنگی، سراب، دشت، جنگل، صحرا، خرابہ، کھنڈر، سانپ، خوف، خطر، ڈر، دہشت، آسیب، عفریت، آہٹ، چاپ، پرچھائیں، زمین،

خاک، مٹی، چاک، پتھر، سنگ، چٹان، کنکری، پہاڑ، درخت، شجر، پیڑ، پتا، برگ، چھاؤں، پرند، اُڑان، آگ، خاکستر، چنگاری، شرر، دھواں، آسمان، چاند، چاندنی، ستارہ، تارہ، خلا، سورج، دھوپ، صبح، سحر، سویرا، دن، شام، رات، شب، تاریکی، اندھیرا، تیرگی، نیند، خواب، تعبیر، چراغ، روشنی، سکوت، خامشی، سناٹا، گونج، شور، ہوا، آندھی، غبار، گرد، ذرہ، گاؤں، کھیت، فصل، بستی، شہر، آبادی، بھیڑ، اجنبی، تنہائی، بےحسی، بےدلی، آئینہ، عکس، تصویر، چہرہ، فصیل، حصار، گھر، مکان، مکین، دیوار، چھت، دروازہ، دریچہ، کھڑکی، دہلیز، دستک، آنگن، صحن، عمارت، تعمیر، سیڑھی، سلسلہ، دشمن، فوج، لشکر، جنگ، لڑائی، زخم، لہو، تلوار، خنجر، حادثہ، سانحہ، قبر، تربت، زمانہ، صدی، لمحہ، وقت، سفر، مسافر، رستہ، رہ گزر، سرائے، مہمان، مہمان سرا، قافلہ، مسافت، تھکن، بدن، لباس، ملبوس، روح، گناہ، جرم، سزا، دعا، راز، زنجیر، قید، کاغذ، کتاب، لفظ، خرف، خبر، اشتہار، اخبار" (جدید اردو غزل کی لفظیات، مشمولہ زبان وادب، ص190)

جدید غزل کے جو نمائندہ شعرا ہیں ان میں ناصر کاظمی، احمد مشتاق، منیر نیازی، ظفر اقبال، شہریار، بانی، زیب غوری، عرفان صدیقی وغیرہ بہت اہم ہیں۔ انھوں نے غزل میں بہت سے ایسے تجربے کیے جن کی بنیاد پر انھیں اعتبار اور امتیاز حاصل ہے۔ انھوں نے جن علامتوں کو اپنی شاعری میں وسیع تر معنیاتی تناظر میں استعمال کیا ہے ان میں شہر، جنگل، بستی، گھر، دشت، لہو، زہر، دھوپ، دریا، مکان، خواب، صحرا، ہوا، روشنی، سمندر، پیاس، ریت، سایہ، بیاناں، ندی، غبار، رات، شام وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ظفر اقبال ظفر نے بھی ان شاعروں کا گہرائی سے مطالعہ کیا ہے۔ اس لیے ان کے یہاں بھی یہی لفظیات اور علامتیں بکثرت ملتی ہیں۔ لیکن ظفر اقبال ظفر نے ان لفظیات اور علامتوں کو اپنے زاویے سے اپنی شاعری میں برتا ہے اور کچھ نئے مفاہیم اخذ کیے ہیں۔ ظفر اقبال ظفر کے پیش رو اور معاصر شعرا نے جن لفظیات اور علامات کو کثرت سے استعمال کیا ہے ان میں سے بہت سی لفظیات اور علامات ظفر اقبال ظفر کے یہاں بھی ہیں۔ ان میں گھر، سفر، سمندر، دشت، صحرا، دریا وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ گھر ایک ایسی علامت ہے جسے تحفظ، آسائش اور عافیت کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ ظفر اقبال ظفر کے یہاں جو گھر ہے وہ کرب واضطراب اور بےسکونی سے عبارت ہے۔ پتھر کا گھر، بےدر و دیوار کا گھر جو اضطراب وانتشار، آلام وآزار کا

اشاریہ ہے۔چند شعر ملاحظہ ہوں:

دے کے شیشے کا بدن پتھر کا گھر مجھ کو دیا
لمحہ لمحہ ٹوٹتے رہنے کا ڈر مجھ کو دیا

بکھری ہے ہر طرف یہاں اشیائے زندگی
لگتا ہے میرا گھر کوئی بازار ہو گیا

سفر بھی ان کے یہاں ایک علامت ہے اور اس کا استعمال ظفر اقبال ظفر کے یہاں مختلف زاویوں سے ملتا ہے۔قدیم شاعروں میں میر، سودا، درد، مصحفی، آتش، فانی، وحشت اور جدید شاعروں میں حفیظ ہشیار پوری، میرا جی، احسان دانش، شکیب جلالی، منیر نیازی، جمال احسانی، زبیر رضوی اور سلطان اختر کے یہاں سفر اور اس کے تلازمات کے متعلق بہت اچھے اشعار ملتے ہیں۔درد کا شعر ہے:

اے بے خبر تو آپ سے غافل نہ بیٹھ رو
جوں شعلہ یاں سفر ہے ہمیشہ وطن کے بیچ

نئے شاعروں میں شکیب جلالی یوں کہتے ہیں:

اُتر کے ناؤ سے بھی کب سفر تمام ہوا
زمیں سے پاؤں دھرا تو زمین چلنے لگی

اسی طور کا ایک شعر ساقی فاروقی کا بھی ہے:

مجھے خبر تھی مرا انتظار گھر میں رہا
یہ حادثہ تھا کہ میں عمر بھر سفر میں رہا

ظفر اقبال ظفر کے یہاں بھی سفر ان ہی معانی اور مفاہیم میں استعمال ہوا ہے گو کہ سفر وسیلہ ظفر ہے مگر ظفر کے یہاں یہ اذیتوں، صعوبتوں سے عبارت ہے۔اس تعلق سے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

یہ کیسا سفر ہے کہ ہوا تک نہیں آتی
قدموں کی کہیں کوئی صدا تک نہیں آتی

مجھ کو تمازتوں کا سفر دے گیا ہے وہ
خوابوں کے پیرہن کو شرر دے گیا ہے وہ

سمندر دریا بھی ایک علامت ہے۔ جو قدیم اور جدید دونوں شاعروں کے یہاں بکثرت استعمال ہوا ہے۔ بانی کا ایک شعر ہے:

عجب نظارہ تھا بستی کا اس کنارے پر
سبھی بچھڑ گئے دریا سے پار اترتے ہوئے

ظفر اقبال ظفر نے سمندر اور دریا کو مختلف سیاق وسباق میں استعمال کیا ہے کچھ اشعار ملاحظہ کیجیے جس سے سمندر اور دریا کی علامتی معنویت واضح ہوتی ہے:

دریا دریا میں پھرا تشنہ لبی لپٹی رہی
میرے قدموں سے ہمیشہ ریت ہی لپٹی رہی
ناؤ کاغذ کی سمندر سے نکل آئی ہے
ایک کہانی اسی منظر سے نکل آئی ہے

آخری الذکر شعر پڑھ کر علی الدین نوید کا یہ شعر یاد آ جاتا ہے:

کاغذ کا ایک ناؤ بناتا ہوں شام تک
کالے سمندروں میں بہاتا ہوں رات بھر

دشت وصحرا بھی ایک ایسی علامت ہے۔ جس کا قدیم وجدید شاعری میں بکثرت استعمال ہوا ہے۔ آبرو، میر، میر سوز، آتش، غالب، فانی اور اصغر کے یہاں دشت وصحرا کی جو علامتی معنویت ہے کچھ تبدیلیوں کے ساتھ شکیلب جلالی، منیر نیازی، زیب غوری، وقار خلیل، شاذ تمکنت کے یہاں بھی ملتی ہے۔ آتش کا ایک شعر ہے:

وحشت دل نے کیا ہے وہ بیاباں پیدا
سینکڑوں کوس نہیں صورتِ انساں پیدا

جدید شاعر وقار خلیل کہتے ہیں:

ساتھ ہے اک دشت تنہائی
گھر سے نکلو کہ اپنے گھر میں رہو

کچھ اسی طرح کی علامتی معنویتوں کے ساتھ دشت وصحرا اور اس کے تلازمات کا استعمال ظفر اقبال ظفر کے یہاں بھی ملتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

ہم اپنی تشنگی کیسے بجھائیں
جو دریا تھا وہ اب صحرا ہوا ہے
عمر گزری ہے مسائل کے گھنے جنگل میں
راستہ مجھ کو ملا ہی نہیں آسانی کا

ظفر اقبال ظفر کی شاعری میں وہی انسانی جذبات واحساسات ہیں جن سے شب وروز ہر فردِ بشر گزرتا ہے ۔ان کے الفاظ ان کے احساس سے مکمل طور پر ہم آہنگ نظر آتے ہیں اور شاعری میں بھی انھوں نے جن استعارات کا استعمال کیا ہے وہ آج کی زندگی سے مربوط ہیں۔ دراصل یہ استعارے نہیں ان کی داخلی شکست وریخت کا اشاریہ ہیں۔ ہر لمحہ ٹوٹتی بکھرتی زندگی کا عکس ہے۔ان کی شاعری میں انسانی زندگی کے تمام تضادات اور تناقضات بھی در آئے ہیں۔

ظفر اقبال ظفر کی شاعری کا فطرت سے بہت گہرا رشتہ ہے ان کے بیشتر شعر ان کے وجودی، ذہنی اور جذباتی کیفیتوں کا اظہار ہیں۔ان کی زندگی جس شکل، جس کرب، جس المیے، جس اضطراب، جس انتشار اور جس درد سے گزری ہے وہی ساری کیفیتیں ان کی شاعری میں ڈھل گئی ہیں اس لیے ظفر اقبال ظفر کی شخصیت کی تفہیم کے لیے ان کی شاعری سے بڑا کوئی حوالہ نہیں ہے۔ یہ پورے طور پر ان کے وجود کا انعکاس ہے۔ یہ ان کی ذات اور ذہن کا تخلیقی مظہر ہے۔

حقیقی ادب اور ادب کا حقیقی منظر نامہ

صابر علی سیوانی (حیدر آباد)

موبائل : 9989796088

شاعر اور ادیب کا معاشرے میں اہم کردار ہوتا ہے۔تہذیب و ثقافت کی آبیاری میں بھی تخلیق کاروں کا قابلِ قدر رول ہوتا ہے۔ عام انسانوں کی بہ نسبت فنکاروں کو حساس ترین طبقے کا حصہ تصور کیا جاتا ہے۔تاریخ گواہ ہے کہ شعرا نے اپنی شعری تخلیقات کے ذریعہ معاشرے میں انقلاب لانے کا کام کیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ آج کے ترقی یافتہ زمانے میں بھی کلاسیکی ادب کی قدر و قیمت کم نہیں ہوئی ہے۔ادب بھلے ہی نئی قدروں کا اسیر ہو گیا ہو،لیکن ادب کے قدیم اقدار کی اہمیت سے آج بھی مفر ممکن نہیں۔آج بھی غالب،میر،داغ،ذوق،آتش،انیس،دبیر،اقبال کے کلام کی اہمیت اتنی ہی ہے،جتنی ان کے زمانے یا ان کے مابعد دور میں تھی، بلکہ آج کل تو ان شعرا کے کلام کی قدر و معنویت کہیں زیادہ بڑھ گئی ہے۔آج بھی ان مذکورہ شعرا کا کلام عوام و خواص کے حافظے میں محفوظ ہے، جبکہ جدید شعرا کی تخلیقات صرف مخصوص طبقات کے ذہنوں پر ثبت ہیں اور وہ بھی محدود تعداد میں ہے۔وجہ ہے کہ کلاسیکی شعرا یا ادبا مطالعہ، مشق و مزاولت اور محنت و ریاضت میں اپنی زندگیاں گزار دیتے تھے۔متعدد شعرا کے دواوین ان کے حافظے میں محفوظ ہوا کرتے تھے۔ عربی، فارسی، اردو کے علاوہ دیگر علاقائی زبانوں پر بھی انہیں قدرت ہوا کرتی تھی۔ایک شعر یا ایک مضمون لکھنے کے لیے گھنٹوں، ہفتوں بلکہ مہینوں لگا دیتے تھے۔قطع و برید اور حذف و اضافہ کی ذہنی مشقتوں کے بعد کوئی ایک مضمون یا کوئی غزل، قصیدہ، رباعی یا دوسرے اصنافِ سخن پر مشتمل کوئی شاہکار وجود میں آتا۔اساتذہ کی اصلاحوں کے بعد سخنوری کے نمونے منصہ شہود پر آتے تھے۔محاوروں، صنعتوں اور لفظی ترکیبوں کے برمحل اور خوبصورت استعمال کے ذریعہ وہ اپنی تخلیقات میں معنویت اور اثر آفرینی کی کوشش کرتے تھے۔مشاعروں میں برسر موقع یا تو ان کی ستائش ہوتی تھی یا اسٹیج پر ہی دوسرا شاعر زبان و بیان کی خامیاں نکال کر انہیں ان کی علمیت کا احساس کرا دیتا تھا۔اس طرح بڑی محنت، دیدہ ریزی، مشق و مہارت کے بعد ادیب یا شاعر کوئی شہ پارہ نذرِ قارئین و سامعین کرتا تھا۔روزگار کے مسائل اس وقت بھی ہوا کرتے تھے لیکن ان فن کاروں کو اپنے پیٹ کے علاوہ بھی کچھ فکریں ہوا کرتی تھیں۔وہ ادب اور معاشرے کو کچھ دینا چاہتے تھے اور

اس کے لیے وہ کسی بھی حد تک جانے کو تیار رہتے تھے۔ ہر زمانے میں روزگار ایک مسئلہ رہا ہے، اس کے باوجود اعلیٰ ادب تخلیق پاتا رہا ہے۔ انتظار حسین نے اپنے ایک مضمون ''ہمارے معاشرے کو ادب کی آج بھی ضرورت ہے''، میں اس مسئلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بالکل واضح لفظوں میں لکھا ہے کہ:

''روزگار کا مسئلہ ہر زمانے میں رہتا ہے، اس لیے پیٹ آدمی کے ساتھ لگا ہوا ہے۔ لیکن حالیؔ اور اقبالؔ کے زمانے میں لوگوں کو پیٹ کے علاوہ بھی کچھ فکریں تھیں۔ جب پیٹ کے علاوہ بھی کچھ فکریں ہوں تو خود پیٹ کی فکر کو بھی اجتماعی فکروں کے پس منظر میں رکھ کر دیکھنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایسی صورت میں آدمی صرف اپنی نہیں سوچتا بلکہ آس پاس کے لوگوں کے متعلق بھی سوچتا ہے یا یہ کہ اپنے متعلق دوسروں سے غیر متعلق ہو کر نہیں سوچتا۔ یہیں سے ادب کے لیے کشش پیدا ہوتی ہے۔ آدمی اور آدمی کے درمیان رشتۂ زر ہے یعنی اجتماعی فکریں ختم ہو جائیں اور ہر فرد کو اپنی فکر ہو تو ادب اپنی اپیل کھو بیٹھتا ہے۔ ادیب بھی آدمی ہوتے ہیں۔ اردگرد کے حالات اس کے طرزِ عمل پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ جب ہر شخص کو اپنی فکر ہو تو ادیب کو بھی اپنی فکر کرنی پڑتی ہے۔ اپنی فکر کو دوسروں کی فکر کے رشتہ میں رکھ کر دیکھنے یعنی آپ بیتی کو جگ بیتی بنانے اور جگ بیتی کو آپ بیتی بنانے کا عمل اسے فضول نظر آتا ہے۔ پھر وہ لکھنے کے نئے نئے فائدے دریافت کرتا ہے، جس نے فائدے دریافت کر لیے وہ کامیاب ادیب ہے''۔

موجودہ عہد کا ادیب نئے نئے فائدے دریافت کرنے کا ہنر جانتا ہے، لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ادیب کے لیے نئے نئے فائدے دریافت کر لینا ہی ادب تخلیق کرنے کا مقصد ہو سکتا ہے؟ ادب طرزِ حیات ہو تبھی اچھا ادب تخلیق ہو سکتا ہے۔ ہمارے درمیان کتنے ایسے شاعر یا ادیب موجود ہیں جن کے لیے ادب طرزِ حیات ہو؟ یعنی لکھنے والے کی زندگی کا مقصد ادب کی تخلیق ہو۔ اس کی دھڑکنوں میں ادب دوڑتا ہو، اس کی سانسوں میں ادب آکسیجن کا کام کرتا ہو۔ اس کی رگوں میں ادب خون بن کر دوڑ رہا ہو۔ اس کے نزدیک تخلیق سے بڑھ کر کوئی لذت نہ ہو۔ شاہنواز فاروقی لکھتے ہیں:

''بلاشبہ تخلیق سے انسان کو کچھ نہ کچھ شہرت بھی مل جاتی ہے اور کہیں نہ کہیں سے چار پیسوں کا بندوبست بھی ہو جاتا ہے، مگر شہرت اور پیسے سچے ادب کا بنیادی مسئلہ نہیں ہوتے۔ ادب کی تخلیق کے محرکات بدل جانے سے سب کچھ بدل جاتا ہے''۔ (مضمون، ادب کے تخلیق کے محرکات بدل جانے سے سب کچھ بدل جاتا ہے)

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اردو کے شاعر و ادیب صرف جلبِ منفعت کے لیے ادب تخلیق کر رہے ہیں یا معاشرے میں صحیح اور فعال رول ادا کر رہے ہیں؟ ظاہر ہے اس کا جواب صرف یہی ہو سکتا ہے کہ ادیب و شاعر ایمانداری سے اپنا فریضہ انجام نہیں دے رہے ہیں۔ ان میں بیشتر کی تعداد ایسی ہے کہ جو کسی نہ کسی منفعت کی غرض

سے یا تو ادب تخلیق کر رہے ہیں یا کتابیں تصنیف کر رہے ہیں۔ ہمارے بیشتر لکھنے والے اصحاب ادب اور ادبی قدروں کو ثروت مند بنانے کی بجائے اپنی نگارشات کی وجہ سے چھوٹے چھوٹے ذاتی مفادات، انعام واکرام، منصب وکرسی، شہرت ونا موری (سستی شہرت) اور داد وتحسین حاصل کرنے کی دوڑ میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ ''کا تا اور لے دوڑی'' کے مصداق اپنی سطحی اور غیر معیاری ادبی تخلیقات و تصنیفات اور شعری خدمات کا صلہ چاہنے کے لیے قطاروں میں کھڑے دکھائی دیتے ہیں۔ اب تو انہیں کتب خانوں کی زیارت کا شرف حاصل کرنے کی بھی ضرورت پیش نہیں آتی ہے۔ مانگے کے اُجالے کے طور پر انٹرنیٹ سے سرقہ کرتے ہوئے کٹنگ، پیسٹنگ کے ذریعہ ادب کا ایک ملغوبہ تیار کرتے ہوئے ادبی بازار میں دھڑلے سے داخل ہوتے ہیں اور خود کو مصنف، ادیب اور ناقد کے طور پر پیش کرتے ہوئے عز وشرف کے طلبگار بن جاتے ہیں۔ بعض کی تو حالت یہ ہے کہ اپنے سارے کام چھوڑ کر اپنی زندگی میں ہی اپنی تاریخ لکھنے اور لکھوانے میں مصروف ہو چکے ہیں۔ کچھ ادیب کی تو یہ خواہش ہوتی ہے کہ کسی یونیورسٹی کا پروفیسران کی حیات وخدمات پر اپنی نگرانی اور میری زندگانی میں ہی ایم فل یا پی ایچ ڈی کرادے۔ وہ اس کے لیے کسی بھی شرط کو پوری کرنے کے لیے تیار رہتا ہے۔ ریسرچ اسکالر کو اپنے دولت کدے پر بلا کر پورا مواد فراہم کرتا ہے اور اس طرح ایک قابل رحم ادیب وشاعر پر اس کی حیات میں ہی تحقیقی مقالہ تیار ہو جاتا ہے اور وہ مقالہ کتابی شکل میں شائع بھی ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد بڑی دھوم سے اس کتاب کی رسم اجرا بھی انجام دی جاتی ہے، جس میں اس ادیب وشاعر کے بڑے بڑے قصیدہ خواں بلائے جاتے ہیں جو جھوٹی تعریفیں کر کے ادب کا بہت بڑا نقصان کرنے کا کام کرتے ہیں۔ آج کی اسی روش نے ادب عالیہ کو نقصان پہنچانے کا کام کیا ہے اور یہ سلسلہ جاری وساری ہے۔

اب تو حالت یہ ہے کہ ادیبوں میں مسابقت کی جگہ حسد نے لے لی ہے۔ جلد از جلد نتائج حاصل کرنے کی دوڑ نے وقت سے پہلے تخلیق کاروں کو تھکا کر رکھ دیا ہے۔ ان میں تخلیقی اپج کا فقدان پایا جاتا ہے۔ ماضی میں کتاب کی اشاعت کسی ادیب یا شاعر کی زندگی میں ایک بڑا سنگ میل تصور کیا جاتا تھا۔ اس کتاب کے مشتملات پر ادبی مباحث کے دروازے کھلتے تھے۔ تنقیدی مضامین کے ذریعہ اس کتاب کے اچھے اور بُرے پہلوؤں پر توجہ مبذول کرائی جاتی تھی۔ اس میں مصلحت یا چشم پوشی کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی تھی۔ اب عالم یہ ہے کہ جب کتاب چھپ کر آتی ہے تو رونمائیوں، پذیرائیوں اور اخبارات ورسائل میں تبصروں کی اشاعت تک تو مصنف چند دنوں یا مہینوں تک منظر نامہ پر نظر آتا ہے لیکن کتاب کا متن ہمیشہ کے لیے ادبی منظر نامے سے غائب ہو جاتا ہے۔ متن کا

بقا اسی وقت ممکن ہوسکتا ہے جب اس میں کچھ کام کی بات ہو، ورنہ کون بھلا اوراق غیر مفیدہ پر توجہ کرتا ہے۔ آج کل ادب اور ادیبوں کی حالت ایسی ہوگئی ہے کہ اس پر اگر سچائی سے لکھا جائے تو ایک طوفان کھڑا ہوسکتا ہے۔ چند استثنائی صورتوں کے علاوہ ہمارے زیادہ تر شاعروں اور ادیبوں کا سارا زور زندگی میں انعامات کے حصول، نوکریاں پکی کرنے (یونیورسٹیوں میں لکچرر بننے) ادب وفن کے سرکاری اداروں، اکادمیوں کی سربراہی حاصل کرنے، ادبی سمیناروں اور کانفرنسوں کے علاوہ مشاعروں کے ذریعہ اپنی عظمت و مرتبت کے قصیدے پڑھوانے، سفارشوں کے ذریعہ ملک و بیرون ملک ادبی دوروں، ادبی تقاریب کی صدارتوں اور کتابوں کی رونمائیوں جیسی غیر تخلیقی ادبی سرگرمیوں میں صرف ہوجاتا ہے۔ اس حوالے سے ایک مضمون میں نصیر احمد ناصر لکھتے ہیں:

''کچھ تو ادبی اداروں کے سربراہوں سے عہدے سنبھالتے ہی یوں چپکتے ہیں کہ یک جان دو قالب اور ہر تقریب میں ان کے پہلو میں نظر آتے ہیں۔ کچھ سارا سال اپنی پذیرائی کرواتے رہتے ہیں۔ ادب اور معاشرے کے لیے کوئی حقیقی کردار ادا کرنے کے لیے ان بے چاروں کے پاس وقت کہاں؟ وہ کب لکھتے ہیں، کب پڑھتے ہیں اس کا حال کوئی جن ہی بتا سکتا ہے۔ ادبی سرگرمیوں میں حقیقی ادب کی نمائندگی آٹے میں نمک کے برابر رہ گئی ہے۔ چند مخصوص لوگ اور گروپس ہیں، ادبی گاڈ فادر ہیں، سارا اردو ادب، سارے ادبی اعزازات، انعامی رقوم، تمام ادبی اور ثقافتی میلے، تشہیری سے ان ہی کے گرد گھوم رہا ہے۔ جن ادبی بزرجمہروں کو سرکاری اداروں میں حصہ بقدر جثہ نہیں ملتا وہ نت نئے اخباروں میں کالم نگاری شروع کر دیتے ہیں اور معاشرے کے یہ عکاس باقی ماندہ عمر اپنے ذاتی تعلقات، ذاتی پسند و ناپسند اور ذاتی ادبی معیارات و تعصبات کی بنیاد پر ادبی فتاویٰ جاری کر کے اپنی شہرت و شخصیت کو کیش کراتے ہیں، ایسے میں ادب کیا اور معاشرے میں ادیب کا کردار کیا اور چند ایک اصلی لکھنے والوں کی کیا بساط رہ جاتی ہے۔ یوں بظاہر تو ادبی سرگرمیاں بہت دکھائی دیتی ہیں، ادبی شور و غل بھی سنائی دیتا ہے لیکن حقیقی ادب اور ادیب مزید گوشہ نشین ہوجاتا ہے''۔ (مضمون، ادیب کے پاس سب سے بڑا ہتھیار اس کی تحریر ہے'' مطبوعہ روزنامہ انقلاب، بمبئی)

ادیب کی بنیادی ذمہ داری ادب تخلیق کرنا ہے۔ ہم ایک ادیب سے یہی توقع رکھتے ہیں کہ وہ بہترین ادب تخلیق کرے۔ معیاری ادب تخلیق کرنا ہی وہ کام ہے جس کے لیے اس کی اپنی بہترین صلاحیتیں اور بیش قیمت وقت صرف کرنا چاہئے لیکن اردو کے ادیب کا معاملہ بالکل الگ ہے۔ اس کے سامنے کئی مسائل ہوتے ہیں اور اسے متعدد مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس کے باوجود وہ ادب کی تخلیق میں کوشاں نظر آتا ہے کیوں کہ اسے

ادب سے جنون کی حد تک محبت ہوتی ہے یا اگر زیادہ دلچسپی نہیں بھی ہوتی ہے تب بھی اسے ادبی حلقوں میں اپنی شناخت کی فکر ہوتی ہے۔اس کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ ادب تخلیق کرنے کے بعد اس کی اشاعت کیسے عمل میں لائی جائے؟ اس عمل میں سب سے پہلے وہ اپنی پوری صلاحیت صَرف کر کے ادب تخلیق کرتا ہے۔اور یہی اس کا اصل کام بلکہ اس کا جوہرِ خاص ہوتا ہے۔اس کے بعد اسے کتابی شکل میں شائع کرنے کی فکر لاحق ہوتی ہے۔وہ کسی اردو اکادمی میں جزوی مالی تعاون کی غرض سے اپنا مسودہ داخل کرتا ہے۔مہینوں بعد اس مسودہ کو جزوی مالی تعاون کے لیے منظور کرلیا جاتا ہے اور معمولی سی رقم چند شرائط کے ساتھ فراہم کی جاتی ہے۔جزوی مالی تعاون کے علاوہ اپنی جیب سے آدھی سے زیادہ رقم خرچ کر کے اس کتاب کی اشاعت کا اہتمام کرتا ہے۔جب اس کی کتاب چھپ جاتی ہے تو پھر وہ اپنی کتاب بانٹنے کے لیے بڑے بڑے ادیبوں اور شاعروں کے دولت خانوں پر پہنچتا ہے، کیونکہ اس کی کتاب کی نکاسی اسی طرح ممکن ہوسکتی ہے۔اس کی کتاب کوئی ادارہ یا کتب فروش نہیں خریدتا ہے کیوں کہ خسارے کا سودا کوئی بھی شخص نہیں کرنا چاہتا ہے۔کچھ کتابیں کتب فروش اِس شرط پر رکھ بھی لیتے ہیں کہ ''ہم ان کتابوں کی بازار میں فروخت کی طمانیت نہیں دے سکتے کیوں کہ ایسی کتابیں بکتی نہیں ہیں''۔اب یہ ادیب اپنی کتاب مشاہیرِ ادب، تبصرہ نگاروں، کالم نگاروں، قلم کاروں اور اپنے ہم پیشہ دوستوں کی خدمت میں پیش کرنے یا انہیں ارسال کرنے کے مشن پر چل نکلتا ہے۔پھر وہ ایک صبر آزما مرحلے سے گزرتا ہے کہ کہیں پر اس کی کتاب پر تبصرہ شائع ہوجائے۔کتاب کے متعلق کسی اخبار یا رسالے میں خبر شائع ہوجائے۔کوئی نقاد یا قلم کار اس کتاب پر مضمون لکھے۔ایک طویل صبر آزما دور سے گزرنے کے بعد جب اسے اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ملتی تو وہ پھر ان ادیبوں، شاعروں، کالم نگاروں اور ادب دوست فنکاروں کو فون کر کے نہایت عاجزانہ انداز میں ملتمس ہوتا ہے کہ اگر آپ ہماری کتاب پر چند سطریں لکھ دیں تو مہربانی ہوگی۔اب یہ انتظار اس کی زندگی کا حصہ بن جاتا ہے اور اس وقت تک یہ انتظار قائم رہتا ہے جب تک وہ کتاب کی آخری جلد بانٹ نہیں دیتا۔کم و بیش 99 فیصد ادیب اس تلخ مگر معمول کے تجربے سے گزرتے ہیں۔حالت یہ ہے کہ ناشرین ایسی خالص ادبی کتابیں جو منفعت بخش نہ ہوں، شائع نہیں کرتے۔کتب فروش کو اپنی تجارت سے غرض ہوتا ہے۔مبصر مصلحت پسندی سے کام لیتا ہے۔کالم نگار اس کتاب پر رائے زنی کو تضیع اوقات گردانتا ہے۔نقاد تبصرہ نگاری کو اپنے لیے کسرِ شان تصور کرتا ہے اور میڈیا ادب کی ترویج کو وقت کا زیاں سمجھتا ہے۔اس نئے ادیب کو سوائے محرومی کے کچھ ہاتھ نہیں آتا۔

یہاں یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ کتاب کی اشاعت سے لے کر اس کی تقسیم کے مرحلہ کو سر کرنے

والے اس ادیب سے یہ توقع کیسے کی جاسکتی ہے کہ وہ دوبارہ ادب کی تخلیق کا بیڑا اٹھائے اور ایک بار پھر اسی اذیت ناک مرحلے سے اسے دوچار ہونا پڑے، لیکن ان تمام حوصلہ شکن حالات کے باوجود بھی وہ ادب تخلیق کرنے اور اسے کتابی شکل دینے کا فریضہ انجام دیتا ہے۔ صرف اُمید پر کہ اس بار شاید اس کی محنت رنگ لائے اور اس بار شاید نتائج حوصلہ افزا ہوں۔ اگر ہمارا ادیب اپنے بنیادی فریضہ کی ادائیگی یعنی ادب کی تخلیق کے بعد اس کی تشہیر، ترویج ،اشاعت کے لیے جو ذہنی اذیت اور عذاب اٹھاتا ہے، اس کے لیے اگر وہ خراج تحسین، انعامات و اعزازات کا نہ سہی حوصلہ افزائی اور رعایت کا ضرور حقدار ہے، لیکن ہماری ستم ظریفی یہ ہے کہ ہم اسے وہ بھی دینے کو تیار نہیں ہیں۔ لائق صد ستائش اور قابل احترام ہیں وہ ادیب و قلم کار جو ان مسائل و مشکلات کے باوجود اپنی بہترین صلاحیتوں کا مظاہرہ بلا معاوضہ کر رہے ہیں۔ یہاں ایک بات کہنے کی گنجائش بنتی ہے کہ نئے لکھنے والوں یا اچھا ادب خلق کرنے والے ذہین ادیبوں کی بہترین تخلیقات پر آج کے نقادوں اور اردو کے پروفیسروں کو چاہیے کہ وہ ان کی نگارشات پر چاہے وہ شعری ہوں یا نثری، اپنی گراں قدر رائے دیں۔ تنقیدی نقطۂ نظر سے اس پر نظر ڈالیں تا کہ وہ مستقبل قریب میں بہترین ادب تخلیق کرنے کے قابل بن سکیں۔ حالانکہ یہ نقاد اور محقق نئے لکھنے والوں کو خاطر میں ہی نہیں لاتے۔ ان کے بارے میں چند سطریں لکھنا بھی اپنی شان کے خلاف تصور کرتے ہیں۔ یہی ادیب مستقبل میں ادب کی باگ ڈور سنبھالنے والے ہیں جن پر بڑے بڑے ناقدین و قلمکار توجہ ہی مبذول نہیں کرتے ہیں۔ آج کل جو ادب تخلیق کیا جارہا ہے وہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ ایک طبقہ وہ ہے جسے اردو ادب کا ایک پارکھ یا یوں کہہ لیجیے کہ بڑے ادیب و ناقد اور محقق تحریر کر رہے ہیں۔ دوسرا طبقہ نئے لکھنے والوں کا ہے یعنی جو قلم کار کم و بیش دس بارہ برسوں سے لکھ رہے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ دونوں طبقے کم و بیش ایک ہی طرح کی تحریریں منصۂ شہود پر لا رہے ہیں، جو محض اقتباسات کی بنیاد پر تخلیقی ادب پیش کر رہے ہیں۔ ان کی تحریروں میں وہی گھسے پٹے اور فرسودہ اور دور از کار موضوعات کا احاطہ ہوتا ہے۔ زبان و بیان کی خامیوں سے پُر یہ تحریریں قاری کے قیمتی اوقات کو ضائع کرتی ہیں۔ ایک ہی شاعر پر ہزاروں مضامین لکھے جاچکے ہیں، سینکڑوں کتابیں شائع ہو چکی ہیں، اسی شاعر کی شعری خوبیاں گنائی جاتی ہیں۔ مانگے کا اُجالا ہی ان تحریروں کو روشن کرنے کے کام آتا ہے۔ کمال کی بات یہ ہے کہ جو بھی تحریریں آج کل وجود میں آرہی ہیں، ان میں سے بیشتر کی نوعیت یہ ہوتی ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قلم کار جلد بازی میں اپنا مضمون مکمل کرنا چاہتا ہے لیکن اس کے باوجود اس کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کی تحریر کو سراہا جائے اور اس کا صلہ بھی اسے فوری طور پر مل جائے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنے ایک مضمون میں آج کل کی تخلیقی تحریروں کی

صورتحال کا جائزہ لیا ہے۔ پیش ہے ایک اقتباس:

''اردو کو ٹکسالی میزان قرار نہیں دیا جا سکتا۔ برخلاف اس کے آج کی تخلیقی تحریریں پڑھیے تو ان میں سے اکثر و بیشتر میں جلدی جلدی کا تا اور لے دوڑی کا عمل نظر آئے گا۔ ان تحریروں میں پھوہڑ پن کا بھی احساس ہوگا۔ یوں محسوس ہوگا کہ لکھنے والا نہ صرف زبان و بیان اور الفاظ کے رموز سے ناواقف ہے بلکہ اپنے قدیم و جدید ادب سے بھی اچھی طرح واقف نہیں ہے۔ وہ تخلیقی سطح پر زبان سے بھی نا آشنا ہے اور انگریزی مرکبات اور جملوں کے بھونڈے ترجموں سے عبارت کو خراب کر رہا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ مغرب کے رجحانات اور اس کے ادب کی پیروی کر کے وہاں کے ادبی مشن کو درآمد کر رہا ہے۔ وہ اپنے معاشرے اور اس کے مسائل اور رجحانات سے کٹا ہوا ہے۔ صرف بدیسی اثرات اور فیشن کی سوداگری کر رہا ہے''۔

یہ ہے آج کا حقیقی ادب اور ادب کا حقیقی منظر نامہ، جسے ڈاکٹر جمیل جالبی نے مختصر لفظوں میں بیان کر دیا ہے۔ انہوں نے واضح طور پر لکھا ہے کہ آج کا لکھنے والا ادیب نہ صرف زبان و بیان اور الفاظ کے رموز سے ناواقف ہے بلکہ اپنے قدیم و جدید ادب سے بھی اچھی طرح آگاہ نہیں ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ صحتِ زبان پر اِن دنوں توجہ نہیں دی جاتی ہے اور نہ ہی لفظوں کے مصادر، مخارج اور مفاہیم کو سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ فارسی آمیز اصطلاحیں اور ترکیبیں بڑی تعداد میں اردو میں مستعمل ہیں لیکن مسئلہ یہ ہے کہ آج کا اردو ادیب و ناقد فارسی کے مبادیات تک سے بھی ناواقف ہے۔ عربی کی معمولی شُد بُد اسے نہیں ہے۔ ایسی صورت میں اس سے کیا توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ زبان کی صحت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنی نگارشات کو منظر عام پر لا سکے گا۔ ایسی مثالیں بہت بڑی تعداد میں موجود ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عام الفاظ کو غلط طریقے سے لکھا جاتا ہے۔ اس کا اِملا درست نہیں تحریر کیا جاتا ہے اور لفظوں کے اسراف سے کام لیتے ہوئے زبان کے ساتھ بھونڈا انداق کیا جاتا ہے۔ یہاں چند مثالیں پیش ہیں جس سے عام و خاص قاری کے ساتھ ساتھ اہل قلم بھی اپنی بعض غلط لفظوں کی تصحیح کر سکتے ہیں۔ صحیح املا اور درست تلفظ کی نشاندہی قوسین میں کی جاتی ہے اور غلط الفاظ کی عبارت اس سے قبل دی جا رہی ہے۔ مثلاً چاہ کُن (چاہ کَن) نُکات (نِکات)، نشو ونما (نشوؤ نُما) جُوق در جُوق (جوق در جُوق) حامی بھرنا (ہامی بھرنا) خورد و نوش (خور و نوش) نشاطِ ثانیہ (نشأۃِ ثانیہ) خودکُشی (خودکشی) چاق و چوبند (چاق چوبند) بے نیل و مرام (بے نیلِ مرام) معنون (مُعَنْوَنْ) ناراضگی (ناراضی) درستگی (درستی) برخواست (برخاست) مکتبۂ فکر (مکتبِ فکر) ناعاقبت اندیش (عاقبت نااندیش) پرواہ (پروا) لاپرواہی (لاپروائی) بالمشافہ (بالمشافَہہ) پائے تکمیل (پایۂ تکمیل) تنازعہ (تنازع) گذارش (گزارش)، خوش آئند (خوش آیند) کسم پرسی

(کس مپرسی) پائے تخت (پایۂ تخت) وجوہات (وجوہ) پھولوں کا گلدستہ (گل دستہ) بیجا اسراف (اسراف) مطمع نظر (مطمحِ نظر) دونوں فریقین (فریقین) وغیرہ نہ جانے کتنے الفاظ وتراکیب کے اِملے اور ہجے غلط استعمال کیے جاتے ہیں اور ایسی غلطیاں بڑے بڑے لکھاریوں سے بھی اکثر وبیشتر سرزد ہو جاتی ہیں۔ اس کی اہم ترین وجہ لفظوں کے سیاق وسباق اور اس کے مخرج واشتقاق سے عدم واقفیت ہوتی ہے، جس کے باعث ادیب کا بہترین سے بہترین مضمون بھی زبان کی غلطیوں کے باعث اہل زبان کے لیے قابل قبول نہیں ہوتا ہے۔ اس لیے نئے یا پرانے لکھنے والوں کو چاہیے کہ وہ صحت زبان پر توجہ دیں اور جہاں شک ہو وہاں لغت کا سہارا لیں۔ اس طرح غلطیوں کا احتمال کم ہوگا۔ ایسی غلطیاں فارسی زبان سے عدم واقفیت کے باعث سرزد ہوتی ہیں۔ زبان کی غلطیوں کی اہم وجہ یہ ہے کہ اسکول، کالج، یونیورسٹی اور دیگر تعلیمی اداروں میں زبان کے اسرار ورموز اور صحتِ زبان کے حوالے سے اسباق نہیں پڑھائے جاتے اور نہ ہی اس پر خاطر خواہ توجہ دی جاتی ہے۔ ان تعلیمی اداروں میں صرف ادب پڑھایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان بڑے بڑے تعلیمی اداروں سے فارغ التحصیل طلبہ کسی بھی کلاسکی متن کو صحتِ زبان کے ساتھ نہیں پڑھ پاتے ہیں۔ کچھ استثنائی صورتیں ہر جگہ پائی جاتی ہیں، سو یہاں بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے، لیکن مجموعی طور پر زبان کی صحت کے ساتھ متن پڑھنا، متن لکھنا اور متن پڑھانا، آج کے پس منظر میں جوئے شیر لانے کے مترادف قرار دیا جاسکتا ہے۔ یونیورسٹیوں میں اساتذہ کی بڑی تعداد ایسی ہے جنہیں زبان پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ اساتذہ کی استعداد پر بھی آج سوالیہ نشان قائم کیے جاتے ہیں۔ ان اساتذہ کو صحتِ زبان کی طرف توجہ دینی چاہئے۔ ایسے ہی اساتذہ کے پڑھائے ہوئے طلبہ بہت سے عام فہم اور عام مروجہ الفاظ تک کی قرأت درست نہیں کر پاتے ہیں اور ان الفاظ کا درست اِملا بھی نہیں لکھ پاتے ہیں، اعراب اور اضافتِ لفظی کی غلطیاں ان سے سرزد ہو جاتی ہیں۔ اس کی اہم ترین وجہ یہ ہے زبان وبیان کی باریکیوں پر توجہ نہیں دی جاتی اور نہ ہی اسے اہمیت دی جاتی ہے۔ بی اے اور ایم اے کی سطح پر کم از کم ایک پرچہ صحتِ زبان کے موضوع پر شاملِ نصاب ہونا چاہیے جس میں درست اِملا، انشاء، تلفظ، ہجے، تذکیر وتانیث، محاوروں کا صحیح اور برمحل استعمال، جملوں کی ساخت اور لفظوں کے مصادر ومآخذ کے بارے میں معلومات فراہم کی جائیں۔

آج کا حقیقی ادب شعر وسخن کے اردگرد گھومتا ہے۔ نئے لکھنے والوں میں اچھی نثر کی تخلیق کا فقدان پایا جاتا ہے۔ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ آج نثر پر کم اور شاعری پر زور زیادہ دیا جا رہا ہے۔ شاعروں کو مشاعروں کی وجہ سے جو شہرت حاصل ہو جاتی ہے، وہ شہرت نثر نگار کے حصہ میں نہیں آتی۔ حالانکہ نثر نگار برسوں سے اپنی نثری تحریریں قارئین کی خدمت میں پیش کرتا آرہا ہوتا ہے، اس کے باوجود اسے وہ مقبولیت حاصل نہیں ہوتی جو چند

غزلیں لکھ کر چند برسوں میں مشاعروں میں شرکت کے باعث ایک شاعر کے حصہ میں آ جاتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ زبان کی فاش غلطیوں کے باوجود بھی اشعار کی تخلیقات کو قبول عام و خاص کا مرتبہ حاصل ہو جاتا ہے۔ علاوہ ازیں داد و تحسین اور تالیوں کی گونج میں اس کے کلام کو پذیرائی بھی حاصل ہوتی ہے جو ایک نثر نگار کے حصے میں نہیں آتی۔ رضا علی عابدی نے اپنے ایک مضمون ''شاعری کا زور ہے نثر کیا بنے گا''؟ میں اچھی نثر نگاری پر توجہ مرکوز نہ کیے جانے پر حیرت و افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کچھ یہ تاثرات قلمبند کیے ہیں:

''مشاعروں کی شہرت اور مقبولیت سے مجھے کوئی گلہ نہیں۔ مجھے جو خیال ستاتا ہے وہ یہ کہ نظم گوئی اور غزل گوئی کا یہی عالم رہا تو اردو نثر کا کیا ہوگا؟ کون لکھے گا؟ عوام تک کیسے پہنچے گی؟ کیا کبھی اور کہیں نثر خوانی کی محفلیں بھی ہوں گی؟ کیا کبھی لوگ بے مثال نثر سننے بھی آئیں گے؟ کیا افسانے اور علمی مقالے بھی کسی مجمع کے سامنے پڑھے جائیں گے؟ کیا تاریخ نویس لوگوں کی محفلوں میں اپنی تحقیق کے کمالات مظاہرہ کر پائیں گے؟ کیا تحقیق کے ماہرین کھوج لگا کر اور نکال کر لائے ہوئے جواہر پارے کسی محفل میں پڑھیں گے اور کیا کسی کمال کی تحقیق پر مجمع سے یہ آواز آئے گی کہ واہ! کیا خوب دوبارہ پڑھیئے''؟

رضا علی عابدی نے اس جانب درست اشارہ کیا ہے کہ اردو نثر لکھنے والوں کی تعداد کم ہوگئی ہے اور غزل و نظم لکھنے والوں کی اکثریت پائی جاتی ہے۔ انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ لوگ اب بے مثال نثر سننے بھی آئیں گے جس طرح شاعری سننے کے لیے لوگ جمع ہوتے ہیں۔ ظاہری بات ہے کہ اب یہ روایت تقریباً ختم ہو چکی ہے کہ اچھی نثر سننے کے لیے لوگوں کی بڑی تعداد جمع ہو جس طرح مشاعرہ سننے کے لیے ہزاروں کی تعداد میں لوگ جمع ہوتے ہیں۔ اچھی نثر میں افسانوی اور غیر افسانوی نثر بھی شامل ہیں مثلاً خاکے، انشائیے، سفرنامے، سوانح، خودنوشت، رپورتاژ، آپ بیتی وغیرہ۔ غیر افسانوی نثر لکھی جا رہی ہے لیکن اس میں بھی بہترین خاکے اور انشائیے لکھنے والوں کا قحط ہے۔ اسی طرح افسانوی نثر بھی تحریر کی جا رہی ہے لیکن یہاں بھی چند بڑے افسانہ نگاروں کو چھوڑ کر نئے لکھنے والوں میں افسانے لکھنے کا رجحان کم ہے۔ اگر یہ لوگ افسانے لکھ بھی رہے ہیں تو ان کے افسانے، افسانے کے شرائط پر پورے نہیں اترتے۔ انہیں افسانے کی تکنیک سے لاعلمی ہے اور پلاٹ کے ساتھ ساتھ کرداروں کے ساتھ بھی انصاف نہیں کر پاتے ہیں۔ چند بڑے افسانہ نگار جن کا ملک میں افسانہ نگاری کے حوالے سے بڑا نام شمار کیا جاتا تھا وہ حالیہ دنوں میں ہم سے رخصت ہو گئے ہیں۔ یہاں نام لکھنے کی ضرورت نہیں۔ افسانے کا مستقبل تابناک نظر نہیں آتا کیوں کہ نئی نسل کو اس صنف سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے۔

جہاں تک سندی تحقیق کا معاملہ ہے تو دانشگاہوں میں اس کے لیے ادیبوں کی حیات و خدمات، شاعری اور افسانہ نگاری پر مقالے تحریر کیے جا رہے ہیں۔ زندہ ادیبوں پر بھی مقالے لکھ کر پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگریاں حاصل کی جا رہی ہیں، حالانکہ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ جس باحیات شخصیت پر ریسرچ اسکالر مقالہ لکھتا ہے تو وہ شخص پورا مواد مقالہ نگار کو فراہم کرتا ہے بلکہ بعض ادیبوں نے تو مقالے کا بیشتر حصہ لکھ کر مقالہ نگار کو دیا ہے اس کی بھی مثالیں ملتی ہیں۔ کلاسکی ادب پر کام نہیں ہو رہا ہے۔ بچوں کے ادب پر بھی تحقیقی مقالے لکھنے کا رجحان قابلِ رحم ہے۔ خواتین کے ادب یا زنانہ ادب پر ماضی میں متعدد رسائل نے خاطر خواہ مواد فراہم کیے ہیں لیکن آج کے ریسرچ اسکالرس کی توجہ اس جانب مبذول نہیں ہوتی۔ وجہ یہ ہے کہ آج کا سہل پسند محقق یا اسکالر کتب خانوں کی خاک چھاننا نہیں چاہتا۔ عرق ریزی و تلاش و جستجو سے اسے یارانہ نہیں، بس آسانی سے جس موضوع پر مواد دستیاب ہو جائے اس کو اپنی تحقیق کا موضوع بناتا ہے اور سال دو سال کے اندر اس کا مقالہ تیار ہو جاتا ہے۔ بعض اسکالرز تو پیسے دے کر پیشہ ورانہ مقالہ نگاروں سے پی۔ایچ۔ڈی کے مقالے تحریر کراتے ہیں، کیوں کہ ان کے پاس اتنی استعداد ہی نہیں ہوتی کہ وہ تحقیقی مقالہ خود لکھ سکیں۔ یہی وہ سہل پسندی ہے جس کے نتیجے میں اچھا ادب یا اچھی کتاب شائع ہو کر منظر عام پر نہیں آتی۔ ماضی کی شاندار روایت کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے، جہاں ایک سے بڑھ کر ایک شاہکار وجود میں آئے، لیکن موجودہ عہد تحقیق تدوین، تنقید، ترجمہ، افسانہ اور دیگر اصناف ادب میں شاہکار تخلیقات پیش کرنے سے قاصر ہے۔ اس کی وجہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ قرۃ العین حیدر نے ہماری سہل پسندی اور ادب کے تئیں ہماری عدم دلچسپی کے بارے میں بہت ہی واضح لفظوں میں لکھا ہے کہ ''جس طرح ہم اپنے متعلق سنجیدہ نہیں، اسی طرح اپنے ادب کے سلسلہ میں بھی لاپرواہ ہیں''۔ آگے وہ لکھتی ہیں:

''غلامی کے عہد میں دارالمصنفین اعظم گڑھ، جامعہ ملیہ اسلامیہ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد، دکن اور انجمن ترقی اردو نے ہزاروں کتابیں لکھ ڈالیں۔ تحقیق، تنقید، ترجمہ۔ کیسے کیسے شاعر پیدا ہوئے، صاحبِ طرز نثر نگار، چوٹی کے اسکالرز۔ ترقی پسند مصنفین کو تو چھوڑیے، ان کو تو بُرا کہنا اب فیشن میں داخل ہے کہ یہ لوگ گمراہ اور دہریئے تھے، مگر اللہ والے مسلمانوں نے بھی کیا کچھ نہیں لکھ ڈالا۔ بچوں کے لیے جامعہ ملیہ نے کیسا لٹریچر چھاپا۔ خود زنانہ ادب کا ایک پورا کتب خانہ ''عصمت'' اور ''تہذیبِ نسواں'' کے نام پر، مسکرانے کی ضرورت نہیں۔ ان کو آج ہم رجعت پسند سمجھ لیں، مگر اس عہد میں انہوں نے مسلمان عورتوں میں لکھنے پڑھنے کا ذوق عام کرنے کی بڑی زبردست خدمات انجام دیں۔ اس وقت عورتوں کے لیے کتنے اعلیٰ درجے کے رسالے نکلتے ہیں؟

بچوں کے لیے کتنی کتابیں لکھی گئی ہیں؟ کلاسکس پر کتنا کام ہوا؟ تخلیقی ادب میں ہم نے کون سے جواہر پارے پیش کیے ہیں؟اب اگر اردو میں نئی نئی کتابیں چھپواتا ہے تو مکتبہ ٔ فرینکلن، نیویارک''۔

تدوینِ متن کا عمل رشید حسن خان تک نہایت وقیع پیمانے پر ہوا۔اس کے بعد حنیف نقوی تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ حنیف نقوی کے بعد تحقیق اور تدوینِ متن کے حوالے سے کام نہیں ہو رہا ہے۔ پروفیسر ظفر احمد صدیقی نے اس حوالے سے کئی اہم کام کیے۔ لیکن ان رُجل جلیل کے گزر جانے کے بعد ایک طرح سے تدوین متن کی روایت جو مولوی عبدالحق سے شروع ہوئی تھی، وہ ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی پر ختم ہو چکی ہے۔ تحقیق کا میدان بالکل خالی ہے۔ یہ کام محنت اور عرق ریزی کا ہے لیکن اس ہوش ربا دور میں کسے فرصت ہے کہ وہ اس دیدہ ریزی کے عمل میں اپنا سر کھپائے۔ ابھی بھی ایسے نہایت اہم متون ہیں جو تدوین کے منتظر ہیں اور جن کی ادب کو شدید ضرورت ہے، لیکن اب یہ عمل ایک دم رُک سا گیا ہے۔ کاش اہل علم وفن اور ملک کی دانش گاہوں کے اساتذہ اس جانب توجہ دیتے اور کلاسیکی متون کو صحتِ زبان کے ساتھ منظر عام پر لانے کی کوشش کرتے تو یہ ادب کی بڑی خدمت ہوتی۔

ایک اہم نکتے کی جانب یہاں اشارہ ضروری معلوم ہوتا ہے وہ یہ کہ صطلاحات سازی کا عمل برسوں سے جمود کا شکار ہے۔ اردو میں گزشتہ پچاس برسوں میں بہت سے انگریزی اور ہندی کے الفاظ لکھنے پڑھنے اور بول چال کی زبان میں شامل ہو چکے ہیں، جنہیں ہم من وعن اپنی زبان اردو میں استعمال کرتے ہیں، حالانکہ تھوڑی سی توجہ کے بعد ان الفاظ کے اردو متبادل تلاش کئے جاسکتے ہیں یا ان الفاظ کے نعم البدل وضع کیے جاسکتے ہیں۔ اصطلاحات سازی پر کوئی بھی ادارہ، کوئی بھی تنظیم یا کوئی بھی دانش گاہ توجہ مبذول کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ انگریزی زبان کی تکنیکی و پیشہ وارانہ اصطلاحات اردو زبان کا آئے دن حصہ بنتی رہتی ہیں، جس کے باعث اردو کا ذخیرہ ثروت مند ہونے کی بجائے کم مائیگی کا شکار ہوتا جارہا ہے۔ یہی صورتحال دوسری زبانوں سے اردو میں ترجمہ ہونے والی کتابوں کا بھی ہے۔ ہمیں اس وقت انجمن ترقی اردو بورڈ کی نہیں بلکہ انجمن تحفظ اردو بورڈ کی ضرورت ہے۔ اصطلاحات کے حوالے سے جو کام گزشتہ پچاس برسوں میں ہوئے ہیں، ان میں کوئی گہرائی، معنویت اور علمیت نہیں پائی جاتی بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ اس مدت میں اصطلاحات سازی پر کوئی کام ہی نہیں ہوا ہے۔ محمد نعمان وحید بخاری اصطلاحات سازی اور تراجم کی موجودہ صورتحال پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اصطلاحات کی بات کی جائے تو عرصہ ٔ دراز سے یا یوں کہیے کہ گزشتہ نصف صدی سے کوئی بھی نئی اصطلاح اردو زبان کا حصہ نہیں بنی، جبکہ انگریزی زبان کی تکنیکی اور پیشہ ورانہ اصطلاحات اردو زبان میں آئے دن حصہ بنتی رہتی

ہیں۔جس کے سبب اردو الفاظ کا ذخیرہ تقریباً معدوم ہوتا جا رہا ہے۔یہی حال دوسری زبانوں سے اردو زبان میں ترجمہ ہونے والی کتب کا ہے۔اس کی ایک وجہ تو مترجم کا مقصدِ ترجمہ پیغام رسانی کا ہوتا ہے یا خیال سے متاثر ہوکر وہ اس کام کو انجام دیتا ہے، جس کے باعث مقصد تو پورا ہو جاتا ہے لیکن کوئی زبان سے متاثر نہیں ہو پاتا یا یوں کہیے کہ اردو زبان کی جانب نہیں آتا۔تراجم کی فہرست میں بھی موجودہ صورتحال میں دیکھا جائے تو انگریزی زبان سبقت لے گئی ہے۔دنیا بھر کے کلاسیکی ادب کا ترجمہ انگریزی میں ہو چکا ہے۔اگر تخلیق کے حوالے سے جائزہ لیا جائے تو بھی جدید علم میں جو اضافہ ہو رہا ہے وہ انگریزی میں ہو رہا ہے۔اگر کسی زبان میں ہوتا بھی ہے تو اسے فوری طور پر انگریزی میں ترجمہ کر دیا جاتا ہے''۔

ہندی والے اصطلاحات سازی اور تراجم کے معاملے میں ہم سے آگے ہیں۔انہوں نے ٹیلی ویژن کا ترجمہ دوردرشن اور ٹیلیفون کا دور بھاش کر لیا لیکن ہم نے یہ کام بھی نہیں کیا۔آج جدید ٹکنالوجی اور الکٹرانک میڈیا سے متعلق سینکڑوں الفاظ جو انگریزی کے ہیں، اردو کا حصہ بن چکے ہیں۔یہ الفاظ ہماری توجہ کے متقاضی ہیں۔ یہاں چند انگریزی الفاظ و اصطلاحات لکھے جا رہے ہیں، جو عام طور پر بول چال اور لکھنے پڑھنے میں استعمال ہوتے ہیں لیکن ان کے اردو تراجم موجود نہیں ہیں۔اس کے علاوہ بھی سیکڑوں اصطلاحیں ہو بہو اردو میں مستعمل ہیں جو انگریزی زبان کی ہیں۔مثال کے طور پر ٹیلی فون، ٹیلی ویژن، موبائل، کمپیوٹر، انٹرنیٹ، کی۔بورڈ، ہارڈ کاپی، سافٹ کاپی، ہارڈ ڈسک، مانیٹر، پرنٹر، ماؤس، اسکرین، لیپ ٹاپ، گیجٹس، واٹس اپ، چیٹنگ، ای میل، سوشل میڈیا، فیس بک، فیس بک پوسٹ، لائک، شیئر، ٹوئیٹر، انسٹا گرام، ویوز، کانفرنس، سمینار، سمپوزیم، آل انڈیا ریڈیو، پاس بک، نیفٹ، کرنٹ اکاؤنٹ سیونگ اکاؤنٹ، سی سی ٹی وی کیمرہ، ایمبولنس، وائرس، آدھار کارڈ، لائسنس، پاسپورٹ، آن لائن میٹنگ، ورچول میٹنگ، ماسک، سینیٹائزر، فیس شیلڈ، پی پی ای کٹ، لاک ڈاؤن، کونسلنگ، کال سنٹر، ریزرویشن، ٹکٹ، اسٹیشن، اسٹیشن ماسٹر، ٹی ٹی ای۔ٹی سی اسٹیشن وغیرہ۔یہ وہ الفاظ و اصطلاحات ہیں جو کئی برسوں سے ہماری زندگی کا حصہ بنے ہوئے ہیں ان کے علاوہ ہزاروں انگریزی کے الفاظ و اصطلاحیں ہماری زبان میں من وعن مستعمل ہیں جن کا ترجمہ اردو میں نہیں ہوا ہے جس کے باعث مجبوراً ہمیں انگریزی کے الفاظ استعمال کرنے پڑتے ہیں۔کاش اصطلاحات سازی کا بیڑا کوئی اٹھاتا یا قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی یہ ذمہ داری لیتی تو ایک بڑی ضرورت کی تکمیل ہو پاتی۔

اردو زبان کے اساتذہ اور طلبہ کے درمیان سب سے زیادہ استعمال ہونے والی لغت ''فیروز اللغات''

ہے جوکم وبیش ساٹھ سال قبل چھپ کر منظر عام پر آئی تھی ۔اس لغت پر 1967ء میں نظر ثانی کی گئی ۔اس کے بعد اب تک اس لغت میں کوئی ترمیم و اضافہ نہیں ہوا ہے، حالانکہ بہت سے الفاظ جو اردو میں دخیل ہیں، ان کے معانی اس لغت میں ملتے ہیں اور نہ ہی انگریزی کے اردو میں مستعمل الفاظ کا اندراج اس لغت میں پایا جاتا ہے۔اس لحاظ سے وقت کی ضرورت ہے کہ ''فیروز اللغات'' کی از سر نو ترتیب و تدوین کا عمل انجام دیا جائے ۔ نئے الفاظ شامل کیے جائیں اور نئی نئی اصطلاحوں کے معانی درج کیے جائیں ۔

ادب اطفال کے حوالے سے بھی کوئی قابل قدر کام نہیں ہو رہا ہے۔صرف چند رسالے دہلی ، رامپور اور جنوبی ہند کی ریاستوں سے نکلتے ہیں ۔ساہتیہ اکادمی انعام یافتہ حافظ کرناٹکی جیسے قلم کاروں کی ضرورت ہے جو ادب اطفال پر کام کر سکیں ۔اردو کے عام قاری کی تعداد میں اضافے کے لیے اردو کے اداروں کو خاص توجہ دینے کی ضرورت ہے۔اسی طرح بچوں کہانیوں ،اخلاقی قصوں ،اور سبق آموز حکایات کو پڑھنے کی جانب راغب کرنے کی کوشش کی جانی چاہئے ۔اس کے لیے فارسی کی گلستاں اردو دیگر اخلاقی کتابوں میں موجود کہانیوں اور حکایتوں سے استفادہ کرنا چاہیے۔حقیقت یہ ہے کہ بیشتر ترقی یافتہ گھرانوں اور تعلیم یافتہ خاندانوں میں انگریزی کا چلن عام ہے ۔ وہ اردو کو غیر ضروری تصور کرتے ہوئے خود بھی دوری اختیار کرتے ہیں اور اپنے بچوں کو بھی اردو زبان و ادب کی جانب متوجہ کرانے کی کوشش نہیں کرتے ۔اسی طرح خواتین کے لیے رسائل بھی کم ہی نکلتے ہیں ۔خواتین دنیا، ہما ڈائجسٹ اور پاکیزہ آنچل کے علاوہ چند ہی رسائل ہیں جن میں سلسلہ وار کہانیاں شائع ہوتی ہیں لیکن ان میں بھی خواتین کے لیے مخصوص گوشے نہیں ہوتے ۔ان کے مسائل پر ان رسائل میں کچھ بھی خاص نہیں ہوتا ہے ۔ نصف آبادی کے لیے ہمارے پاس کوئی ادبی سماجی یا سیاسی سرمایہ نہیں ہے، جسے یہ کہتے ہوئے ہم فخر کریں کہ دیکھو خواتین کے لیے کتنا کچھ کیا جا رہا ہے لکھا جا رہا ہے۔''عصمت'' اور ''تہذیب نسواں'' نے عورتوں میں لکھنے پڑھنے کا رجحان عام کیا لیکن آج ایسا کوئی خواتین کا رسالہ نہیں جسے تہذیب نسواں اور عصمت جیسے رسالوں کے ہم پلّہ قرار دیا جا سکے ۔آج ضرورت ہے کہ خواتین میں لکھنے پڑھنے کا رواج عام کیا جائے ۔اس طریقے سے ادب، سماج اور سیاست کے میدان میں خواتین کی حصہ داری ممکن ہو سکے گی اور ان کی حوصلہ افزائی بھی ہوگی ۔

جہاں تک کتابوں کی اشاعت کا سوال ہے تو آج کل بڑی تعداد میں نظم و نثر پر مشتمل کتابیں شائع ہو رہی ہیں ۔شعری مجموعوں کی تعداد کہیں زیادہ ہے ۔ان مجموعوں میں پیش لفظ کے تحت شاعر کی شان میں ایسے ایسے قصیدے پڑھنے کو ملتے ہیں جن میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیے گئے ہوتے ہیں ۔ زبان و بیان کی سینکڑوں

غلطیوں کے باوجود مجموعوں کو اردو ادب میں اضافے کا باعث قرار دیا جاتا ہے۔ یہی حال نثری کتابوں کا بھی ہے، جن میں مواد کم، غلطیاں زیادہ ہوتی ہیں۔ موجودہ عہد میں دھڑلے سے شائع ہونے والی کتابوں اور ان کی رسم اجرائی پر متعلق اختر علی خاں اختر چھتاری نے اپنے ایک مضمون ''اردو ادب عالیہ'' میں گہرا طنز کیا ہے:

''اس دور کم سوادی میں تخلیقی ادب کے نام پر اردو زبان کے ساتھ جو سلوک کیا جارہا ہے، اس کا بھیانک رُخ چند حواس باختہ ارباب قلم کی سہل انگاری ہے، جس کے نتیجے میں اردو کو ادب عالیہ سے بے تعلق کر کے اسے بیچ منجدھار میں چھوڑ دیا گیا ہے۔ کیوں کہ ان تن آسان اردو زبان کے ٹھیکے داروں کی نظر میں اردو ادب عالیہ ایک تو بہت ادق ہے اور دوسرے اس کا اردو کے موجودہ زمینی حقائق سے اب کوئی تعلق نہیں رہا ہے۔ یہ موجودہ زمینی حقائق کیا ہیں؟ سوائے مایہ علم وفن کی مفلوک الحالی کے اور کچھ نہیں۔ سو آج کل اردو شعر و ادب میں دھڑے بندیوں اور انجمن ہائے تحسینِ باہمی کے غوغائے سمع خراش نے اچھا خاصہ اودھم مچا رکھا ہے۔ برصغیر میں کوئی ہفتہ شاید خالی جاتا ہو کہ دیدہ زیب جلدوں اور رنگین گرد پوشوں میں لپٹی، قافیہ پیمائیوں اور تگ بندیوں سے لیس، زبان و بیان کی اغلاط سے لب ریز، مضامین سے تہی اور زمین و آسمان کے قلابے ملائی ہوئی ناروا تعریفی تقریظوں اور تبصروں سے آراستہ ایسی ایسی شعری مجموعوں کی دلہنیں نام نہاد ''رونمائی'' کے لیے لائی جاتی ہیں کہ جن کی ہیئت رونمائی پر تو کیا غایتِ طباعت پر سر دُھننے کو جی چاہتا ہے اور فاضل تقریظ نگاروں اور مبصروں کی کم نگاہی اور بے دیانتی و چشم پوشی پر کرب ناک افسردگی ہوتی ہے لیکن اس سے بھی زیادہ افسوسناک سانحہ یہ ہے کہ اس کم سوادی اور سہل انگاری کے دھمّالی ہلڑ میں ثقہ ادبا اور شعرا نے گوشہ نشینی اختیار کر رکھی ہے اور کوئی روکنے اور ٹوکنے والا میسر نہیں ہے.... ثقہ اہل شعر و ادب میں آج بھی ایسے لوگ ہیں جن کے نزدیک اردو زبان کے زمینی حقائق یہی ہیں کہ اسے ادب الاساتذہ سے ہم آہنگ رکھا جائے اسی میں اس زبان کی پائندگی اور زندگی کا راز مضمر ہے''۔

اردو زبان و ادب کی ترویج، فروغ، اشاعت اور تشہیر کے مقصد سے ملک کی کم و بیش تمام ریاستوں میں اردو اکادمیوں کا قیام عمل میں لایا گیا ہے۔ کچھ اکادمیاں قابل ستائش کام کر رہی ہیں اور کچھ اکادمیاں حاشیہ برداروں کی شکار ہو چکی ہیں۔ یہ اکادمیاں مسودوں پر جزوی مالی تعاون فراہم کرتی ہیں۔ کتابوں پر انعامات دیتی ہیں اور مستحق ادیبوں کی مالی اعانت بھی کرتی ہیں۔ کارنامۂ حیات کے اعزاز سے بھی ادیبوں کو نوازتی ہیں اور متعدد مشاہیر کے نام پر قائم کردہ انعامات کے زمرے میں کیسۂ زر اور سندِ امتیاز بھی ادیبوں اور شاعروں کو دیتی ہیں۔ آج کل ان اکادمیوں کی کارکردگی پر سوالیہ نشان قائم کیا جانے لگا ہے۔ یہ اکادمیاں غیر مستحق ادیبوں کو سفارش کی بنیاد پر

اور حاشیہ برداری کی وجہ سے انعامات دیتی ہیں اور کارہائے نمایاں انجام دینے والے فنکاروں کو حاشیے پر ڈال دیتی ہیں۔ جن مسودوں کو جزوی مالی تعاون دیئے جاتے ہیں، ان میں سے بیشتر مسودے ایسے ہوتے ہیں جن کی اشاعت اردو ادب کو نقصان پہنچانے کا کام کرتی ہے۔ ایک طرح سے ادب کی خدمت کی بجائے ادب کو نقصان پہنچایا جارہا ہے۔ یہی حال کتابوں پر انعامات دینے کا ہے۔ جو کتابیں دستاویزی، تحقیقی اور متن کے اعتبار سے مستند ہوتی ہیں، انہیں انعام سوم دیا جاتا ہے اور بعض سطحی اور غیر معیاری مضامین کے مجموعوں، افسانوی مجموعوں اور شعری مجموعوں کو انعام سے نوازتی ہیں۔ غرض یہ اکادمیاں سیاست کا شکار ہو چکی ہیں۔ یہاں بنیادی اور سودمند ادبی و تحقیقی کام نہیں ہوتا۔ سکریٹری اور چیرمین بھی اپنے مفاد کے پیش نظر اپنی میعاد پوری کر کے چلے جاتے ہیں، جو یہاں جلبِ منفعت کی غرض سے سفارشات کی بنیاد پر اپنی تقرری کرانے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ کاش ان اکادمیوں میں علمی اور تحقیقی کام کرنے والوں کو پراجکٹ فراہم کر کے اصطلاحات سازی، تراجم اور کلاسکی متون کی بازیافت جیسے موضوعات پر کام کرنے کا بیڑا اٹھایا جاتا اور حکومت سے ملنے والی خطیر رقم کا صحیح مصرف میں استعمال کیا جاتا، تو اکادمی کا مقصد ضرور پورا ہوتا۔ یہ حقیقت ہے کہ اردو اکادمیاں کام تو کر رہی ہیں لیکن ان کی سمت و رفتار پر سوالیہ نشان قائم کیے جاتے رہے ہیں۔

جہاں تک ادیبوں کی خدمات کے اعتراف کا سوال ہے تو جو ادیب، شاعر، افسانہ نگار متحرک ہیں اور شاہکار تخلیقات پیش کر رہے ہیں۔ اہم معلوماتی، مفید، اور کارآمد کتابیں شائع کر رہے ہیں، جو کتابیں ادب میں اضافے کا باعث قرار دی جاسکتی ہیں، ان ادیبوں کی حیات میں ہی ان کی حوصلہ افزائی، قدر دانی، ستائش اور خراج تحسین پیش کیا جانا چاہیے۔ ان کی تخلیقات پر سمینار اور مجلسیں منعقد کی جانی چاہیے۔ ان پر مقالے تحریر کیے جانے چاہیے جن میں ستائش کے ساتھ ساتھ تنقید کا پہلو بھی نمایاں ہو۔ ہمارے یہاں یہ روایت ہے کہ جب کوئی بڑا قلم کار، ادیب شاعر افسانہ نگار، ناقد، محقق اور مدّون کی موت واقع ہو جاتی ہے، تو اخبارات و رسائل میں متعدد مضامین خراج عقیدت کے طور پر شائع کرائے جاتے ہیں۔ کاش یہ تحریریں اس ادیب کی زندگی میں وجود میں لائی جاتیں تو اس کی حوصلہ افزائی کے ساتھ ساتھ اسے خوشی بھی ہوتی۔ ہمیں اپنی اس روش کو تبدیل کر دینا چاہیے اور زندہ فنکاروں کی ان کی زندگی میں ہی قدر دانی کرنے کا رواج عام کیا جانا چاہیے۔

اردو کا مستقبل نوجوانوں سے وابستہ ہے۔ یہ نوجوان ہاتھ کی ایک انگلی کی مدد سے دنیا کی سیر کر لیتا ہے۔ اچھی تخلیقات کو سراہتا ہے۔ اس کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتا ہے۔ جو چیز اسے اچھی معلوم ہو یا جن

کی اسے ضرورت ہو وہی اس کی ضرورت ہوتی ہے۔آج کے نوجوان سے آپ ملک و بیرون ملک کے متعدد مسائل اور موضوعات پر گفتگو کر سکتے ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ صرف کتاب خوانی کو ہی ضروری تصور نہیں کرتا بلکہ ایک اسکرین پر پوری دنیا دیکھتا ہے۔پوری دنیا کے بارے میں پڑھتا اور سنتا ہے۔اس کی دنیا ٹکنالوجی سے شروع ہو کر ٹکنالوجی پر ہی ختم ہوتی ہے۔اس طرز زندگی نے نوجوانوں کو کتابوں سے دور کر دیا ہے، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اردو زبان کا تمام تر خزانہ کتابوں میں بند ہے۔ان حالات کے پیش نظر نئی نسل کو اردو زبان سے روشناس کرانے کے لیے ٹکنالوجی کا سہارا لینا ہوگا۔چند اصول تدریس کو اپنانا ہوگا۔ایسی تخلیقات کو اولیت دینی ہوگی جو آج کے نوجوان طبقے کو اردو زبان سے نہ صرف وابستہ کریں بلکہ ان کے تعلق کو مستحکم بنانے راہ ہموار کریں۔

اخبارات، رسائل اور جرائد بڑی تعداد میں شائع ہو رہے ہیں۔ الکٹرانک میڈیا بھی اردو کے پروگرامس نشر کر رہے ہیں۔اردو کے متعدد نیوز چینلس ان دنوں سرگرم عمل ہیں۔جن پر مشاعروں کے علاوہ ادبی مباحث، سماجی موضوعات اور تعلیمی مسائل پر گفتگو ہوتی ہے لیکن بیشتر ٹی وی نیوز چینلس پر اردو خبریں پڑھنے والے اصحاب اردو زبان کی درست ادائیگی نہیں کر پاتے ہیں۔انھیں اضافتوں کا صحیح استعمال نہیں آتا۔غرض کم پڑھے لکھے اردو نیوز ریڈرس غلط تلفظ اور غلط لہجے کے ساتھ اردو پڑھتے ہیں جس سے اردو کی شیرینی اور اس کی اثر آفرینی ختم ہو جاتی ہے۔اخبارات کی کثیر تعداد یہ بتاتی ہے کہ اردو کے قارئین کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان اخبارات کو پڑھنے والے بیشتر معمر افراد یا مدارس کے فارغین اور اساتذہ ہوتے ہیں۔نئی نسل کو اخبار سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔وہ زیادہ سے زیادہ ان اخبارات کے پی ڈی ایف فائل اپنے موبائل اسکرین پر پڑھ لیتی ہے۔ رسائل و جرائد کے خریداروں کی تعداد میں اضافہ کی بجائے کمی واقع ہو رہی ہے۔اردو زبان و ادب کی تدریس سے وابستہ افراد کی بیشتر تعداد ایسی ہے جو ان رسائل کی خریدار نہیں ہے۔کچھ رسائل کم و بیش پچاس برسوں سے نہایت پابندی سے شائع ہو رہے ہیں لیکن انہیں کسی طرح کی کوئی مالی امداد نہیں ملتی ہے۔اس کی ایک مثال ماہنامہ شاعری (بمبئی) ہے جو گزشتہ نوے برس سے جاری ہے۔اس کی مالی مدد کی جانی چاہیے جس کی ان دنوں شدید ضرورت ہے۔ رسائل میں کسی ادیب کے مضمون کی اشاعت بھی ایک مسئلہ بن چکا ہے۔ مدیران کی خواہش ہوتی ہے کہ مضمون اچھوتے موضوع پر ہو، غیر شائع شدہ ہو اور اس کی کمپوزنگ اور پروف ریڈنگ مضمون نگار خود کر کے ای۔ میل کے ذریعہ ان پیج فائل میں ان کے رسالے کو فراہم کرے۔ادیب کی یہ مجبوری ہوتی ہے کہ وہ بڑی محنت سے مضمون لکھتا ہے، پھر اسے ٹائپ کراتا اور اس کے بعد تصحیح کے عمل سے اسے گزارنے کے بعد رسالے کے ای۔میل

پتے پر ارسال کرتا ہے۔ مضمون ٹائپ کرانے میں اسے پانچ سو تا چھ سو روپے خرچ کرنے پڑتے ہیں۔ اس کے باوجود اس کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کا مضمون جلد شائع ہو جائے۔ وہ اس کے لیے بار بار مدیر کو فون کرتا ہے اور چند ماہ بعد اس کا مضمون شائع ہو جاتا ہے تو وہ اپنے خیر خواہ افراد، دوست احباب اور ادب دوست اصحاب کو فون کر کے اس بات کی اطلاع دیتا ہے کہ میرا فلاں مضمون فلاں رسالے کے فلاں شمارے میں شائع ہوا ہے۔ بعض قلم کار تو اس رسالے کی پی ڈی ایف فائل بھی اپنے دوستوں کو بھیج دیتے ہیں تاکہ وہ شخص اس مضمون کو پڑھ کر اپنے تاثرات کا اظہار کر سکے۔ ہر ادیب اور فنکار کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کی نگارشات یا تخلیقات کو سراہا جائے اور یہی اس کی سب سے بڑی کمائی ہوتی ہے جس سے حوصلہ پا کر وہ اپنی تخلیقی کاوشیں پیش کرنے کا عمل جاری رکھتا ہے، حالانکہ کسی ادیب کا قول ہے کہ ''ادب تخلیق کرنا سراسر گھاٹے کا سودا ہے''۔ اس کے باوجود ادیب اپنا فرض نبھاتا ہے۔

آج کل ادب سے استفادہ کی راہیں آسان ہوگئی ہیں۔ اب کتب خانوں میں جانے کی ضرورت کم ہی پیش آتی ہے۔ ادب کا معتدبہ حصہ انٹرنیٹ کی زینت بن چکا ہے۔ بس ایک کلک کی دیر ہے، آپ کے سامنے آپ کا مطلوبہ مواد موجود ہوگا۔ ریختہ ڈاٹ کام نے ہزاروں کلاسکی متون، شعری اور نثری کتابوں کو اپنی سائٹ پر محفوظ کر رکھا ہے۔ اس سے استفادے کی خاطر خواہ ضرورت ہے۔ ریختہ والوں کا یہ کام قابل ستائش اور لائق تقلید ہے۔ علاوہ ازیں اردو کے فروغ میں جشن ریختہ، جشن اردو، جشن اردو افسانہ، عالمی اردو افسانہ میلہ، غزل مقابلہ، بیت بازی مقابلہ، مشاعرہ طرحی مشاعرہ، وغیرہ اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ اردو چینل، زی سلام، نیوز 18، عالمی سہارا، 4 ٹی وی، روبی چینل، ٹی ٹی وی، دوردرشن کے ڈی ڈی اردو وغیرہ پر اردو پروگرامس اور مشاعرے پیش کیے جاتے ہیں۔ ناظرین کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ معیاری اخبارات انقلاب، اودھ نامہ، آگ، سیاست، مصنف، اعتماد، ہمارا سماج، ہندوستان وغیرہ میں ادبی موضوعات پر کارآمد مضامین شائع ہوتے ہیں۔ سمینار بھی پہلے سے زیادہ منعقد ہو رہے ہیں۔ قومی کونسل کے اشتراک سے پورے ملک میں سمیناروں کا اہتمام ہو رہا ہے، جو ایک خوش آیند امر ہے لیکن ان سمیناروں کے موضوعات خالص علمی و تحقیقی ہونے چاہئیں تاکہ ادب میں کوئی خاص اضافہ ہو سکے۔ طنز و مزاح کے حوالے سے بھی سمینار منعقد کئے جانے چاہئیں۔ ہندوستان میں اب کوئی بڑا طنز و مزاح نگار نہیں رہا ہے۔ مجتبیٰ حسین کے انتقال کے بعد اس خلا کو پُر کرنا مشکل امر معلوم ہوتا ہے۔ تاہم اُمید کی جانی چاہیے کہ کوئی نہ کوئی اس میدان میں اپنا نام ثبت کرنے میں کامیاب ہوگا۔ ادب کے اس حقیقی منظرنامے سے ہمیں مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔

ادبی وشعری نشستیں ادب وشعر کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ادبی نشستیں اردو زبان کے لیے اور خصوصاً نئی نسل کے لیے ایک تربیت گاہ کا درجہ رکھتی ہیں۔اگر کسی بڑے فن کار، ادیب، شاعر، یا افسانہ نگار کی موجودگی میں کوئی نوجوان ادیب یا نومشق قلم کار کا فن کار یا افسانہ نگار کی کوئی تخلیق پڑھ کر سنائے گا تو اس پر جو شاعر یا ادیب کا ردعمل یا تاثر ہوگا وہ بھی اس نئے قلم کار کے لیے سیکھنے کی چیز ہوگی۔ایک طریقے سے اس قلم کار کی اصلاح بھی ہوگی اور مستقبل میں اسے اچھا سے اچھا ادب تخلیق کرنے کا حوصلہ بھی ملے گا،لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اب اس طرح کی نشستوں کا قحط پڑ چکا ہے۔بس تہنیتی، تعزیتی اور کتابوں کی رسم اجرا کے لیے ہی ادبی نشستیں منعقد ہوتی ہیں، جن میں سوائے قصیدہ خوانی کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ایسی ادبی نشستوں کی روایت کو فروغ دینے کی ضرورت ہے۔مشاعروں کے مشہور ناظم اور شاعر یوسف دیوان نے مشاعروں یا شعری نشستوں کے مقابلے ادبی نشستوں کو موجودہ وقت میں اولیت دیتے ہوئے کہا کہ ''مشاعروں کے مقابلے ادبی نشستیں کم کم منعقد ہونے کے باوجود کسی نہ کسی سطح پر ادب کے فروغ میں معاون ثابت ہورہی ہیں، کیونکہ ان سے نیا ٹیلنٹ سامنے آرہا ہے لیکن مشاعروں کی صورتحال دگرگوں ہے''۔انہوں نے مشاعروں کے حوالے سے یہ بات بھی کہی کہ مشاعروں کی آج کل شبیہ بگڑ چکی ہے۔یہ ادبی مافیا ہوگئے ہیں۔ان میں اب زبان کے فروغ سے زیادہ کسی صاحبِ اقتدار یا صاحبِ حیثیت کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔اسی وجہ سے محسوس ہوتا ہے کہ مشاعروں کے مقابلے ادبی نشستیں زیادہ بہتر ہیں۔کم از کم وہاں اس طرح کی بے ادبی تو نہیں ہوتی۔''

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مشاعرے اپنی افادیت کھو چکے ہیں۔نہ مشاعرے کے آداب ورسوم باقی رہ گئے ہیں اور نہ ہی اس کی تہذیبی شناخت باقی رہ گئی ہے۔اب مشاعرے فقط تفریحِ طبع کا ایک ذریعہ بن کر رہ گئے ہیں، جن کا نہ کوئی وقار باقی رہ گیا ہے اور نہ ہی معیار۔اب مشاعروں میں اداکاری، مسخرہ پن، پھکڑ پن اور جسمانی نمائش کو فروغ حاصل ہو چکا ہے۔راحت اندوری نے آج کل کے مشاعروں کے بارے میں یہاں تک کہ دیا ہے کہ:

ادب کہاں کا ، کہ ہر رات دیکھتا ہوں میں
مشاعروں میں ، تماشے مداریوں والے

سیماب اکبرآبادی نے مشاعروں کی تہذیب اور موجودہ مشاعروں کی صورتحال کے مطابق جو کچھ لکھا ہے، اس کی ایک جھلک ملاحظہ کیجئے۔''آج کل کے مشاعرے صرف تفریحی، رسمی اور قطعاً دماغ فرسا ہوتے ہیں۔

جن میں چند تفریح پسند افراد جمع ہوکر رات کا ایک بڑا حصہ تالیوں اور قہقہوں میں سیاہ کر دیتے ہیں۔ ایسے ہی مشاعروں کا نتیجہ ہے کہ مشاہیر اور ثقہ شعرا نے مشاعروں میں جانے سے قدم روک لیا ہے، ورنہ پہلے یہی مشاعرے تھے جن میں اساتذہ اور منتخب شعرا سر آنکھوں سے شریک ہوتے تھے اور مشاعروں کے انعقاد کا انتظار ''شامِ عید'' کی طرح کیا جاتا تھا۔ (ماہنامہ شاعر بمبئی ،شمارہ جون 2019 صفحہ 2) اب مشاعروں کی مضحکہ خیز صورتحال کو دیکھ کر سر پیٹ لینے کو جی چاہتا ہے۔ کاش مشاعروں کو اردو کے فروغ کے ذریعہ کے طور پر منعقد کیا جاتا اور مشاعرے کی تہذیب کی پاسداری کی جاتی تو اردو کی بڑی خدمت ہوتی۔

اردو زبان و ادب کے حوالے سے ان دنوں سمیناروں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے اشتراک سے یہ سمینار پورے ملک میں منعقد کیے جاتے ہیں اور خصوصاً مارچ کے مہینے میں سینکڑوں سمینار منعقد ہوتے ہیں، جن میں منتظمین مشاعرہ اپنے خیر خواہ، خاص الخاص اصحاب کو شرکت کی دعوت دیتے ہیں اور یہی لوگ مقالے پڑھتے ہیں۔ ان مقالوں میں گہرائی کم اور مانگے کا اجالا زیادہ ہوتا ہے۔ اِدھر اُدھر سے نقل کر کے راتوں رات مقالے تیار ہو جاتے ہیں اور مقالہ نگار سمینار میں اسے پڑھ کر خوشنودی حاصل کر لیتا ہے۔ کچھ طلبہ اور کچھ سامعین کے علاوہ چند اساتذہ شریک سمینار ہوتے ہیں۔ کھانے پینے کا اچھا نظم ہوتا ہے۔ سمینار کے اختتام کے بعد ملک کے مؤقر اخبارات و رسائل میں سمینار کی رپورٹس اور تصاویر نہایت اہتمام سے شائع ہوتی ہیں۔ یہ سمینارز ادب کی موجودہ صورتحال، تحقیق و تدوین، اصطلاحات سازی، تراجم، جیسے عنوانات کی بجائے کسی ادبی شخصیت کی حیات و خدمات پر منعقد ہوتے ہیں۔ استثنائی صورتیں ہر جگہ موجود ہوتی ہیں لیکن ان سمینارز سے کچھ نیا ادب تخلیق ہوکر منظر عام پر نہیں آتا۔ فقط روایتی موضوعات و مضامین کی پیش کشی عمل میں آتی ہے۔ حالانکہ اختراعی طور پر بہت کچھ منظر عام پر لایا جا سکتا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق ہندوستان میں علاقائی، صوبائی اور بین الاقوامی سطح کے تقریباً 20 ہزار سمینار ہر سال منعقد ہوتے ہیں لیکن اس کا حاصل کیا ہوتا ہے، اس سے ہم سبھی اچھی طرح واقف ہیں۔ بقول فارسی شاعر فردوسی بہ مشورت مجلس آراستند نشستند و گفتند و برخاستند۔ مختصر لفظوں میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ادب کا حقیقی منظر نامہ خوش کن نہیں ہے۔ ہمیں اردو کے فروغ کے لئے سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اردو قاری کی تعداد کیسے بڑھے، اس جانب توجہ دینے کی ضرورت ہے اور نیا ٹیلنٹ کس طرح فروغ پائے اس سلسلے میں اقدامات کرنا وقت کا تقاضہ ہے۔

عبدالصمد کے ناول 'کشکول' پر ایک نظر

ڈاکٹر سرور حسین (پٹنہ)

موبائل : 8936833113

کووڈ-۱۹ کی عالمی وبا دنیا بھر میں محض انسانی زندگی کی بقا کے لیے ہی خوفناک اثرات کی حامل نہیں کہی جائے گی، بلکہ اس کے دوررس اثرات نے پورے انسانی معاشرے کی صورت کو ہی جس طرح بدل کر رکھ دیا ہے وہ حیرت ناک بھی ہے اور تشویش کا باعث بھی۔ بلاشبہہ عالمی سطح پر دوسری عالمگیر جنگ کے تباہ کن اثرات اور ہماری قومی سطح پر تقسیمِ ہند اور اس کے نتیجے میں ۱۹۴۷ء کے فرقہ وارانہ فسادات کے ہولناک نتائج کے بعد یہ عصری تاریخ کا سب سے بڑا تباہ کن واقعہ ہے۔ اس کے سبب ہماری معیشت، سیاست اور تہذیب و معاشرت میں جو نمایاں تبدیلی سامنے آئی ہے وہ آنے والے طویل عرصے تک ہماری زندگی پر اپنے نقوش مرتب کرتی رہے گی۔ بے شمار قیمتی انسانی زندگیوں کے زیاں کے علاوہ وہ لوگ جن کے سروں کو کم سے کم ایک چھت کا سہارا حاصل تھا اور دو وقت کی روٹی کی ضمانت مل رہی تھی آج بری طرح پامال نظر آتے ہیں۔ دوسری طرف ان حالات سے فائدہ اٹھا کر زندگی کے لیے لازمی وسائل پر ناجائز اختیار اور دبدبہ حاصل کر لینے والوں کی بھی کمی نظر نہیں آتی۔ اس صورتِ حال نے انسانی جبلت کے تضاد کو بھی جس طرح نمایاں کیا ہے وہ اس سے قبل دیکھنے کو نہیں ملتے۔ اگر ان حالات میں بھی انسان کی فطرت کی ازلی دردمندی، محبت، خلوص اور بے لوث خدمات کی عملی تصویر ابھر کر سامنے آئی تو اس کی خود غرضی، حرص و ہوس، مفاد پرستی اور اخلاقیات کے جھوٹے مظاہرے بھی بے نقاب ہوئے۔ عام حالات میں سماج کے خوش حال طبقے زندگی کے بنیادی حقوق سے محروم سماج کے جس ٹھکرائے ہوئے دست نگر مفلس طبقے کے وجود کو ناپسندیدہ تصور کرتے ہیں، قدرتی آفات و مصائب کے اوقات میں وہی طبقہ ان کے لیے نجات کا تصور بن جاتا ہے۔ یہ طبقاتی نظام پر اصرار کرنے والی وہ فکر ہے جو ہمارے اخلاقیات کے کھوکھلے پن اور مذموم تصور نجات کی قلعی کھول کر رکھ دیتی ہے۔ عبدالصمد کا حال ہی میں منظرِ عام پر آنے والا ناول 'کشکول' اس صورتِ حال کی خوبصورت اور

کامیاب عکاسی کرتا ہے۔

'کشکول' کا تانا بانا بھکاریوں کی زندگی اور ان کے سماج کو نگاہ میں رکھ کر تیار کیا گیا ہے۔ بھکاری جو صحت مند سماج کے وجود کے لیے مہلک تصور کیے جاتے ہیں عام طور پر سماج کے ناپسندیدہ حصہ ہونے کے سبب الگ تھلگ زندگی گزارنے پر مجبور نظر آتے ہیں۔ لیکن کسی غیر اختیاری اور قدرتی آفات کی صورتِ میں ان کی حیثیت اور اہمیت سماج کے ناگزیر حصے کے طور پر مسلم تسلیم کی جانے لگتی ہے۔ ناول سے لیے گئے ذیل کے اقتباس میں اس صورتِ حال کی خوبصورت تصویر کشی دیکھی جا سکتی ہے:

''سبھی بھکاری خوشی سے اچھل پڑے۔ پہلی بار انھیں اپنی حیثیت کا ادراک ہوا ورنہ آج تک تو وہ اپنے آپ کو سماج کے جسم کا سڑا ہوا حصہ ہی سمجھتے آئے تھے۔ انھیں یہ کہاں پتہ تھا کہ وہ اس کا ناگزیر حصہ بھی ہیں۔''

(کشکول، ص: ۵۰)

عبدالصمد ایک باشعور فکشن نگار ہیں۔ ان کی باریک نگاہیں محض سطح پر نظر آنے والی صورتِ واقعہ تک محدود نہیں ہوتیں بلکہ گہرائی میں اتر کر حقیقت کی بازیافت کو ضروری سمجھتی ہیں۔ انھیں احساس ہے کہ سماج کے جسم کے سڑے ہوئے یہ حصے بھلے ہی عام حالات میں اپنا کوئی مقام نہ رکھتے ہوں اور مروجہ سماج بھی جن کے وجود کو ایک اکائی کے طور پر تسلیم نہیں کرتا ہو لیکن ان کا اپنا سماج اور ان کی اپنی دنیا عصری سماج کے فکری دیوالیہ پن کے سبب اپنی اہمیت کا احساس ان کو دلاتی رہتی ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ عام حالات میں جن بھکاریوں کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا جاتا ہے یا ان کی ضرورتوں سے لوگوں کو کوئی مطلب نہیں ہوتا، مصیبت کے اوقات میں وہی لوگ انھیں اپنی نجات کا ذریعہ سمجھ کر ان پر اپنے التفات کے خزانے کھول دیتے ہیں۔ اگر چہ اس عمل میں بھی ان کی خود غرضی ہی اس کی محرک ہوتی ہے۔ تاہم یہ بھکاری انسانی فطرت کی اس کمزوری سے بخوبی واقف ہوتے ہیں اور اس سے فائدہ اُٹھانے کا ہنر بھی جانتے ہیں۔ اُنھیں حکومت اور انتظامیہ کی کمزوری کا بھی علم رہا ہے جن کے بنائے ہوئے قوانین ان کی حیثیت میں کوئی تبدیلی پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ ناول سے ذیل کا یہ اقتباس دیکھیں:

''انھوں نے کچھ تبادلۂ خیال کیا، پھر ان میں جو سینئر تھا بولا۔

''ان لوگوں کا کیا کرنا چاہئے۔ یہ تو بیماری پھیلانے کے سب سے بڑے ذریعہ ہیں۔ ان کے کپڑے صاف ہیں، نہ ان کے چہروں پر ماسک ہے، یہاں پر تو بدبو کی وجہ سے زیادہ دیر کھڑا بھی نہیں ہوا جاتا.......''

ایک سپاہی بولا

''انھیں بھگائیں بھی تو کہاں بھگائیں سر، ان کا کوئی ٹھکانہ تو ہے نہیں جہاں جا کر انھیں بند کر دیں......''

سینئر کچھ دیر سوچتا رہا، پھر بولا

''پھر بھی کچھ تو کرنا ہی ہوگا ورنہ ہم پر الزام آجائے گا کہ ہم نے جان کر انھیں نظر انداز کیا اور بیماری کو پھیلنے دیا۔ تعجب ہے محلے والوں پر کہ وہ کیسے برداشت کیے ہوئے ہیں۔ اس طرح تو ان سب کی جان خطرے میں ہے ....''

دوسرے سپاہی نے اپنی رائے دی۔

''انھیں اس وقت یہاں سے بھگا بھی دیں گے تو کسی دوسری جگہ میں جا پڑیں گے۔ ان کے لیے تو کوئی حل ڈھونڈھنا ہی ہوگا نا......''

سینئر نے اسے گھور کر کہا۔

''حل ڈھونڈنا ہمارا کام نہیں ہے بھائی، جن کا کام ہے انھیں فیصلے کرنا ہے۔ ہم تو ان کے فیصلے کو لاگو کرانے والے لوگ ہیں۔ اب پتہ نہیں ان لوگوں کے بارے میں فیصلہ کرنے کا موقع کب ملے گا، ملے گا بھی یا نہیں، کون جانے ....''

مذکورہ بالا اقتباس ہمارے فرسودہ عصری سماج پر ایک گہرا طنز بھی ہے اور ہمارے سیاسی نظام کی نا اہلی کی بے باک عکاسی بھی جو ہر مسئلے کا حل پیش کرنے کا دعویٰ ضرور کرتا ہے لیکن در حقیقت اس کے پاس ان کا کوئی حل نہیں ہوتا۔ وہ دوسروں کے تحفظ کی ذمہ داریوں کے لیے جواب دہ بتایا جاتا ہے لیکن وہ خود اپنی ذات کے تحفظ کے اندیشے سے اس طرح دو چار ہوتا ہے کہ اپنی ڈیوٹی تک ایمانداری سے بجالانا اس کے لیے ممکن نہیں ہو پاتا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ حکومت کے بنائے گئے بیشتر قوانین غیر حقیقی اور غیر منطقی ہونے کے سبب سماج کے ہر طبقے پر نافذ العمل ہونے کے لائق نہیں ہوتے۔ ان بھکاریوں کے ساتھ بھی یہی صورت ابھرتی ہے۔ اس کی ایک وجہ تو ان کی سماجی حیثیت ہے اور دوسری ان کا طرزِ رہائش۔ خود ان بھکاریوں کو احساس ہے کہ ان کا وجود اربابِ اقتدار کے لیے ایک ایسا مسئلہ ہے جس کا آج تک کوئی مستقل حل تلاش نہیں کیا جا سکا ہے۔ یہی سبب ہے کہ عام شہریوں کے برخلاف یہ لوگ لاک ڈاؤن میں بھی سماجی فاصلہ خیزی کی پابندی سے آزاد رہ جاتے ہیں۔ یہ صورتِ حال ہمارے قوانین کے کھوکھلے پن اور کمزوری کا بھی احساس دلاتی ہے اور ہمارے اربابِ اقتدار کی بے بسی کا تماشہ بھی پیش کرتی ہے۔

ناول کا پلاٹ ایک عام سے سیدھے سادے قصے پر ترتیب دیا گیا ہے۔ قصے کی بنیاد اس لاک ڈاؤن پر

رکھی گئی ہے جوحکومت اور انتظامیہ کی جانب سے کووڈ ۱۹ کی وبا کو پھیلنے سے روکنے کے مقصد سے ملک بھر میں نافذ کیا گیا تھا۔ انتظامیہ کے افسران اور پولیس کے محکمے کو اس پر سختی سے عمل درآمد کے لیے جواب دہ بنایا گیا تھا۔ لیکن انتظامیہ کے لیے اصل مسئلہ شہر کی گلی کوچوں میں جگہ جگہ پھیلے ہوئے بھکاریوں پر اس حکم کا اطلاق تھا۔ کیونکہ ان بھکاریوں کا نہ تو کوئی مستقل ٹھکانہ تھا اور نہ ہی کوئی باضابطہ ذریعہ معاش۔ ان کی زندگی تو دوسروں کے ذریعہ دی گئی امداد پر منحصر ہوا کرتی ہے جو لاک ڈاؤن کی صورت میں سماجی فاصلہ خیزی کے سبب اور بھی مشکل ہو گئی تھی۔ دوسرے ان کے جسم کی گندگی اور اس سے پھوٹنے والی بدبو کے باعث انتظامی عملے کے افراد ان کے قریب جا کر انھیں پکڑنا دھکڑنا یا چھونا قطعی پسند نہیں کرتے۔ چنانچہ کافی غور و خوض اور حیل و حجت کے بعد کسی این جی او کے تعاون سے پندرہ دنوں تک ان کے لیے کھانے پینے کے نظم کی ضمانت مل جانے پر انھیں شہر سے باہر ایک لاوارث قبرستان میں رہنے کے لیے آمادہ کیا جا سکا۔ تاہم یہ مسئلے کا مستقل حل نہیں تھا۔ اسی درمیان ملک میں لاک ڈاؤن کے سبب ہر قسم کے کاروبار اور کل کارخانوں کے بند ہو جانے کے نتیجے میں اپنے آبائی شہروں اور گاؤں کی طرف لوٹنے والے مزدوروں کی ٹولیاں بھی وقتی طور پر قیام کے لیے ایسی ہی لاوارث جگہوں پر آ کر رکنے لگیں جہاں انہیں مفت کھانا پینا فراہم ہو سکتا تھا۔ ان میں ایسے افراد بھی تھے جن کا اب اپنے گاؤں اور شہر میں بھی کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ اگر چہ ان نئے آنے والے مزدوروں کی حالتِ زار پر یہاں مقیم بھکاریوں کو ہمدردی بھی تھی تاہم انھیں حاصل ہونے والی ایک محدود خوراک میں ان نئے آنے والے افراد کی حصہ داری ہو جانے کے باعث اُن میں ایک نفسیاتی بے چینی کی کیفیت بھی پائی جاتی تھی۔ قبرستان میں قیام پذیر بھکاریوں کا یہ رویہ فطری تھا۔ ہمدردی اور اندیشے کا یہ متضاد رویّہ صرف بھکاریوں میں ہی نہیں بلکہ ہمارے عصری سماجی نظام میں آج محنت مزدوری کرنے والا عام انسان بھی جس صورتِ حال سے متصادم ہے اس کے سبب ہمدردی اور اندیشے کی ایسی ہی متضاد کیفیت میں جینے پر مجبور ہے۔ پھر یہ تو بھکاری ٹھہرے۔ زندگی کیا ان کے لیے تو مرنے کے بعد بھی دو گز زمین کے حصول کی کوئی ضمانت نہیں ہوتی۔ بہر کیف ناول آگے بڑھتا ہے۔ قبرستان میں آنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا جب کہ صفائی کا وہاں کوئی معقول انتظام نہ تھا۔ چنانچہ یہ خوفناک وبا وہاں بھی پھوٹ پڑتی ہے اور اس لاعلاج بیماری کے حملے کا شکار ہو کر کئی بھکاری جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ لیکن انتظامیہ اور میڈیا کی سطح پر اس خبر کو دبا دیا جاتا ہے۔ کیونکہ اوّل تو یہ موت ان لوگوں کی ذات سے تعلق رکھتی تھی جن کی کوئی سماجی حیثیت نہیں تھی اور دوسرے یہ حفاظتی عملے اور حکومت کو سوالوں کے گھیرے میں لا کر کھڑا کر سکتا تھا۔ یہ صورتِ حال سرکاری انتظامیہ اور حکومتی فیصلے کی ناکامی کا مظہر کہی جا

سکتی ہے تو بعض غیر سرکاری تنظیموں کی بے لوث اور سچی خدمت گزاری کے دعووں پر بھی سوالیہ نشان لگاتی ہے۔

ماجرا کسی ناول کا ایک اہم عنصر ہوتا ہے۔ یہ ماجرا کسی وحدانی قصے پر بھی مبنی ہو سکتا ہے اور کثیر الواقعاتی قصوں پر بھی۔ دراصل ناول میں قصہ گوئی ماجرا کی جان ہوتی ہے جہاں دیگر قصے مرکزی قصّے کے گردار تکاز کرتے ہیں اور اینٹی کلائمکس پر پہنچ کر قاری پر ایک مجموعی نقش مرتب کرتے ہیں۔ زیرِ نظر ناول کا پلاٹ ہنگامی نوعیت کا حامل ہے جو کثیر الواقعاتی قصوں پر مبنی نہیں۔لیکن ہنگامی نوعیت کے واقعات پر استوار ناولوں میں قصے کی کمزوری یا کردار نگاری کا اکہرا پن اکثر رپورتاژ کی کیفیت کا احساس پیدا کرنے لگتا ہے۔ ''کشکول'' کا موضوع ہنگامی نوعیت کا حامل ہونے کے باوجود کافی وسعت اور امکانات کا حامل نظر آتا ہے جس میں واقعہ نگاری اور کردار نگاری کے لیے بڑے امکانات کی موجودگی کو مسترد نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم زیرِ نظر ناول کے مطالعے کے دوران قاری کو اس کی کمی واضح طور پر محسوس ہوتی ہے۔ کیونکہ ناول کی تحریر کا مقصد محض صورتِ واقعہ کی سچی تصویر کشی یا زندگی کیسی ہے کا بے لاگ اظہار ہی نہیں ہوتا بلکہ زندگی کو کیسا ہونا چاہیے اس کی نشان دہی بھی ہوتی ہے۔ ناول محض واقعات کا بیان یا قصہ گوئی نہیں زندگی کا فلسفہ بھی ہوتا ہے جو قصّے کے پسِ منظر سے ہی ابھرتا ہے اور قاری کے لیے بصیرت کا سرچشمہ بن جاتا ہے۔ تاہم یہاں ممکن ہے موضوع کی ہنگامی نوعیت کے احساس کے سبب اسے انتہائی عجلت میں لکھا جانا ضروری سمجھا گیا ہو اور جس کے باعث ناول نگار کو اس طرف توجہ دینے کی فرصت نہیں مل سکی ہو۔

قصّے کا مرکزی کردار شبراتی ہے جو پیشہ ور بھکاری نہیں۔لیکن راجو چاچا جیسے معذور کردار کے سامنے شبراتی کا کردار بے جان سا لگتا ہے۔ شبراتی کا کردار ایک عام سی زندگی گزارنے والے انسان کا کردار ہے جس میں کوئی جوش، کچھ نیا کرنے کا جذبہ یا اپنی شخصیت کا کوئی نقش مرتب کرتا ہوا کہیں سے نظر نہیں آتا۔ ناول کے آخر میں اس میں تھوڑی سی جان ضرور پیدا ہوتی ہے لیکن وہ بھی کسی بڑے مقصد کی تکمیل کے لیے نہیں بلکہ بھکاریوں کو محض صدقے اور خیرات کی رقم اور کھانے کی حصولیابی کے لیے متحرک کرنے کے لیے سامنے آتی ہے۔ راجو چاچا کے کردار میں البتہ ایک جہاندیدہ شخص اپنے تجربے اور مشاہدے کی روشنی میں فکری سطح پر قاری کو ضرور متاثر کرتا ہے لیکن عملی سطح پر یہ بھی کسی انقلابی روش کے مظاہرے سے یکسر عاری ہے۔ اس کے فکر و عمل میں جو تھوڑی سی آگ نظر بھی آتی ہے وہ محض اس کی پیشہ ورانہ چالاکی اور مفاد پرستی کے اظہار تک محدود ہے، بھکاریوں کی زندگی میں کوئی مثبت بنیادی تبدیلی پیدا کرنے یا نئے امکانات کی تلاش کی غرض سے نہیں۔ تاہم قبرستان میں موجود ایک بھکاری کے مزدور بھائی کا کردار نسبتاً زیادہ متحرک اور حوصلہ بخش ہے۔ یہ شخص دور دراز کے کسی شہر میں جس کا نام ناول میں

نہیں بتایا گیا کسی کاٹن مل میں کام کرتا تھا اور لاک ڈاؤن کے دوران مل کے بند ہو جانے کے باعث بہ ہزار دقت لٹتا پٹتا ہوا مجبوری کی حالت میں اسی قبرستان میں آ کر ٹھہرتا ہے۔ لیکن اسے نہ تو وہاں کا ماحول پسند آتا ہے اور نہ بھکاریوں کا فکر و عمل۔ مجبوری کی حالت میں اگر چہ وہ اپنی بیوی اور بچوں کو وہاں صدقہ و خیرات کی نیت سے آنے والے کھانے کھانے سے روک نہیں پاتا لیکن خود ایسے کھانے کو قبول نہیں کرتا۔ وہ محنت و مزدوری کی کمائی پر یقین رکھتا ہے۔ قبرستان میں جہاں دوسرے بھکاری اور وہاں آنے والے کچھ مزدور بھی مفت کے کھانوں اور کام چوری کی زندگی میں عافیت محسوس کر رہے تھے، وہ خود محنت مزدوری کی تلاش میں ہر صبح نکل جاتا۔ اگر چہ شام کو اسے مایوس لوٹنا پڑتا۔ لیکن وہ ہمت نہیں ہارتا ہے۔ دوسرے مزدوروں کے علاوہ اپنے بھکاری بھائی کو بھی سمجھانے کی وہ ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔ اگر چہ اس کی نصیحت کا ان پر کوئی اثر نظر نہیں آتا تاہم یہ انسانی زندگی کے مثبت مقاصد کی راہ میں انسان کے فکر و عمل کی ایک قابلِ تحسین سعی کہی جاسکتی ہے۔ ناول میں اس کا کردار ان سیکڑوں ہزاروں بے بس و بیکس محنت کشوں کی تکالیف و ایذا اور قربانیوں کی یاد روشن کر دیتا ہے جو گذشتہ لاک ڈاؤن کے دوران ہمارے معاشرے کی سنگدلی اور بے حسی کی بھینٹ چڑھا دیئے گئے تھے۔ ناول میں اس کردار کے حوالے سے جس صورتِ حال کی تصویر کشی کی گئی ہے اس سے محنت کش طبقے کی ایمانداری، سچائی اور قوتِ تخلیق کا بھی احساس ہوتا ہے اور اس سماجی و سیاسی نظام کا بھی پردہ فاش ہوتا ہے جو محنت کش طبقے کو اس کی بقا، ترقی اور حفاظت کی بجائے تنزلی، استحصال اور فاقہ کشی کی دلدل میں دھکیل کر گداگری اختیار کرنے پر مجبور کرنے میں مصروف ہے۔ ناول میں بلاشبہ اس شخص کا کردار دوسرے کرداروں میں امتیازی کہا جائے گا۔ اس کے کردار میں وسعت کی کافی گنجائش تھی اور اسے اگر بھرپور وسعت دی جاتی تو یہ ناول کا مرکزی کردار ہو سکتا تھا۔ ناول میں ان کرداروں کے علاوہ کوئی ایسا دوسرا کردار نہیں جو ہماری توجہ مبذول کراتا ہو۔

ناول کا بیانیہ سہل، عام فہم اور رواں ہے۔ ناول کا ڈکشن بول چال میں مستعمل عام فہم زبان پر مبنی ہے جس میں ہندی کے علاوہ انگریزی کے بھی کئی الفاظ کا استعمال کیا گیا ہے لیکن یہ وہ الفاظ ہیں جو پڑھے لکھے طبقوں میں عام طور پر بے ساختہ مستعمل ہیں اس لیے یہ ناول کی روانی پر کوئی اثر نہیں ڈالتے۔

یہ واقعہ ہے کہ زیرِ نظر ناول عصری سماجی و سیاسی زندگی کے پسِ منظر میں سماج کے ایک مخصوص طبقے کے حوالے سے کئی اہم اور نازک پہلوؤں کو زیرِ بحث لانے میں کامیاب ہے۔ اس میں بھکاریوں اور عصری سماج کے عمل و ردِ عمل کے حوالے سے حقیقتِ حال کی خوبصورت عکاسی کی گئی ہے۔ تاہم مستقبل کے حوالے سے اس میں

کسی نئے امکان کی کوئی صورت نکلتی نظر نہیں آتی ۔ یا کہا جا سکتا ہے کہ سماج کے ایک غیر متعلق طبقے کی زندگی کے حوالے سے عصری سماج کے ردِ عمل کے اظہار اور وبائی دور میں ان کے تجربات کی سچی اور سنجیدہ عکاسی کے باوجود ناول کے انجام سے کوئی واضح مقصد یا پیغام ملتا نظر نہیں آتا۔ ناول نگار چاہتا تو اس میں اس کی فکری جہت نئے امکانات کی صورت پیدا کر سکتی تھی۔ لیکن جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے کہ ناول کے انجام کو عجلت میں تکمیل تک لے جانے کی ناول نگار کی سعی نے شاید اسے اس کا موقعہ نہ دیا ہو۔ پھر بھی انسانی شخصیت پر پڑی دوہری نقاب، موت کو برحق گردانتے والوں کے اپنی جان سے زیادہ عزیز رشتوں کے جھوٹے دعووں کی قلعی کھولتا ہوا، زندگی سے خود غرضی کی حد تک بے رحم لگاؤ اور مذہب کی جھوٹی اخلاقیات کو تار تار کرتے ہوئے قصے پر مبنی یہ ناول ہمارے عصری سماج پر ایک گہرے طنز کی حیثیت یقیناً رکھتا ہے۔ اس حیثیت سے اس ناول کے مطالعے کی اہمیت ضرور روشن ہوتی ہے۔

☆☆☆

اردو میں مقالہ نگاری کے اصول

ڈاکٹر عبدالمتین (دھنباد)

موبائل : 7870837161

مقالہ اُس قسم کی تحریر کو کہتے ہیں جس میں کیسی موضوع یا شخصیت کے بارے میں پوری تحقیق کے ساتھ بحث کی جائے تا کہ وہ موضوع ہر لحاظ سے مکمل اور مدلل بیان ہو مقالہ کے لغوی معنی بات یا گفتگو کے ہیں۔ اصطلاح میں کسی خاص موضوع پر علمی و تحقیقی انداز میں تحریری اظہار کو مقالہ کہا جاتا ہے۔

مقالے تنقیدی اور تحقیقی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ ان کی زبان بھی تنقیدی اور تحقیقی ہوتی ہے۔ مقالے میں سنجیدہ اور عالمانہ بحث ہوتی ہے۔ یہ عام قارئین کے لیے نہیں بلکہ خاص لوگوں کے لیے لکھا جاتا ہے مقالہ میں حقائق کی بازیافت کی جاتی ہے اس میں شواہد، تجربہ اور تاثرات کا دیانت داری سے مطالعہ اور استدلالی گفتگو کی روشنی میں نتائج اخذ کیے جاتے ہیں مقالہ نگار کلی حیثیت سے غیر جانبدار ہوتا ہے تاہم تنقید کا رویہ بھی اپنایا جاسکتا ہے مقالہ میں موضوع سے متعلق مفید معلومات بہم پہچانے کے ساتھ ساتھ مباحث کی گنجائش ہوگی جس کی وجہ سے مقالہ کافی طویل ہو جاتا ہے مقالہ کی تکمیل کے لیے کافی چھان بین، تحقیق اور تدقیق کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے موضوع کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ اور پھر خود مقالہ نگار کے زاویہ فکر کا اندازہ اہم قرار پاتا ہے۔

مقالہ کی اقسام

1:۔ تخریجی 2:۔ تحقیقی

☆ تخریجی مقالہ کی اقسام

1:۔ تاریخی 2:۔ مذہبی 3:۔ تہذیبی 4:۔ سائنسی

5:۔ شخصیات پر 6:۔ کتب کے تعارف پر

☆ تحقیقی مقالہ کی اقسام

1:۔تاریخی

2:۔تہذیبی وثقافتی

3:۔شخصیات پر

4:۔سائنس کے کسی موضوع پر

5:۔مفقود الخبر اشیاء کومنظر نامہ پر لانا

تخریجی مقالہ کیا ہوتا ہے؟

کسی معین موضوع پر مختلف کتب ورسائل اوراخبارات سے حوالہ جات لے کریکجا کرنا اورایک ترتیب کے ساتھ اسے مزین کرنا۔

تاریخی تخریجی مقالہ

ایسا مقالہ جس میں کسی قسم کی تاریخ کو یکجا کرنا مقصود ہو۔

مذہبی تخریجی مقالہ

ایسا مقالہ جس میں کسی مذہبی فرقہ،شخصیت،کتاب یا دیگر شعائر پر لکھے گئے مواد کو اکٹھا کرنا مقصود ہو۔

تہذیبی تخریجی مقالہ

کسی معین مذہب یا جگہ کی تہذیب پر لکھی گئی کتب سے اس جگہ کی تہذیب کے بارے میں مواد یکجا کرنا۔

سائنسی تخریجی مقالہ

ایسا مقالہ جس میں سائنس کے شعبہ میں سے ایک معین موضوع پر جوریسرچز پیش کی جاچکی ہوں ان کو ایک جگہ یکجا کرنا۔

شخصیات پرتخریجی مقالہ

ایسا مقالہ جس میں کسی بھی قسم کی شخصیت مثلاً سائنس دان،فلاسفر وغیرہ پر لکھے گئے مواد کو کتب ورسائل اوراخبارات سے ایک جگہ یکجا کرنا۔

کتب کے تعارف پرتخریجی مقالہ

معروف کتب کے تعارف پر جومواد اکٹھا کر کے مقالہ لکھا جائے اسے اس زمرہ میں لے کر آئیں گے۔

تحقیقی مقالہ کیا ہوتا ہے؟

کسی ایسے موضوع پر مقالہ رقم طراز کرنا جس پر اس سے پہلے کسی نے کچھ نہ لکھا ہو۔ یا لکھا تو ہو مگر تسلی بخش نہ ہو۔ یا اس پر مزید لکھا جا سکتا ہو۔ اس کے لئے اپنی نئی ریسرچ کے ذریعہ مواد اکٹھا کیا جاتا ہے۔ پہلے مفروضے، پھر تجربے کئے جاتے ہیں۔ اور نتیجے اخذ کئے جاتے ہیں۔ یا مختلف اشخاص سے مل کر موضوع سے متعلق علم کو اکٹھا کیا جاتا ہے۔

تاریخی تحقیقی مقالہ

ایسا مقالہ جس میں کسی شخصیت، مقام یا کسی بھی چیز کی تاریخ کو ایک جگہ محفوظ کرنا مقصود ہو۔ اس کے لئے سب سے اول ماخذ وہ تحریرات ہیں جو اسی زمانہ میں لکھی گئی ہوں یا اس جگہ سے تعلق رکھتی ہوں۔ زمانہ کے اعتبار سے اس وقت کے کسی شخص کی ڈائری کے اوراق، اس وقت کے رسائل اور اخبارات، یا مطبوعہ و غیر مطبوعہ ریکارڈ ممد و معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔ اور دوسرا ذریعہ وہ اشخاص ہیں جو اس زمانہ سے تعلق رکھتے ہوں یا اس جگہ سے تعلق رکھتے ہوں۔ تیسرا ذریعہ ان اشخاص کی تحریریں ہیں یا ان سے روایات کرنے والے لوگ۔

تہذیبی و ثقافتی تحقیقی مقالہ

ایسا مقالہ جس میں ایسی قوم، یا ایسے مذہب کی ثقافت اکٹھی کی جائے جس پر ابھی کسی نے قلم نہ اٹھائی ہو یا لکھا تو ہو مگر تسلی بخش نہ ہو۔ یا مفقود الخبر ہو چکا ہو۔

کسی قوم یا مذہب کے لوگوں کی تہذیب و تمدن اور ثقافت پر لکھنے کے لئے ان لوگوں میں چند ایام گزارنا ضروری امر ہے۔ ان کے بزرگان سے مل کر اس بارے میں پوچھا جائے۔ ان کے متعلق مضامین کا بغور مطالعہ کیا جائے۔ اس سے قبل تہذیب و تمدن کے متعلق علم مکمل ہونا چاہئے کہ کسی قوم کی تہذیب و تمدن سے کیا مراد ہو سکتی ہے۔ اور کون کون سی چیز اس میں آ سکتی ہے۔

شخصیات پر تحقیقی مقالہ

کسی وفات یافتہ شخصیت پر مقالہ لکھنے کے لئے اس کے خاندان کے افراد سے رابطہ ازحد ضروری ہے۔ پھر اسکے دوستوں سے اور جہاں وہ کام کرتا تھا اس ماحول کے باسیوں سے اس شخص کے متعلق معلومات اکٹھی کرنا۔

اگر کسی نے اسکا ذکر کتب یا رسائل یا کسی اخبار میں کیا ہو تو وہ اکٹھا کرنا۔ سب سے اہم اسکی ڈائری دیکھنا اگر اس کو لکھنے کی عادت تھی۔ پھر اسکے مضامین اگر وہ لکھتا تھا تو وہ بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ جن جن اشخاص کا اس کے

ساتھ کوئی واسطہ رہا ہو۔ان سے بھی ملا جا سکتا ہے۔اسی طرح اگر مواد تسلی بخش نہ ہو تو جن اشخاص نے اس کو دیکھا ہو ان سے بھی ملا جا سکتا ہے۔

سائنس کے کسی موضوع پر تحقیقی مقالہ

سائنس وسیع سبجیکٹ ہے۔اس کے مختلف پہلوؤں میں سے کسی ایک کو لے کر اس پر ریسرچ کرنا۔اس کے لئے لیبارٹری کی ضرورت بھی ہوسکتی ہے۔اس کے علاوہ دقیق مطالعہ سے جو نتائج آپ اخذ کرتے ہیں اس کو آپ ایک مقالہ کی صورت میں لکھ سکتے ہیں۔غرض کے مفروضہ کے بعد تجربہ کر کے اور پھر اس سے نتائج اخذ کر کے بالترتیب انکو لکھ دینا اور اپنی بات کو مختلف مثالوں سے ثابت کر دینے سے اس پر مقالہ تحریر کیا جا سکتا ہے۔

مفقودالخبر اشیاء کو منظر نامہ پر لانا

ایسی اشیاء جو پرانے زمانہ میں استعمال ہوتی تھیں مگر اب وہ مفقود کے زمرہ میں داخل ہو رہی ہوں انکو متعارف کروانا۔اس مقالہ میں کسی بھی مفقودالخبر کو لیا جا سکتا ہے خواہ وہ جانور ہو،حشرات الارض میں سے ہو، انسان ہو، یا انسان سے متعلقہ ہو۔مثلاً ان سواریوں کو لیا جا سکتا ہے جو آج سے 1400 سال پہلے یا دوسرے الفاظ میں آج سے 150 سال پہلے بھی استعمال ہوتی تھیں مگر اب وہ استعمال نہیں ہوتیں یا شاذ کے طور پر استعمال ہوتی ہیں۔

مقالے کی ہیئت

ماہرین کے نزدیک معیاری مقالہ اسے کہا جاتا ہے جس کی ہیت درج ذیل اجزاء پر مشتمل ہو:

ا۔سروق:

مقالے کی ابتداء سرورق سے ہوتی ہے۔اس پر درج ذیل باتوں کا لکھنا ضروری ہے:

ا۔مقالہ کا عنوان

۲۔مقالہ نگار کا نام، ولدیت، بمعہ مکمل پوسٹل ایڈریس

۳۔قیادت مجلس، حلقہ کا نام

۴۔مقالے کے کل الفاظ کی تعداد

۵۔صدر مجلس/امیر ضلع کے دستخط

۲۔ہدیہ تشکر:

اس صفحہ پر مقالہ نگاران افراد اور اداروں کا شکریہ ادا کرے جنہوں نے مقالہ کی تیاری میں اس کی کسی بھی نوعیت کی مدد کی ہوتی ہے۔ شکریہ مدد کرتے وقت مبالغہ اور چاپلوسی سے اجتناب کیا جائے۔

۳۔فہرست مضامین:

کلمات تشکر کے صفحے کے بعد مقالے کے مضامین (مشمولات) کی فہرست دی جاتی ہے۔ دیباچہ/تمہید/مقدمہ/پیش لفظ۔ مقدمہ پر مشتمل پر نمبر دو طرح سے لگائے جاسکتے ہیں۔ ایک حروف تہجی کے اعتبار سے اور دوسرے اعداد کے اعتبار سے۔

۴۔ابواب:

مقدمہ کے بعد اصلی موضوع شروع ہو جاتا ہے: موضوع کو عام طور پر ابواب، فصول، مباحث، یا صرف فصول اور مباحث میں بانٹ دیا جاتا ہے۔

۵۔ملحقات اور ضمیمے:

مقالہ سے متعلقہ مواد لکھتے وقت کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جو اہم تو ہوتی ہیں مگر انہیں متن میں ذکر کرنا مناسب نہیں رہتا۔ ایسی باتوں کو مقالہ میں ملحقات یا ضمیموں کے طور پر شامل مقالہ کر دیا جاتا ہے۔

۶۔مصادر و مراجع کی فہرست:

یہ کسی بھی تحقیقی مقالے کی ہیئت کا آخری حصہ ہوتا ہے۔ مصادر و مراجع کی فہرست کی بجائے کچھ محققین کتابیات (Bibliography) لفظ کا استعمال کرتے ہیں۔

مقالہ کے اجزاء

ٹائٹل پیج

خوبصورت ٹائٹل پیج جس پر مقالہ کا عنوان، مقالہ نگار کا نام، رہائش وغیرہ کا اندراج کیا جائے۔ بیک گراونڈ میں اگر مقالہ سے متعلقہ تصویر ہو تو وہ بھی لگائی جاسکتی ہے۔

تعارف مقالہ نگار

مقالہ نگار مختصر تعارف اپنے مقالہ کی ابتداء میں درج کرے۔ رائے بزرگان اپنا مقالہ کسی بزرگ سے پڑھوا کر اس سے مقالہ سے متعلق رائے درج کروائی جائے۔

پیش لفظ

مقالہ نگار پیش لفظ درج کرے۔جس میں اپنے مقالہ کا خلاصہ اور مقالہ لکھتے ہوئے جو کمی بیشی رہ گئی ہو یا مشکل پیش آئی ہو وغیرہ اس کا ذکر مختصر پیرائے میں کر دے۔

انڈیکس

اپنے مقالہ کے مرکزی مواد کے عناوین کا انڈیکس شروع میں درج کرے جس سے قاری کو مقالہ کا مضمون سمجھنے میں آسانی پیدا ہو۔اور اگر اس کے پاس وقت نہ بھی ہو تو وہ عناوین کو پڑھ کر اپنی ضرورت کے عنوان کے تحت لکھے ہوئے اقتباس کو پڑھ لے۔

اصل مواد

انڈیکس کے بعد مقالہ نگار اصل مواد کو ہیڈنگ،سب ہیڈنگ اور ضرورت پر تیسری ہیڈنگ بنا کر انکے تحت تقسیم کرے۔

مقالہ نگار اس بات کا خیال رکھے کہ جہاں مین ہیڈنگ شروع ہو رہی ہو وہاں سے پیج کا آغاز ہو رہا ہو۔ ایسا نہ ہو کہ وہاں پیج ختم ہو رہا ہو۔اس سے پڑھنے والے پر برا امپریشن پڑتا ہے۔

حوالہ جات

اصل مواد کے تحت جن جن کتب سے حوالہ جات کا اندراج کیا ہوا ہو۔انکا مکمل حوالہ فٹ نوٹ میں درج کرنا۔

اشاریہ

اصل مواد کے اختتام پر اشاریہ کا اندراج کیا جاتا ہے جو درج ذیل چیزوں پر مشتمل ہوتا ہے:۔

1:۔مضامین

مقالہ میں مختلف قسم کے مضامین کی فہرست حروف ہجاء کے مطابق ترتیب دے کر مع صفحہ نمبر ایک جگہ اکٹھے کر کے لکھنا۔

2:۔اسماء

مقالہ میں جو اسماء آئیں ان کو حروف ہجاء کی ترتیب پر ایک جگہ معہ صفحہ نمبر اکٹھے کر کے لکھنا۔

3:۔مقامات

مقالہ میں جن مقامات کا ذکر ہو ان کو حروف ہجاء کی ترتیب کے مطابق فہرست میں لکھنا اور ان تک

پہنچنے کے لئے صفحہ نمبر کا اندراج کرنا۔

4:۔ کنایات

مقالہ میں جن کنایات کا ذکر ہو ان کو حروف ہجاء کی ترتیب کے مطابق فہرست میں لکھنا اور ان تک پہنچنے کے لئے صفحہ نمبر کا اندراج کرنا۔

5:۔ مراجع مصادر

مقالہ لکھتے ہوئے جن جن کتب و رسائل اور اشخاص سے امداد لی گئی ہو ان کی فہرست لکھنا۔

مقالے کی خصوصیات اور اصول

چونکہ مقالہ اس رپورٹ کو کہتے ہیں جسے کوئی محقق اپنے تحقیقی کام کو تکمیل کے بعد پیش کرتا ہے۔ ایک معیاری مقالہ گروہ ہوتا ہےجس کی تیاری میں درج ذیل ان اصولوں کا لحاظ رکھا گیا ہو:

مواد کی ترتیب و تنظیم

مقالہ نگاری کا ایک اصول یہ ہے کہ موضوع سے متعلق جمع شدہ مواد کو اچھے اسلوب میں مدون و مرتب کیا جائے۔ مواد کی ترتیب و تنظیم کے مرحلہ پر پہنچ کر محقق کو چاہئے کہ:

i۔ وہ اپنے خیالات اور علم کی ایک شکل مقرر کرلے

ii۔ صرف متعلقہ مواد کو خوب احتیاط کے ساتھ منظم و مرتب کرے۔ یہ حقیقت ہے کہ کام کسی بھی نوعیت کا کیوں نہ ہو اس کی ترتیب و تنظیم عمدہ ہو تو اسے پذیرائی بھی ملتی ہے۔

ان مقاصد کے حصول کی خاطر ضروری ہے کہ محقق پہلے تحریری شکل میں ایک خاکہ تیار کرلے۔ اس طرح مطالعہ کی صورت حال اس کے ذہن میں واضح ہو جائے گی اور اس کے مطابق وہ اس کو خوب صورت انداز میں پیش کر سکے گا۔ تحریری خاکہ سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ مقالہ کے مختلف اجزاء کا ربط واضح ہو جاتا ہے۔ مقالے کا ہر ایک حصہ باہم مربوط ہونا چاہئے۔ تب ہی اس کو صحیح معنوں میں معیاری مقالہ کہا جا سکتا ہے۔ مواد کی تنظیم و ترتیب میں خاکہ کی افادیت یہ بھی ہے کہ اس کی روشنی میں ابواب کے عنوان اور ذیلی سرخیاں بنائی جا سکتی ہیں۔ اس کام کو احتیاط سے کرنا چاہئے کیونکہ سرخیاں قاری کے لئے تمام مواد کو ایک نظر میں پیش کرتی ہیں، اس کی مدد کرتی ہیں کہ وہ مقالہ میں اپنے مطلب کی چیز پالے۔

۲۔ تسوید مقالہ

مقالہ سے متعلقہ مواد کو منظم و مرتب کر لینے کے بعد اسے لکھنے کی باری آتی ہے۔ اصطلاح میں اسے ''تسوید'' کہتے ہیں۔ تسوید مقالہ بہت اہم مرحلہ ہوتا ہے۔ اس پر پہنچ کر محقق کو اپنے موضوع سے متعلقہ مرتب شدہ مواد کو استعمال کرنا ہوتا ہے۔

ماہرین لکھتے ہیں:

مواد کی ترتیب کے بعد مقالہ لکھنے کا کام شروع ہوتا ہے۔ اس مواد کی تلاش، چھان بین اور ترتیب میں جس محنت، دیانت اور وقت نظر کا ثبوت دیا گیا ہے، مقالہ کی تسوید میں بھی اس کا اہتمام ضروری ہے۔ واضح فکر، مواد کی منطقی ترتیب، صحیح ترجمانی اور مؤثر طرز تحریر میں ایک قطعی رشتہ ہے۔ جس سے مقالہ کی تحریر میں عالمانہ شان اور محققانہ وقار پیدا ہوتا ہے۔

آغاز تحریر کے اصول

تحریر کا آغاز موضوع سے کرنا

مقالے کی تحریر کا آغاز براہ راست اپنے موضوع سے کرنا ہی اچھا اور سائنسی طریقہ کار سمجھا جاتا ہے۔ طویل تمہید اور تبصروں سے پرہیز کرنا چاہئے کیونکہ اس سے مقالہ کی ضخامت بڑھ جاتی ہے جو ایک عیب سمجھا جاتا ہے۔ مقالہ کی قدر و قیمت اس بات سے نہیں جانچی جاتی کہ محقق نے اپنے موضوع کے بارے میں کتنا کہا ہے۔ بلکہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس نے کیا کہا ہے اور کس انداز سے کہا ہے۔ بعض محققین بظاہر خوبصورت لیکن موضوع سے غیر متعلقہ بیانات اور غیر ضروری معلومات مقالے میں شامل کر کے اس حجم کو بڑھا دیتے ہیں لیکن واضح طور پر کسی اہم نتیجے پر پہنچتے ہوئے معلوم نہیں ہوتے۔ اس لئے براہ راست موضوع سے شروع کرنا مقالہ نگاری کا اہم اصول ہے۔ وہ مقالہ جس کی تیاری میں اس اصول کا لحاظ رکھا گیا ہو وہ معیاری کہلاتا ہے۔

اسلوب تحریر

مقالے کے لئے اس کے اسلوب تحریر کا معیاری ہونا لازمی ہے۔ اہل علم حضرات اس حقیقت سے بخوبی آشنا ہیں کہ ایک اہم اور عمدہ بات کو اگر دلکش انداز میں بیان نہ کیا جائے تو اس کی طرف سامعین اور قارئین متوجہ نہیں ہوتے۔ اس کے مقابلہ میں عام سی بات کو اگر اچھے انداز میں پیش کیا جائے تو وہ ان کی توجہ کا مرکز بن جاتی ہے۔

اس مقصد کے حصول کے لئے محقق کو خوب محنت اور لگن سے کام کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ جو

بات بھی لکھے سوچ سمجھ کر موقع محل کے مطابق سیدھے سادھے انداز میں لکھے اور قاری کے لئے اس میں دلچسپی و لگن پیدا کرے۔

انداز تحریر کی خصوصیت

انداز تحریر ہر ایک شخص اور موضوع کے اعتبار سے تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ مقالہ کے اسلوب تحریر کو دو خصوصیات سے مزین ہونا چاہئے ایک سنجیدگی اور دوسری اثر۔ ان دونوں کے ساتھ تکمیل، وحدت اور وضاحت وغیرہ کو بھی شامل کیا جاسکتا ہے۔

مقالے کی زبان

مقالے کی زبان عام فہم، سادہ اور دلکش ہو۔ ثقیل اور طویل نوعیت کے جملوں سے گریز کیا جائے۔ جس زبان میں مقالہ لکھا جارہا ہے اس کے علاوہ کسی دوسری زبان کے الفاظ استعمال نہ کئے جائیں۔ اگر استعمال ضروری ہو تو انہیں بریکٹ میں لکھا جائے۔

ماہرین نے زبان کے متعلق درج ذیل تجاویز پیش کی ہیں:

i۔ مقالہ عام طور پر زمانہ ماضی یا ماضی قریب میں لکھا جائے۔

ii۔ ضمائر متکلم (میں، ہم، میرا، ہمارا وغیرہ) کا استعمال نہیں کرنا چاہئے۔

iii۔ گنتی کیا عداد اگر سو تک ہوں تو ان کو حروف میں لکھا جانا چاہئے سو سے زائد گنتی کو اعداد میں لکھا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ اگر جملے کی ابتدا گنتی سے ہوتی ہے تو ان کو حروف میں ہی لکھنا چاہئے۔

الفاظ کا استعمال

معیاری مقالہ وہ ہوتا ہے جس کے جملوں میں عام فہم، سادہ اور مناسب و موزوں الفاظ کا استعمال موقع ومحل کے مطابق کیا گیا ہو۔ زیادہ طویل، مرکب، غیر مستعمل اور فرسودہ الفاظ کے استعمال سے مقالہ کا مفہوم واضح نہیں ہوتا۔ الفاظ کے استعمال کے بارے میں یہ مشورہ بھی دیا جاتا ہے کہ جدید انداز میں واضح کئے ہوئے الفاظ تخلیقی ادب میں چاہےکتنی ہی اہمیت رکھتے ہوں، لیکن تحقیقی مقالے میں اس کا استعمال ایک نقص ہی سمجھا جائے گا۔ مقالہ میں مقامی یا بازاری الفاظ کا استعمال بھی ناپسندیدہ ہوتا ہے۔ ان کے استعمال سے زبان کی سنجیدگی ختم ہوجاتی ہے۔

جدت

اچھے مقالے کی ایک خوبی یہ بھی ہوتی ہے کہ اس میں کسی نہ کسی طرح کی جدت اور نیا پن پایا جاتا ہو۔ تحقیق کے میدان میں جدت کئی طرح کی ہوسکتی ہے، مثلاً:

i۔ معلوم اور معروف مواد کو نئے اور مفید اسلوب میں مرتب و مدون کیا جائے۔

ii۔ منتشر مواد کو ایک عنوان کے تحت مدون و مرتب کیا جائے۔

جملوں اور پیرا گرافز میں ربط

ایک اچھے مقالہ کی اندرونی خوبی یہ ہوتی ہے کہ اس کے جملے آپس میں مربوط ہوتے ہیں اور اس میں کسی قسم کا انقطاع اور بُعد نہیں ہوتا۔ وہ سادہ، آسان اور واضح ہوتے ہیں۔ اسی طرح پیرا گراف کے درمیان میں بھی ربط پایا جاتا ہے۔ یہ ایسی خوبی ہوتی ہے جو مقالہ کی خوبصورتی اور دلکشی میں اضافے کا باعث بنتی ہے۔

تکرار کلمات سے اجتناب

معیاری مقالہ وہ ہوتا ہے جو کلمات کے تکرار سے خالی ہو کیونکہ مقالہ کا اسلوب کلمات کی تکرار سے متاثر ہوتا ہے۔ اس لئے جملوں کی ساخت میں ایسے کلمات کو استعمال کیا جائے جو مروج اور عام فہم ہو۔ جملوں میں ایسے الفاظ اور کلمات کے استعمال سے اجتناب کرنا چاہئے جو مستعمل نہ ہوں یا متروک ہوں۔

اقتباسات کا صحیح استعمال

i۔ اقتباس کی عبارت احتیاط سے نقل کی جائے اور اسے واوین میں رکھا جائے۔

ii۔ اگر عبارت مختصر (یعنی چار سطروں پر مشتمل) ہو تو اسے متن کے ساتھ اور متن کے قلم سے لکھنا چاہئے۔

iii۔ اگر عبارت طویل (یعنی چار سطروں سے زیادہ) ہو تو اسے متن سے الگ کر کے لکھنا ہوگا اور اس کا قلم متن کے قلم سے نمایاں طور پر خفی ہوگا۔ اس کی سطریں بھی نسبتاً مختصر ہوں گی، یعنی دائیں بائیں جگہ چھوٹی رہے گی۔ اس طرح وہ متن کی عبارت سے نمایاں ہوگی۔''

iv۔ اقتباس لیتے وقت اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ اسے متن میں اس طرح جوڑ دیا جائیکہ وہ متن کا ایک لازمی حصہ معلوم ہو۔

حاصل کلام یہ کہ وہ مقالہ جس میں اقتباسات کی صورت میں دوسروں کی آراء یا عبارت نقل کرنے میں خوب احتیاط اور دقت نظر سے کام لیا گیا ہو وہی اصل میں معیاری مقالہ ہوتا ہے۔

پاگل خانے کے دستور

سیمیں کرن (پاکستان)

یہ دنیا ایک بہت بڑا پاگل خانہ ہے۔۔۔کم ازکم مجھے کچھ عرصے سے۔۔۔نہیں کافی عرصے سے ایسا ہی لگتا ہے!اور ایسا اس لئے لگتا ہے کہ یہاں مجھے جن لوگوں،افراد سے واسطہ پڑا۔۔۔ وہ لوگ جو میری زندگی پہ بہت زیادہ اثر انداز تھے۔۔۔وہ سب کے سب متشدد ذہن،احساس برتری کے زعم میں مکمل پاگل تھے۔۔۔اور میرا جرم فقط یہ تھا کہ میں نے ان میں بطور انسان ایک فرد کی حثیت سے دیکھا۔۔۔ان فیصلوں کے سقم کو پوری شدت سے محسوس کیا۔۔۔اور پھر رَد کردیا!

جہاں میں رَد نہیں کرسکی۔۔۔کرنے کی قوت نہیں رکھتی تھی وہاں میں نے اُن فیصلوں پہ اپنی نفرت، حقارت اور بیزاری ضرور جتائی۔۔میرے رویوں نے ظاہر کردیا کہ میری روح ان کے ان منافقانہ فیصلوں کو مکمل رَد کرتی ہے!

اپنے ساتھ رہتے بستے اِن پاگلوں کو دیکھ کر مجھے لگتا ہے کہ میں خود بھی پاگل ہو چکی ہوں!
بلکہ سچ کہئے تو میرے لئے فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ پاگل وہ ہیں یا خود میں پاگل پن کا شکار ہوں؟!
پاگل پن کیا ہے؟!میرے لئے اس کو متعین کرنا بھی مشکل ہو جاتا ہے!

وہ معاشرتی رویے یا چلن جو معاشرے میں عام اور معروف ہوں، چاہے وہ انتہائی غلط بھی ہوں۔عمومی طور پہ نارمل تصور کئے جاتے ہیں!

تو کیا مرے اِردگرد کے معروف طریقے پاگل پن کا شکار ہیں؟؟!
یا پھر میرے رویے میں کوئی کجی یا بے ڈھبی ہے!

اتنے بہت سے پاگلوں کو بھگتتے بھگتتے میرے فیصلہ کرنے کی۔۔۔کسی حتمی نتیجہ قائم کرنے کی صلاحیت بہت متاثر ہو چکی ہے!

آیئے میں آپ کو باری باری۔۔۔ایک ایک کر کے اپنی زندگی کے اِن بہت اہم اور مجھ پہ مسلط کرداروں سے ملواؤں!

شاید اس عمل سے۔۔۔اِس کتھارسس سے یہ ممکن ہو سکے کہ آپ یا پھر میں کسی نتیجے پہ پہنچ سکیں!

یہ پہلا شخص، میری زندگی کا پہلا مرد۔۔۔میرا باپ ہے اور جو کہ اَب ''تھا'' ہو چکا ہے!

اپنے باپ کو پاگل کہنا۔۔۔اِس نتیجے پہ پہنچنا کہ آپ کو اس دنیا میں لانے والا شخص ایک ذہنی مریض ہے۔۔۔اِک متشدد سوچ کا مالک۔۔۔بذاتِ خود ایک ایسا المیہ ہے جو سوال کھڑا کرتا ہے!

سوال یہ کہ کیا واقعی ایسا نتیجہ اخذ کرنے والے کی اپنی ذہنی حالت کیسی ہے۔۔۔؟ اور اس سوال کے نتیجے میں ایک امکان۔۔۔نہیں دو امکانات ابھرتے ہیں۔۔۔ایک تو یہ کہ نتیجہ اخذ کرنے والا خود مشکوک ذہنی حالت کا شکار ہے دوسرا یہ کہ حالات، گردشِ ایام کی بھٹی نے اسے اتنا پکا اور تپا دیا ہے، جلا کر کندن کر دیا ہے کہ درد کی کوکھ سے جنم لے کر ائینے کے سامنے یہ اعتراف کرنا آسان ہو گیا ہے کہ میرا باپ ایک پاگل شخص تھا!

ایک بیٹی کے لئے باپ ایک سائبان ہوتا ہے۔۔۔محفوظ چھت اس کی آغوش ایک ٹھنڈی میٹھی جنت جیسی ہوتی ہو گی ۔۔۔یہ مجھے گمان ہے۔۔۔یہ پھر اپنے اردگرد بسنے والی اپنی جیسی لڑکیوں کی باتیں سن کر یہ تصور کسی حسرت کی طرح میرے ذہن میں ابھرا!

مگر اِس نعمت کو میں کبھی محسوس نہیں کر سکی!

میں نے جب سے ہوش سنبھالا، اپنے باپ کو اِک شکی اور جَلا دصفت شخص پایا!

اسے کیوں ہر شخص، ہر نظر پہ شک تھا؟! مجھے سمجھ نہیں آ سکا!

یا وہ اندر سے کسی شدید خوف اور عدم تحفظ کا شکار شخص تھا؟!

مگر اس کے عدم تحفظات اور خوف نے ہماری یعنی میری اور میری ماں کی زندگیاں اَجیرن کر دیں!

اس شخص کی سختی نے میرے اندر بغاوت کو جنم دیا یا میں کوئی پیدائشی باغی روح تھی۔۔۔حالات کی ستم ظریفی ہے کہ میں اس بات کا تعین کرنے کے قابل بھی نہیں رہی!

شاید یہ میری ماں کی بے جوڑ شادی تھی۔۔۔جس نے اوائل عمری سے میرے اندر بہت سے سوالوں کو جنم دیا!

وہ شعور تھا جو میری ماں نے مجھے دیا۔ مجھے خود کو بطور انسان سمجھنے کا شعور فراہم کیا تھا یا مجھ پہ ظلم ؟!

جب بہت اذیت میں ہوتی ہوں تو پروین شاکر کی یہ نظم کسی رقت سے پڑھتی چلی جاتی ہوں یا دیوانگی میں لکھتی چلی

جاتی ہوں
''اے خدا میری آواز سے ساحری چھین کر
تُو نے کیوں مجھے سانپوں کی بستی میں پیدا کیا''
ہاں میں اپنے رب سے شکوہ کناں ہونے لگتی ہوں کہ اس نے مجھ گر سانپوں کی بستی میں ہی پیدا کرنا تھا تو مجھے، میری آواز کو ساحری کیوں نہ عطا کی؟!
ساحری نہیں دینی تھی تو ڈسے جانے کی اذیت محسوس کرنے کا شعور کیوں دیا؟!
مگر شعور تو ماں نے دیا تھا۔۔۔ماں جو میرے لئے رَب جیسی تھی۔۔۔
اور اَب جب میرے سوال ضرورت سے زیادہ کڑوے ہوتے، بغاوت کی آگ سے جلتے ہوئے، تو ماں ڈر بھی جاتی اور پچھتانے بھی لگتی کہ اس نے مجھے میرے وجود کے ہونے کا احساس کیوں دیا اور مجھے خوئے غلامی کیوں نہ سکھائی؟!
کیونکہ ماں نے خود تو یہی کیا تھا۔۔۔وہ اپنے زمانے کی گریجویٹ کا خاتون تھی جو میرے نیم جاہل مڈل پاس باپ کے پلے بندھ گئی تھی محض اپنی کم صورتی کی وجہ سے۔۔۔میرا باپ جس واحد خوبی سے مرصع تھا وہ حُسن تھا، وہ واقعی ایک حَسین مرد تھا۔۔۔مگر اس کی طبعیت کے درشت پن اور جہالت نے اس کے حُسن کو بھی گہنا دیا تھا۔۔۔
وہ نیم مُلا۔۔۔نیم حکیم کے مصداق نیم مُلا قسم کا آدمی تھا۔۔۔ہڈ حرام تھا۔۔۔میری ماں جو کہ ایک سکول ٹیچر تھی ،اس کی تنخواہ سے گھر چلتا تھا اور باپ کبھی کام کر لیتا اور کبھی چھوڑ دیتا۔۔۔
ایک آبائی دکان تھی کریانے کی۔۔۔اس کو کرائے ٹھیکے پر چڑھا دیا اور جو پیسہ ہاتھ لگا اس کو درس کے نام پہ ہونے والی عجیب وغریب محفلوں میں برباد کر دیتا۔۔۔جہاں اسی کی طرح کے نیم مُلا اکٹھے ہوتے اور ہر فتنے کی جڑ عورت کو قرار دیتے۔۔۔ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ کیسے وہ عورت کو غائب کر کے کسی مکھی کی طرح ڈبیا میں بند کر دیتے اور بوقت ضرورت نکال لیتے!
میری ماں نے بظاہر اس کی اطاعت کی، اُسے برداشت کیا جو اُس سے بغاوت کی تھی وہ صرف یہ تھی کہ اس نے میری تعلیم وتربیت میں سمجھوتا نہیں کیا۔۔۔
میرے باپ کی خواہش تھی۔۔۔حکم تھا کہ مجھے بَس دینی تعلیم دلائی جائے اور پھر گھر بٹھا لیا جائے!
میں نے عقل وشعور اور ذہن ماں سے پایا تھا اور صورت باپ سے!
مجھے اکثر اس بات کا احساس ہوتا کہ میرا باپ میرے حسن اور خوب صورتی اور ماں کی کم شکلی سے کسی نفسیاتی عدم

توازن اور عدم تحفظ کا شکار ہے۔جس کو وہ مذہبی شدت پسندی کے لبادے میں چھپاتا تھا!
وہ میری ماں کو مارتا پیٹتا۔۔۔کبھی پیسے چھین لیتا۔۔۔اور پھر مذہب میں شوہر کے درجات پہ اُول فُول بکنے لگتا!
ایک دن اچانک میرے مُنہ سے نکل گیا۔۔۔''ابا یہ تم کس دین اور خدا کی باتیں کرتے ہو جو صرف تم مردوں کا ہے''
یہ جملہ اس کی مردانہ انا پہ کوڑے کی طرح لگا،اس جرم میں میری ماں اور مجھے کوئی کوڑوں کی طرح چھیلتے تازیانے اپنے بدن پہ سہنے پڑے۔
مگر اس مار نے میرے اندر بغاوت کو مزید گہرا کر دیا!
ماں مار کھاتے ہوئے بھی میرے ہاتھ پہ مُنہ کھتی چلی جارہی تھی اور میں بے خوفی سے چیخ رہی تھی ''ابا مرد بے بَس ہو کر۔۔اندر سے خوف زدہ ہو کر عورت کو مارتا ہے۔۔تم ہم سے ڈرتے ہو'' اور ابا کی کی وحشت بڑھتی جاتی تھی۔۔
ماں کو نوکری کرنے کی 'اجازت' دینے پہ۔۔میرے ماں کے سکول میں پڑھنے پہ۔۔بھائیوں کے منہ زور ہونے پہ وہ اکثر سر پہ ہاتھ مار کر کہنے لگتا۔۔میں نے غلطی کی۔۔غلط فیصلہ کر بیٹھا۔۔ اس عورت کو پہچاننے میں کیسے غلطی کی۔۔؟!
ایک دن میرے مُنہ سے اچانک پھسلا ''ابا تم تو مجازی خدا ہونہ۔۔۔پھر تم نے کیسے غلطی کر لی۔۔۔کیا تم بھی ہم جیسے ہی ہو؟!''
ابا کا اس سوال کے جواب میں صرف ہاتھ ہی اُٹھ سکا اور زبان سے مغلظات۔۔۔
مجھے حیرت ہوتی تھی کہ میں جو صورت میں باپ جیسی تھی۔۔۔پھر بھی میرے باپ کو کبھی مجھ پہ پیار نہیں آیا۔۔۔یا اس کی آنکھ میں مَیں نے اپنے لئے شفقت نہیں دیکھی تھی۔۔۔
میں گویا اس کے گناہوں کی ایسی گٹھڑی تھی جسے دیکھ کر وہ شرمسار تھا!
اور میرے دونوں بھائی۔۔۔ایک مجھ سے بڑا اور دوسرا جو محض ابھی پانچ برس کا تھا۔۔۔جو صورت میں میری ماں جیسے تھے۔۔۔وہ صورت جس سے اسے نفرت تھی۔۔۔وہ دونوں اس کا فخر اور مان تھے۔۔۔ان کی وجہ سے اس کا سر اونچا تھا۔۔۔
میں ماں سے اکثر پوچھتی ''ماں ہماری زندگی میں میں ہ سب دکھ انہیں مردوں کے دیئے ہوئے ہیں۔۔۔پھر بھی ہر قصور کا ذمہ دار ہمیں کیوں ٹھہرایا جاتا ہے؟؟۔۔۔اگر بابا اور اِس جیسے مرد ہمیں تنگ نہ کریں۔۔۔ہماری زندگیوں سے غائب ہو جائیں تو کیا پھر ہم بھی اچھے انسان سمجھے جائیں گے؟؟''
ماں میری ان باتوں پہ کبھی ہول جاتی،کبھی استغفار پڑھ کر مجھے ڈانٹ دیتی اور کبھی میرے زخموں پہ تشفی رکھنے لگتی!

مجھے سمجھانے لگتی کہ اس بھیڑیوں کی دنیا میں باپ اور بھائی ۔۔۔اپنے مرد کتنے ضروری ہیں ۔۔۔ یہ ہمارے محافظ ہیں اور اسی بات سے میں مزید چڑ جاتی اور چڑ کر کہتی ''یہ میرا باپ ، یہ میرا بھائی کسی کے لئے بھیڑیا ہو گا نہ ۔۔۔بھیڑیے اسی طرح پیدا ہوتے ہیں ۔۔۔میرا بس چلے تو ان سب بھیڑیوں کو غائب کر دوں ۔

ماں لمحہ بھر کو ٹھٹھک جاتی اور گہری لہجے میں بولتی ''سب مردوں کو غائب کر دوگی ؟؟ ۔۔۔پھر خود زندہ کیسے رہوگی ؟ ۔۔۔پھر بھیڑئے تمہاری جاتی میں جنم لیں گے میری مدھو ۔۔۔''

ماں میرے چہرے کو ہاتھوں میں تھام کر بولتی ۔۔۔اور میں اس کی گہری باتوں پہ غور کرتی رہ جاتی ۔۔۔

اس لمحے مجھے اُس رب سے شکوہ اور بھی شدید ہونے لگتا کہ اپنے توازن کے لئے اُس نے ہمیں بھیڑیے کا شکار بنایا تھا!

میں ابھی اپنے پہلے پاگل خانے میں جینا سیکھ رہی تھی ۔۔۔ جینا کیا ۔۔۔روز جینا اور مرنے کا کھیل تھا کہ جو مجھے مشق کروائی جا رہی تھی ۔۔۔ کہ میرے لئے ایک دوسرے پاگل خانے کا انتخاب کر لیا گیا!

میرے باپ کو میری باغی اٹھان سے ڈر لگنے لگا تھا ۔۔۔وہ اکثر کہتا ۔۔۔''یہ لڑکی پیدا کر کے بہت بڑی غلطی کی ۔۔۔پھر اسے زندہ رہنے دیا ۔۔۔ایک اور غلطی ۔۔۔اور اب اس کو مزید برداشت کر کے ایک اور غلطی نہیں کر سکتا''

اس کے اس متعصبانہ بیان پر میں ہر بار پھوٹ پھوٹ کر روتی تھی اور اللہ سے شکوہ کرنا نہیں بھولتی تھی ''اللہ جی بڑا ظلم کیا تو نے ، ہمارے لئے ''رب'' تو نے ہمارے جیسے بلکہ ہم سے بھی بدتر پیدا کر دیئے؟! پھر ربوبیت کی بجائے فرعونیت سے بھی مالا مال کر دیا؟! کیوں کیا تو نے ہمارے ساتھ یہ؟؟! تو نے ہمیں اپنی مخلوق کیوں نہیں سمجھا؟''

میرے اِن شکووں پہ ماں بھی دہل جاتی تھی کبھی کبھی ۔۔۔شاید اسی لئے وہ کمزور پڑ گئی تھی ۔۔۔ماں میری قوت تھی ۔۔۔وہ بھی مجھ سے ۔۔۔میری باغی اٹھان سے ڈر گئی تھی کیا؟! ۔۔۔

کبھی جواب ہاں میں آتا ہے اور کبھی نہ میں ۔۔۔

میں نے تو ابھی اپنے اِس پہلے پاگل خانے کو حیرت کی نگاہ سے دیکھا تھا ۔۔۔ یہاں باپ اور بھائی کی شکل میں میں نے تین پاگل مردوں ۔۔۔ تین پاگل کرداروں کو اپنی زندگی میں دندناتے ۔۔۔میری زندگی کی معصوم خوشیوں کو بدمست ہاتھیوں کی طرح اپنے پیروں تلے روندتے دیکھا تھا ۔۔۔

جی ہاں ۔۔۔تین پاگل کردار ۔۔۔ایک میرا باپ اور دو میرے چھوٹے بھائی ۔۔۔جو عمر میں بالترتیب مجھ سے دو اور چار برس چھوٹے تھے!

مگر چھوٹے ہو کر بھی وہ حاکم تھے اور میں رعایا، وہ عاقل تھے اور میں نادان!

وہ گناہ کر کے بھی معصوم تھے اور میں معصوم ہو کر بھی خطا کار!
وہ تعلیمی اور عقلی لحاظ سے مجھ سے کمتر ہو کر بھی معتبر ہی تھے!
وہ چاہتے تھے میں سُنوں نہ، بولوں نہ۔۔۔چھت پہ نا جاؤں گانا نہ سنوں۔۔۔ٹی وی نہ دیکھوں۔۔۔فلم نہ دیکھوں ۔۔۔کوئی لڑکا میری طرف نگاہ اٹھا کر نہ دیکھے۔۔۔
اچھے اور گرم کھانے پہ ان کا حق تھا۔۔۔بہترین اور آرام دہ بستر گھر کے مردوں کے بعد ہم ماں بیٹی کو نصیب ہم جو اِن آسائشوں کا خالق تھے۔۔۔
اور یہاں تو اِن آسائشوں کی خریدار بھی میری ماں تھی!
اور میرا باپ اور بھائی کسی بیگار کیمپ کے جابر ظالم ٹھیکدار تھے!
کیا بدنصیبی تھی کہ وہ بھائی جو میرے ساتھ کھیلتے کودتے بڑے ہوئے تھے۔۔۔یک دم کسی پاگل پن نے ان کو مجھ سے آٹھا کر بہت بلندی اور فاصلے پہ بٹھا دیا تھا!
فاصلے بھی پاگل پن پیدا کرتے ہیں!
مگر کتنے بڑے تھے وہ؟! میں ابھی محض سترہ برس کی تھی مجھ سے چھوٹا بھائی پندرہ برس کا اور اس سے چھوٹا تیرا برس کا!
مگر مردانگی کا ایک لوتھڑا انہیں اس عمر میں معتبر کرنے کو کافی تھا اور میں؟!
میں ساری عمر کے لئے اس ''پاگل سوچ'' کا ایک شکار تھی!
اور انہیں حالات میں میرے لئے فیصلہ کیا گیا کہ میرا پاگل خانہ بدل دیا جائے۔۔۔میری شادی کر دی جائے۔۔۔ میں جو ابھی محض سترہ برس کی تھی۔۔۔ماں کے سکول میں ہی میٹرک کے بعد ایف ایس سی کر رہی تھی کیونکہ سکول کو چند سال پہلے کالج تک ترقی دے دی گئی تھی!
اور اس فیصلے کا محرک بھی ایک پاگل پن ہی تھا!
میرے باپ کے بلائے گئے ان جھوٹے پارساؤں میں سے کسی نے مجھے دیکھا۔۔۔اس کی نیت خراب ہوئی اور اس نے ایک عشقیہ خط مجھے لکھ بھیجا اور یہ خط میرے چھوٹے بھائی کے ہاتھوں سے ہوتا میرے باپ کے ہاتھ لگ گیا ۔۔۔کہنے کو بڑی فلمی سے کہانی ہے۔۔۔مگر جی کر دیکھئے صاحب! جب آپ کی ذات کی حرمت کی دھجیاں اڑتی ہیں تو کیا ہوتا ہے!
آج جو سوچوں تو اس ''معصوم سے ایڈونچر'' کو حیرت سے دیکھتی ہوں کہ آخر وہ کونی سی کمی یا کجی تھی یا میرا پاگل پن

تھا کہ میں اس عشقیہ خط میں لکھی اپنے حسن کی تعریفوں سے نہ پگھلی نہ متاثر ہوئی نہ سوچا۔۔۔شاید جبر میری حسی لطافت نگل چکا تھا!

مگر اس کے باوجود میں ہی مجرم تھی!

باپ مجھے مارتا رہا۔۔۔کنجری،طوائف زادی اور گندی گندی گالیاں بکتا رہا۔۔۔وہ ماننے کے لئے تیار ہی نہیں تھا کہ میرا کوئی قصور نہیں۔۔۔میں قطعی بے گناہ تھی۔۔۔

وہ بار بار یہی کہتا رہا''وہ بے حیا نے لبھایا ہوگا اسے،اَدائیں دکھائیں ہوں گی۔۔۔ورنہ قرآن کے درس کو آنے والے یہ معصوم بچے؟!''

میں چیخ پڑی''بہت اچھی طرح جانتی ہوں میں اِن سب''معصوموں'' کے کرتوت۔۔۔تمہیں بھی جانتی ہوں ابا اور تمہارے ان دو معصوم بیٹوں کو بھی۔۔۔تمہارا دو سال پہلے اماں کے سکول کی استانی کے ساتھ چکر تھا۔۔۔تمہارے دونوں بیٹے بھی''کس چکر'' میں ہیں اس عمر میں۔۔۔یہ بھی جانتی ہوں میں۔۔۔یہ رات کو تلاوت کے بہانے موبائل پہ کیا دیکھتے ہیں وہ بھی مجھے پتا ہے۔۔۔مگر میری اتنی بات مان لو کہ گر تم لوگوں کی عقلیں اتنی جلدی''چکر'' کھا جاتی ہیں تو پھر تم لوگ کیوں خود کو عقلمند ثابت کرتے ہو؟۔۔۔صرف ہمیں کیوں قید کرتے ہو؟؟۔۔۔''

میں اُس دِن چیخ چیخ کر جو مُنہ میں آیا بولتی رہی۔۔۔باپ سے پٹتی رہی۔۔۔گر ماں بیچ میں نہ آتی تو شاید باپ مجھے قتل کر دیتا۔۔۔

آج سوچتی ہوں جانے ماں نے مجھے بچا کر اچھا کیا یا بُرا۔۔۔مزید پاگل دیکھنے کو زندہ چھوڑ دیا۔۔۔اور یہ پاگل تمام عمر مجھے دیوانہ سمجھ کر پتھر مارتے رہے۔۔۔

پھر سوچتی ہوں اِک مکمل پاگل خانے کی کہانی آپ کو کون سناتا؟!

اور پھر سترہ سال کی عمر میں مجھے،مدحت فاطمہ،کو میرے باپ نے اپنے ہی حلقے میں ڈھونڈھ کر۔۔۔مگر شاید اس نے ڈھونڈنے کی زحمت بھی نہیں کی۔۔۔عبدالمجید کو دیکھ کر مجھے یہی لگا تھا کہ میرے باپ نے مجھے بس سر سے ڈھویا تھا۔۔۔نہیں عبدالمجید کی صورت اس نے مجھ سے،میری ماں سے انتقام لیا تھا!۔۔۔آہ عبدالمجید کو سوچ کر میں آج بھی ہمیشہ کی طرح مزید منتشر ہو جاتی ہوں!

ایک ایسی شادی جس کے لئے میں دم آخر راضی نہیں تھی۔۔۔ جس میں میری ماں ناخوش تھی۔۔۔

وہ میرے فرض سے سبکدوش ہونا چاہتی تھی مگر یہ شادی طے ہونے پہ وہ پھپھک کر روتی تھی۔۔۔کیوں؟!وجہ مجھے

عبدالمجید کودیکھ کر سمجھ آئی۔

مگر شادی ہو جانے کے بعد مَیں نے اسے موت کی سی حقیقت کے طور پہ قبول کرلیا۔۔۔

وہ شخص جس کی صورت بھی مجھے ناپسند تھی اس کو مجھ پہ مالکانہ حقوق حاصل تھے جن کی استعمال کرنے کے لئے اسے میری اجازت وخوشی سے کوئی سروکار نہ تھا۔۔۔وہ اِک چھوٹے سے قصبے میں امام مسجد تھا۔۔۔انتہائی معمولی شکل و صورت کا۔۔۔دین، مذہب، دنیا پہ اس کا علم اتنا سطحی اور پَست تھا کہ کوشش کے باوجود میں دل میں اس کے لئے کوئی عزت پیدا نہ کرسکی!

وہ میرے باپ کی طرح انتہائی متعصب آدمی تھا۔۔۔

میرا دوسرا پاگل خانہ میرے باپ کی دی ہوئی سزا تھی!

اور پہلا۔۔۔؟! خدا کی جانب سے منتخب کی ہوئی مشقت آج بھی سوچوں تو طے کرنا مشکل ہے کہ بدتر کونسا پاگل خانہ تھا۔۔۔مگر چوتھا اہم کردار۔۔۔زندگی کا شریک بھی گر پاگل خانے سے منتخب کرلیا جائے تو آپ کیسا محسوس کریں گے؟!

اس کے خیال میں مجھے اس دنیا میں محض اس کی آسودگی وخوشنودی کے لئے پیدا کیا گیا تھا۔۔۔سو میری نیند، میرا جاگنا، میرا اٹھنا بیٹھنا میرا ہر فعل اس کی مرضی کے تابع ہونا چاہئے!

میری ماں اس سے صرف میری تعلیم کی شرط منوا سکی۔۔۔یہ وہ واحد وجہ تھی جو میرے دل میں اس کے لئے نرم گوشہ پیدا کرتی تھی۔۔۔مگر اس کے لئے کیا شرط اور قیمت تھی وہ مجھے بعد میں پتا چلی تھی۔۔۔

تعلیم کی شرط مانی ضرورت گئی تھی۔۔۔مگر ہر وہ کوشش کی جاتی کہ میں پڑھ نہ پاؤں۔۔۔وہ گھر آجاتا تو مجھے حکم تھا کہ اپنا بوریا بستہ بند کردوں اور ملحقہ مسجد ہونے کے سبب وہ دن میں کسی وقت بھی آجاتا۔۔۔مجھے تعلیمی امداد کے لئے کسی سے مدد لینے بھی اجازت نہ تھی۔۔۔ماں، کسی سہیلی یا پھر ماں کے حوالے سے ایک لیکچرار تھے جو ماں کی جان پہچان کے تھے اور میری راہنمائی کر دیا کرتے تھے۔۔۔مگر مجھے اجازت نہیں تھی کہ میں ان سے فون پہ بات کروں۔۔۔خاص طور پہ اس کے سامنے!

ایسے لمحوں میں وہ بالکل اجنبی ہو جاتا اور میرے باپ کا لہجہ اپناتا ''بد بخت عورت، جہنمی عورت، نامحرموں سے بات کرتی ہے۔۔۔تو مجھے جہنم میں لے کر جائے گی''

اور مجھے یہ بات بھی کبھی سمجھ مین نہیں آئی تھی کہ گر عورتیں ہی مردوں کو جہنم میں لے کر جائیں گی تو اپنے اپنے اعمال

نامے کا کیا جواز تھا؟!

میرے ساتھ اس کا رشتہ بڑا بے ڈھب اور عجیب گنجلک تھا۔۔۔

میں نے اسے پہلے بہت بےزاری، دکھ اور غصے و رنج سے دیکھا تھا بحیثیت شوہر!

وہ بھی مجھ سے کچھ مشکوک اور مرعوب تھا اور اس حیرت کا اظہار کرتا تھا کہ میرے والدین نے کیا سوچ کر اس کی شادی اس سے کر دی؟!

اس میں شک بھی ہوتا، مرعوبیت بھی اور عدم تحفظ اور محبت بھی!

پھر ماں کے بہت سمجھانے پہ جب میں نے اس کو اپنی قسمت سمجھ کر قبول کر لیا تو اس کے اچھے محبت بھرے رویے مجھے خوشی اور آسودگی دینے لگے اور جب وہ میرا حاکم بننے کی کوشش کرتا اور اِک اجنبی ظالم رویہ اوڑھ لیتا تو وہ میرے دل میں پڑی گرہوں کو مزید الجھا دیتا۔

میں کم عمر تھی۔۔۔وہ میری زندگی کا پہلا مرد تھا جس نے مجھے چھوا۔۔۔ٹوٹی پھوٹی محبت بھی دی۔۔۔کبھی بہت مغلوب اور بے بَس ہوا تو میرے حسن کی کھل کر تعریف بھی کی۔۔۔میرے جزبات و احساسات پر یہ پہلا ملائم لمس تھا ورنہ میں نے اپنے باپ سے اپنے بھائیوں سے، اپنی زندگی میں اِک نامہربان رفاقت، بداعتمادی، بدگمانی اور نفرت کے کچھ نہ پایا تھا۔۔۔رشتوں کی بےاعتباری مجھ سے میرا زندگی پہ سے سارا اعتبار چھین چکی تھی!

ایسے میں عبدالمجید جو ایک انتہائی معمولی شکل وصورت کا اور ایک چھوٹے سے دماغ کا پست ذہنیت آدمی تھا۔۔۔

جب کبھی مجھ سے اچھا اور محبت بھرا سلوک کرتا تو مجھے اِک خوشی گو راحت کا احساس ہوتا!

مگر یہ نرم لمحے قسمت میں صرف جبلت کے زیر اثر آتے!

ورنہ اس میں اور میرے باپ مین بس انیس بیس کا ہی فرق تھا!

مجھے پڑھنے کا شوق اور لگن تھی۔۔۔شاید لاشعوری احساس بھی تھا کہ میری ماں نے مجھے جس پاگل خانے مین جَنم دیا، جس جہنم میں خود اُس نے زندگی گزاری وہاں ایک تعلیم اور معاشی استحکام ہی تھا جس نے اس پہ کچھ آسودگی کا دروازہ کھول رکھا تھا۔۔۔

ماں نے اپنے سکول میں ایک سنئیر ٹیچر ہونے کے ناطے میرے لئے بات کر رکھی تھی کہ ایف اے کے امتحان کے بعد مجھے عارضی طور پہ کنٹریکٹ پہ جونیئر ٹیچر کے طور پر رکھ لیا جائے گا اور میں اپنی تعلیم ساتھ ساتھ مکمل کرتی رہوں گی تو ترقی پا جاؤں گی!

چھوٹے شہروں میں جہاں اساتذہ کی کمی ہو، ایسے معاہدات محکمہ تعلیم کے افسران کے تعاون سے طے پا جاتے ہیں ۔۔۔اور اس علاقے میں میری ماں اور نانا کی بہت عزت اور تعلقات تھے مگر نانا میری پیدائش سے پہلے رخصت ہو گئے تھے میں نے ماں سے صرف ان کا تذکرہ سنا تھا کہ باپ ان جیسا میٹھا بھی ہوتا ہے مگر میں کسی وقت چڑ کر کہتی " گر وہ اتنے اچھے تھے تو آپ کو بابا جیسے مرد سے کیوں بیاہا" ۔۔۔لیکن آج جان چکی ہوں کہ کبھی باپ مجبور ہو جاتے ہیں اور کبھی مائیں۔۔۔اور بیٹیوں کے پاگل خانے بدل جاتے ہیں!

انہیں دنوں میں عبدالمجید کا مجھ پہ بچے کے سلسلے میں دباؤ بڑھتا چلا جا رہا تھا جب کہ میں اپنے امتحان سے پہلے بچہ کسی صورت نہ چاہتی تھی۔۔۔میں اس کو بتائے بغیر اپنی ایک نرس دوست سے مانع حمل گولیاں استعمال کر رہی تھی۔۔۔ میری کم بختی تھی کہ ایک دن یہ دوا کا پتہ اس کے ہاتھ لگ گیا۔۔اس سے پہلے ہلکا پھلکا تشدد۔۔۔دھکا دینا۔۔۔ بالوں سے پکڑ لینا۔۔۔ہاتھ بازو مڑوڑ کر جھٹک دینا۔۔۔تک ہی محدود تھا مگر اس روز اس نے مجھے بری طرح مارا ۔۔۔اس کے تشدد نے میری اندر کی ساری شرمندگی کا احساس کہ اس فیصلے میں۔۔۔دوائی کے استعمال کے فیصلے میں مجھے اس کو شریک کرنا چاہیے تھا، دھو دیا۔۔۔میں اس کے تشدد کے جواب میں چیختی رہی" ہاں یہ میرا جسم ہے، اس پہ فیصلہ اور مرضی بھی میری چلے گی، میں ابھی بچہ نہیں چاہتی"

اور وہ مجھے کافرہ، کتیا اور گندی گندی گالیوں سے نوازتا رہا ان دیکھی جہنم سے ڈراتا رہا۔۔۔جب کہ میری ساری زندگی پاگل خانوں کے جہنم میں گزری تھی۔۔۔

اس نے مجھے اتنا مارا کہ میرا پورا بدن نیلا ہو گیا۔۔۔میں بخار سے تپ رہی تھی۔۔۔میری خبر گیری کو صرف ماں ہی آتی تھی، میرا باپ مجھے بیاہ کر گویا مجھے دفن کر چکا تھا۔

ماں آئی، مجھے دوا لا کر دی، کھچڑی اور یخنی کھلا کر اس نے مجھے دوا دیکر سلا دیا۔۔۔میں نیم غنودگی میں تھی کہ جب میں نے ماں کو عبدالمجید سے سخت لہجے میں بات کرتے "تم نے اپنا عہد توڑا ہے۔۔۔کیا اسی کی میں تمہیں قیمت ادا کر رہی ہوں؟؟؟ شادی کے وقت تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ تم اسے پڑھنے دو گے تا کہ وہ بطور استانی متعین ہو سکے اور تب تک بچے کے لئے اسے مجبور نہیں کرو گے۔۔۔اسی شرط پہ میں نے تمہیں ہر ماہ ماہانہ خرچہ دینے کا وعدہ کیا تھا ۔۔۔اور وہ میں تمہیں دیتی آ رہی ہوں پھر تم نے یہ سب کیا کیا؟؟"

غنودگی میں بھی یہ خبر مجھے لگا کہ پسلیوں سے کسی کارتوس کی طرح داخل ہوئی اور دل کو چھیدتی چلی گئی!

آنکھوں کے گوشوں سے خاموشی سے آنسو بہتے رہے۔۔۔نفرت کا ایک گرم لاوا اٹھا اور اس رشتے میں موجود ہر

حلاوت کو بھسم کر گیا!

یہ رشتہ تھا یا پھر دلالی۔۔۔میں نفرت سے کھولتے ہوئے سوچ رہی تھی مگر مزید انکشافات میرے منتظر تھے۔

ماں نے کہا ’’تم تو خود اس بات کے خواہش مند تھے کہ وہ استانی بھرتی ہو جائے تا کہ تمہارے محدود وسائل میں تمہارا ہاتھ بٹا سکے بلکہ تم نے تعلیم کی شرط بھی اپنی اس شرط پہ منوائی تھی کہ وہ اپنی تنخواہ تمہارے ہاتھ پہ رکھے گی۔۔۔تو اب کیا ہوا؟ تمہاری عقل پہ پتھر کیوں پڑ گئے؟؟ ساری عمر پڑی ہے۔۔۔ابھی اس کی عمر کیا ہے؟! محض سترہ برس، اسے انٹر کر لینے دو، پھر بچے بھی ہو جائینگے‘‘

وہ کچھ نرم پڑا مگر اَب بھی وہ اپنی غلطی ماننے کو تیار نہ تھا شرمندہ نہ تھا وہ میرے لئے انتہائی گندی زبان استعمال کر رہا تھا۔۔۔اور میری ماں کبھی سختی سے، کبھی گھگھیاتے ہوئے کبھی لالچ و ترغیب کے پھندے سے اسے رام کرنے کی کوشش کر رہی تھی ’’میں مانتی ہوں اس کی غلطی ہے اسے ایسی دوا کا استعمال تمہاری اجازت سے کرنا چاہیے تھا۔۔۔ مگر تم نے بھی اپنا عہد توڑا ہے۔۔۔‘‘

اور میں غصے میں کھولتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ یہ بھی اس پاگل خانے کے انوکھے دستوروں میں سے ایک تھا کہ غلطی دونوں فریقین کی ہو مگر مارنے کا حق، تشدد اور احتجاج کا حق صرف اُن کے پاس تھا جو اِس پاگل پن کی بنیاد اور سبب تھے!

میں مُندی آنکھوں، بخار سے تپتے ہوئے جسم اور دماغ کے ساتھ اپنے دل میں جھانکا۔۔۔وہاں عبدالمجید کے خاکے کو آگ لگ چکی تھی۔۔۔صرف راکھ بچی تھی۔۔۔اِس راکھ کے نیچے صرف نفرت چمک رہی تھی۔۔۔

میں نے پھر نفرت اور غصے سے سوچا ’’اگر غلطی، قصور لغزش ہی سبب ہی مار و تشدد کا سبب بن جائے تو مجھے ابا کو، بھائیوں کو اور عبدالمجید کو مارنے کا۔۔۔کتنا مارنے کا حق ہے!‘‘

میرے زخموں، جسم پہ بنے نیلوں اور بخار کو ٹھیک ہوتے کچھ دن لگ گئے!

ماں میری تیمارداری کرتی رہی۔۔۔عبدالمجید کے رویے میں گریز تو تھا مگر ندامت مجھے نظر نہیں آئی اس سے میری نفرت کو مزید جلا ملی!

ایک دن میں قدرے بہتر حالت میں تھی، ماں نے نیم گرم پانی میں نیم کے پتے اُبال کر مجھے نہلایا تھا۔۔۔اِک نئی زندگی کی طرف جاتے مُردے کو بھی نیم کے پتوں سے غسل دیا جاتا ہے!

وہ دن شاید۔۔نہیں یقیناً میرے بھی ایک نئے جنم کا دن تھا۔میں نے اُس دن پرانی کینچلی اتار پھینکی تھی!

ہاں تو میں قدرے بہتر حالت میں نہا کر بیٹھی تھی! ماں مجھے کھانا کھلا کر واپس چلی گئی تھی۔ وہ اسکول سے کچھ دیر کے لئے آجاتی اور پھر واپس سکول سے ہی گھر چلی جاتی!

ماں کے جانے کے بعد عبدالمجید گھر میں داخل ہوا۔۔ میں کُھلے گیلے بالوں کے ساتھ کھلے گلابی جوڑے میں خاموشی سے چارپائی پہ بیٹھی تھی۔۔۔وہ خاموشی سے آکر میری چارپائی پہ بیٹھ گیا اور میرے چہرے کو تکنے لگا گہری نگاہ سے ,ا س نگاہ میں طلب، پیغام اور پیش رفت تھی۔۔۔

میں نے بھی اُس کی جانب نگاہ کی۔۔۔میرے دیکھتے ہی دیکھتے عبدالمجید کی مختلف شکلیں بدلنے لگیں۔۔۔اس کے سر پر مختلف خوں آشام درندے اپنی مکروہ شکلوں میں میرا خون۔۔۔میری زندگی سے خواب کی ہر حرارت چھین لینے کو بے قرار تھے۔۔۔یہ سب درندے اس پاگل خانے کے جانور تھے جن کے پاس میرے لئے انسانی سطح پہ جینے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔۔۔اور اس کے بعد عبدالمجید اِک حقیر سے **طفیلئے** میں بدل گیا۔۔اک ایسا طفیلیا جو میری رگوں سے خوراک چُوس کر مجھے یہ بتانے پہ مصر تھا کہ دراصل درخت وہ ہے اور اس کی چھاؤں اور ساتھ میں ہی میری بقا ہے۔۔۔

یہ احساس ایک کراہت آمیز اور غصے کو اشتعال میں بدلتا احساس تھا۔۔۔نتیجتاً جب اس نے میری جانب ہاتھ بڑھائے تو مَیں نے اُسے بہت زور سے دھکا دیا۔ وہ تیار نہ ہونے کے سبب الٹ کر بڑے مضحکہ خیز انداز میں پیچھے جا گرا کچھ اس طرح کہ اس کا سر زمین سے زور سے ٹکرایا اور ٹانگیں اُوپر کو اٹھ گئیں وہ بالکل اک بے بس سا کارٹون لگ رہا تھا!

اس کے منہ سے گالیوں کا گٹر جیسے ابل پڑا۔۔۔وہ بدقت خود کو سنبھال کر میری جانب جارحانہ انداز میں بڑھا۔

مَیں نے ایک بے خوف نگاہ۔۔۔وہ نِگاہ جس میں رشتے کو بچانے کا خوف نہ تھا۔۔۔

وہ نگاہ جس میں بے تحفظ ہو جانے کا خوف نہ تھا۔۔۔

وہ نگاہ جس میں کچھ کھو دینے کا خوف نہ تھا۔۔۔

وہ نگاہ جس میں سب کچھ لٹ جانے کے بعد کی قوت و دلیری تھی میں نے اس پہ نگاہ کی۔۔۔اک عام سا۔۔۔اوسط سے قد کا شخص، معمولی سی صورت، اور سیرت اس سے بھی معمولی۔۔۔

اک ایسا پاگل شخص جو اپنے لئے ہر لذت گناہ، ہر لغزش ہر غلطی کو مردانہ آڑ میں حق سمجھتا تھا اور میرے لئے صدیوں کی لٹکی زنجیر میں اک کھنکھناہٹ و حرکت کا جرم بھیانک ٹھہرا دیا گیا!

اس پاگل خانے کا یہ بھی ایک اور انوکھا دستور تھا کہ غلط ہونے غلطی کرنے کے باوجود ذمہ داری اور جرم کا بوجھ صرف میرے حصے میں تھا کیونکہ مرد غلطی کرنے کے باوجود کسی ان دیکھی لانڈری میں دھل جاتا تھا اور میرے دامن کا داغ میرے خون سے بھی نہیں دھلتا تھا!

میں نے اپنی جانب بڑھنے والے اس **طفیلئے** کو دیکھا اور غیر ارادی طور پر تحفظ کے لئے پیچھے ہاتھ بڑھائے، میرے ہاتھ میں کونے میں رکھا ڈنڈا آیا اور میں نے اپنی جانب تیزی سے آتے عبدالمجید کو دیکھا وہ اپنا جوتا اتار کر میری جانب لپکا تھا مگر اس سے پہلے میں نے اس کے اوپر وار کر دیا! ڈنڈا اس کے بدن کے کسی نازک حصے پہ پڑا تھا وہ تکلیف سے دہرا ہو گیا، میں نے بس نہیں کیا اسے بری طرح پیٹ ڈالا!

میرے وحشت بھرے انداز نے پہلے اُسے مشتعل کیا، وہ ہذیان و مغلظات بکنے لگا۔ اس نے مجھے اور وحشت دی ۔۔۔میری بڑھتی وحشت نے اسے خوفزدہ کر دیا وہ خوف سے چلایا'' جا کتیا چلی جا میرے گھر سے، میں تیرے ساتھ نہیں رہ سکتا تو میرے ساتھ رہی تو مجھے مار ڈالے گی، جا میں نے تجھے طلاق دی طلاق دی طلاق دی!''

میں نے تھک کر ڈنڈا پھینک دیا!

میں نے خود کو آئینے میں دیکھا۔۔۔ وہاں اک تھکی ہاری ٹوٹی پھوٹی عورت کھڑی تھی جسے اس کے پیدائشی اور پھر منتخب شدہ پاگل خانے نے تباہ حال اور دیوانگی کی سرحد پہ کھڑا کر دیا تھا!

میں جو اگلے دو ماہ بعد اٹھارہ برس کی ہونے والی تھی!

میرے پاس اِک ادھوری تعلیم تھی اور ہاتھ میں طلاق نامہ!

میں نے شیشے میں نگاہ کی اور اپنے اس عکس کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا!

میں نے اپنی مرضی کا عکس تراشا اور آئینے کو حکم دیا کہ یہی عکس میری نگاہ کو دکھا!

میرا باپ اور میرے بھائی مجھے ایک گناہ اور اپنی غلطی سمجھ کر بھلا چکے تھے۔۔۔

بلکہ شاید میرا باپ میری ہر بغاوت کی سزا دے کر مجھے خوش تھا!

سو میں اُن رشتوں کے بوجھ سے بھی آزاد تھی!

آج میں نے ایک ایسے مرد کی بیڑی بھی پیروں سے اتار پھینکی تھی جس کا پاگل خانہ میری تقدیر بنانے کی کوشش کی گئی تھی!

آج میں ہر رشتے کے بندھن سے آزاد کھڑی تھی۔

میں نے دیکھا کہ پرواز کے لئے میرے پر نکل رہے تھے۔۔۔

میں نے آئینے میں اپنی شبیہ کے پیچھے اپنی ماں کو دیکھا!
وہ غم، غصے اور تاسف سے مجھ دیکھ رہی تھی۔۔۔
مگر میں جانتی تھی کہ وہ مجھے تھام لے گی، تھامے رکھے گی!
اور پھر یہی ہوا!
میری ماں نے میرے باپ اور بھائیوں کو خبر ہونے سے پہلے مجھے شہر اپنی ایک بھروسے کی سہیلی کے پاس بھیج دیا!
اس کا تاوان اس نے میرے بھائیوں سے حقارت و تزلیل اور میرے باپ کے تشدد کی صورت بھرا!
میرے باپ اور عبدالمجید کی خوب جگ ہنسائی ہوئی، وہ منہ چھپاتے پھرتے جب لوگوں کو پتہ چلتا کہ عبدالمجید مجھ پر حملہ کرنے کو بڑھا تھا تو جوابی مار کے جواب میں اس نے مجھے طلاق دے دی!
یہ خبر بڑی چابک دستی سے میری ماں کے سکول سے اٹھی اور بچے بچے کے ذریعے ہر گھر میں پھیل گئی!
مجھے بھی بہت لعنت ملامت کی گئی ہوگی!
مگر لوگ میری ماں کے اخلاق و کردار کی عزت کرتے تھے اور میرے باپ کو جانتے تھے!
آج بھی سوچتی ہوں کہ اس پاگل خانے میں میری ماں جیسا واحد ذی ہوش کردار نہ ہوتا تو آج میں کہاں ایڑیاں رگڑ رہی ہوتی؟!
ماں نے اور اس کی دوست نے مجھے کھڑا ہونے میں بہت مدد دی!
میں نے ایف اے کی تیاری خوب محنت سے کی!
زندگی پہ چھائے ملال کو بدن کے میل کی طرح دھو دیا!
روح کا ملال و میل نہیں نہایا۔۔۔کم از کم اس قت نہیں لگتا تھا مجھے!
مگر ابھی مجھے آئے ڈیڑھ ماہ ہی ہوا تھا کہ میں بہت بیمار پڑ گئی!
اتنی کہ میری ماں کو میرے پاس آنا پڑا!
مجھے جب ڈاکٹر کے پاس لے جایا گیا تو پتا چلا کہ میں ماں بننے والی تھی!
عبدالمجید کی نامبارک قربت کا کوئی لمحہ کوئی ساعت میرے وجود میں ٹھہر گیا تھا!
یہ خبر وقتی طور پہ تو میرے اوسان خطا کرتی تھی!
ماں اور خالہ سکینہ کا دباؤ تھا کہ میں اس مصیبت سے جان چھڑا لوں!

میں نے سوچا۔۔۔بہت سوچا۔۔۔

مگر ماں میرے اندر جیت گئی!

میرے وجود سے کوئی مجھے ماں پکارتا تھا!

پاگل خانے کے بنجر درودیوار سے کوئی سبز شاخ پھوٹی تھی!

خالہ سکینہ یہ ذمہ داری اٹھانے کو تیار نہیں تھی!

اور واپس اپنے شہر جانا میرے لئے ممکن نہ تھا!

میرے باپ اور بھائی میرے خون کے پیاسے تھے!

عبدالمجید کو بھنک پڑتی تو وہ مجھ سے میرا بچہ چھین لیتا!

زندگی پھر بند گلی میں کھڑی تھی!

میں ے انتہائی مایوسی کے عالم میں اپنی اس نرس دوست کو فون کیا جو مجھے مانع حمل گولیاں دیا کرتی تھی!

وہ میرے قصبے نما شہر اور بڑے شہر کے درمیان ایک اور قصبے کے ہیلتھ سنٹر میں تعنیات تھی!

ہونی کو یہ گولیاں بھی نہیں ٹال سکی تھیں!

ہمارے قصبے میں اس کے والدین کا گھر تھا جہاں وہ چھٹیون میں آجاتی! وہ خود بہت سے پاگل خانوں کی بھگوڑی تھی! اس کو بھی طلاق ہو چکی تھی۔ گھر والے اچھوت جیسا سلوک کرتے مگر مالی تعاون کی وجہ سے برداشت کرتے!

اس کی شہرت کچھ اچھی نہیں تھی!

مگر اس وقت وہ میرے لئے نیکی کا فرشتہ ثابت ہوئی!

پاگل خانے کا یہ ایک اور دستور تھا کہ رات کے پہلو سے دن اور بدی کے گھر سے نیکی کو جنم لیتے دیکھا میں نے!

وہ مجھے اپنے ہیلتھ سنٹر کے ملحقہ کوارٹر میں لے آئی، یہ سنٹر اس کی راجدھانی تھا، یہاں کی ڈاکٹر، نرس سب وہ تھی!

مریضوں کی مسیحا تھی! چھوٹے موٹے ہر مرض کی دوا دیتی زچہ بچہ کے مسائل کے علاوہ!

سو علاقے کے لوگ مختلف سوغاتیں اس کے لئے لے کر آجاتے!

اس کی مجھے تاکید تھی کہ میں کم لوگوں کے سامنے آؤں اور چہرا چھپا کر رکھوں تاکہ کہیں سے کبر قریبی قصبے تک نہ پہنچ جائے!

اسی دوران میں نے ایف اے کے پیپر خالہ سکینہ کے گھر جا کر دیئے!

اب ایک اور کٹھن ماہ اسی مصروفیت میں گزر گیا!

ماں بہت کم ملنے آتی تا کہ کسی کو بھنک نہ پڑے، فون پہ بھی بہت محتاط رابطہ تھا!

نرگس میری دوست ہمدم ثابت ہوئی۔۔۔اس کا تبادلہ ایک عرصے سے شہر کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی مگر وہ اکیلے جانے کے خوف سے رکی ہوئی تھی یہاں اس کی راجدھانی قائم تھی! وہ اس ہیلتھ سنٹر کی تاج ملکہ تھی!

مگر میرے آجانے سے اسے بڑا آسرا ہوا، وہ اور میں خواب میں دیکھا کرتے تھے کہ بچے کی پیدائش کے بعد ہم شہر چلے جائیں گے!

مجھے حیرت ہوتی تھی خود پہ کہ کہاں میں بچے کے نام سے بدکتی تھی اور اَب میری کائنات اس بچے میں سمٹ آئی تھی!

یہ پاگل خانے کا ایک اور دستور تھا کہ شاید پاگل خانے کی بقا کا اصول کہ مادہ ماں بن کر ہستی فنا کرنے پہ تیار ہو جاتی ہے!

آگے کی کہانی بڑی طویل ہے۔۔۔

زندگی جیسی طویل۔۔۔

اِک ضخیم ناول کی طرح موڑ کاٹتی!

مگر میں آپ کو جیدہ چیدہ واقعات سے آگاہ کرتی ہوں!

نرگس کی زندگی میں ڈرامائی انداز میں ایک ایسا مرد آیا جو خود زمانے کا ستایا ہوا تھا اور اُسے تمام تر خامیوں خوبیوں کے ساتھ قبول کرنے کو تیار تھا۔ اُس کی شادی اٹا فاٹا ہوئی۔

اس کی شادی میں ماں کی شرکت نے میرا راز بھی کھول دیا!

میرا باپ اور بھائی مطمعن تو نہ تھے مگر خالہ سکینہ کے گھر موجود ہونے پر خاموش ضرور تھے شاید اندر سے وہ یہ چاہتے ہوں مگر نرگس جیسی بدنام شہرت عورت کے گھر میری موجودگی ان کی غیرت پہ تازیانہ تھا اور ان کو پاگل کرنے کو کافی تھا!

پاگل خانے کا ایک اور محیر العقول دستور تھا کہ غاصب غیرت مند بن کر قتل کرنے کا حق رکھتے تھے!

پاگل خانوں کے مکینوں کی غیرتیں بھی پاگل تھیں!

میرے باپ اور بھائیوں کا بَس نہ چلا تو میری ماں پہ جان لیوا تشدد کیا گیا۔۔۔ ماں کو مَیں نے وہاں سے کیسے نکالا، یہ ایک الگ طویل کہانی ہے!

ماں کو سنبھالتے، جانبر کرتے کرتے میں نے ایک بیٹے کو جنم دیا! میرا اُگل۔۔۔ میرے نہاں چمن کا گُل!

نرگس اور اس کے میاں کا ساتھ ہمارے شامل حال رہا!

نرگس کے میاں کا۔۔۔ ایک مرد کا ساتھ ہونے سے ہمارے رُتبے حثیت اور مصائب و آلام کی شدت میں ویسی ہی

کی تھی جیسی کارتوس کے چیر پھاڑ دینے کے عمل میں کسی رکاوٹ میں سے گزر کر آنے سے آتی ہے۔۔۔

یہ بھی پاگل خانے کا ایک اور سنہرا اصول تھا کہ غیرت وتکریم کی نسبت صرف ان کی اپنی جنس سے انسلاک کے ساتھ تھی!

جتنے مصائب آئے جیسے عبدالمجید کی طرف سے بچہ چھین لینے کی دھمکی، باپ اور بھائیوں کا ماں کو مار کر نکال دینا، ماں کا خلع لینے کا ارادہ اور میرے ساتھ رہنے کا فیصلہ۔۔۔نرگس اور اس کا میاں میرے ساتھ رہے!

پاگل خانوں کو دیکھتے دیکھتے یہ ایک زندہ جیتا جاگتا گھر تھا جو میں نے بہت قریب سے دیکھا تھا!

اس کی اور ماں کی کوششوں سے ہماری پوسٹنگ قریبی شہر میں ہوگئی!

جہاں ہمیں۔۔۔مجھے، میری ماں اور میرے بیٹے کو اس کی چیرہ دستیوں سے کچھ نجات ملی!

کیسے ملی۔۔۔کیا کچھ سہا۔۔۔آپ کو سنانے، جزیات بتاتے پاگل خانے کی کہانی پاگل ہو جائے گی!

میرا گل اور میری ماں کے گرد میری کائنات گھومتی تھی!

بی۔اے، بی۔ایڈ کر کے مجھے ماں کے ہی سکول میں رکھ لیا گیا!

شام میں ہم چھوٹا سا ٹیوشن سنٹر چلاتے تھے!

گُل بھی ہمارے سکول کے پرائمری سیکشن میں تھا!

زندگی پاگل خانے سے موڑ کاٹ کر لگتا تھا کہ اَب شاہراہ پر گامزن ہوگئی ہے!

خود کو کامیاب دیکھنا، اپنے شاگردوں کی محبت، سکول کا سٹاف کچھ اچھا، کچھ دوست، کچھ حاسد۔۔۔تو اعتبار آنے لگتا کہ میں خود اپنی ذات میں کچھ ہوں!

میں نے تعلیم کا سلسلہ منقطع نہیں کیا تھا۔ایم۔اے کے پیپرز حال ہی میں دیئے تھے۔انہی دنوں میں جمشید رضا کا رشتہ میرے لئے آیا۔ٹیوشن آنے والے بچوں کے ساتھ بہت رشتے دار آجاتے تھے، جانے کب اُسنے مجھے دیکھا اور پسند کیا!

ماں اور نرگس کا مجھ پہ بہت دباؤ تھا کہ میں یہ رشتہ قبول کرلوں!

مگر رشتوں پہ سب اعتبار میں نے کھو دیئے تھے!

لیکن میری اس دلیل کے جواب میں وہ دونوں، میری ماں اور نرگس تن کر کھڑی ہو جاتیں!

میں کمزور سے لہجے میں کہتی، میں اپنے لئے پھر سے کوئی پاگل خانہ منتخب نہیں کرنا چاہتی مگر دنیا کی لاکھوں مثالوں سے

اس دلیل کو رد کر یا جاتا!
میں حیران تھی کہ مَیں جو مطلقہ تھی، ایک بیٹے کی ماں،، جمشید کو مجھ میں کیا نظر آیا۔ وہ صاحب حثیت تھا، شکل بھی اچھی تھی، ہاں اس کی پہلی بیوی مر چکی تھی، دو بچے تھے جو گُل سے بڑے تھے!
بقول اُس کے اُس کو پُر خلوص اور مضبوط عورت ساتھ کے لئے درکار تھی اور آئینہ مجھے بتاتا تھا کہ میں بہت خوب صورت ہوں!
دھن کی پکی اور مضبوط عورت ہوں!
ایک بار پھر بہت سے خوف اور امیدوں، خدشات وتحفظات کے ساتھ میں دلہن بنی!
ہاں اس بار مجھے دل سے محسوس ہوا کہ میری شادی ہو رہی ہے!
میرے دل میں کچھ
امیدیں تھیں!
مجھے عبدالمجید کا پہلا کراہت آمیز لمس یاد آیا۔۔۔
مجھے اپنے دل میں اس کا نرم گوشہ بھی یاد آیا!
اور پھر سب کچھ خاک ہونا بھی!
اِک دم سے میری ہتھیلیاں پسینے سے بھیگ گئیں!
مجھے لگا روح پہ لگے داغ کبھی نہیں دھلتے!
پاگل خانوں سے رہائی کے بعد بھی مظلوم قیدی ان جھٹکوں کو کبھی نہیں بھلا پاتے جو انہیں بلا تقصیر دیئے جاتے ہیں!
میری شادی ہو گئی!
جمشید شہر کا باسی تھا، پڑھا لکھا تھا، صاحب حثیت تھا اور میں نے یہ شادی اس کے ساتھ اسی شرط پہ کی تھی کہ میری ماں اور میرا بیٹا میرے ساتھ رہیں گے!
مگر شادی کے بعد کچھ ہی عرصے میں اس کے رویے نے ماں اور گُل کو واپس ہو جانے پہ مجبور کر دیا!
ماں میرا ہاتھ دبایا اور سرگوشی سے کہا ''اپنا گھر بساؤ''
میرا دل میری روح سمیت اس دن ایک بر پھر جلا۔۔۔
شعلے بلند ہوئے اور سب کچھ خاک ہو گیا۔ میری روح نے مجھ سے سرگوشی کی ''پاگل خانہ بدلا ہے، بس، تم وہ آیت ہو

جو پاگل خانے کے کسی فریق کے لئے نازل نہیں کی گئی‘‘

اس دوران میں نے ایم۔فل کیا اور جمشید کے ایک اور بیٹے کی ماں بنی!

پاگل خانے کا ایک اور دستور مرد مکمل بے اعتبار ہو کر بھی معتبر تھا!

مجھے سکول کے ہی کالج میں بطور لیکچرار ترقی مل گئی!

نرگس اور میں ہمیشہ ملے مگر اپنا بھرم رکھ کر!

حالانکہ بہت مقام آئے جب میں نے ضبط کھویا!

بظاہر مضبوط نظر آنیوالی مدحت فاطمہ اس کھوکھلے ساتھ میں اندر سے کتنی ٹوٹ چکی تھی، کون جانتا تھا! مگر اَب بظاہر ایک معزز شخص کی بیوی تھی!

میرا گُل نانی کی چھاؤں میں پلا اور پرائے بچوں کو مجھ سے توقع کی گئی کہ ماں بن کر پالوں! زنجیریں ہی زنجیریں!

یہ پاگل خانوں کا ایک اور دستور تھا کہ امید اور حق واستحقاق جتانے کے سارے اختیار جنس مخالف کے پاس تھے!

جمشید نے مجھ میں صرف ایک خوب صورت بیوی اور ایک عمدہ کیئر ٹیکر دیکھی تھی! کم از کم اس کے مشاہدے و تجربے کی داد تو بنتی ہے!

ہاں گُل اور عامر میرے دونوں بیٹے بلکہ میرے سوتیلے بچے بھی۔۔۔ میں نے کوشش کی کہ ان کو پاگل خانے کے مجرم نہیں بننے دوں گی!

مگر میرا دل تھا کہ جمشید کو میری زندگی میں آئے تیسرے پاگل خانے کا پانچواں مجرم قرار دیتا تھا اور اس جرم سے بَری نہ کرتا تھا۔۔۔

کیونکہ یہ وہ شخص تھا جس سے میں محبت کرنے کی کوشش کی۔۔۔شاید ہو بھی گئی!

مگر اس کے رویے کی سفا کی نے اس محبت کو بے دردی سے قتل کر دیا!

اس دن گھبرا کر نرگس کے گھر چلی گئی اور جانے کیا ہوا اس کے گلے سے لگ کر روتے روتے دل کی ساری گاگر خالی کر دی! زندگی کے پینتیس سال اور مقدر صرف پاگل خانے!

نرگس کو دیکھ کر دل دکھ سے بھر گیا۔ وہاں ایک موٹی، بھدی ادھیڑ عمر عورت تھی، وہ شوخ وشنگ قیامت سی نرگس کو گھریلو جھنجھٹ کھا گئے!

مگر اس کے اونچے اونچے قہقہے ویسے ہی تھے!

لیکن جب میں نے بھرم کا پردہ چاک کر کے اپنے دکھ کہے تو وہ سنجیدہ ہوگئی۔
کہنے لگی ''تم کیا سمجھتی ہو؟! تم جن سمھوتوں کا زکر کرتی ہو، گر میں تمہیں اپنے زخم دکھاؤں تو تم پوری کتاب مرتب کر لو۔ میرا میاں شادی کے کئی برس تک مجھے جس نام سے پکارتا تھا وہ صرف ایک غلیظ گالی تھا جس سے منع کرنے والی اب میری بیٹی ہے، وہ غصے میں پاگل ہوتا ہے تو میری ماں، بہن، پورا کنبہ ایک کر کے رکھ دیتا ہے! میں تمہیں کیا کیا بتاؤں اور کیا کیا چھوڑوں مگر مجھے پھر بھی اس سے عشق ہے۔۔۔''
اک طرف وہ اس سے اعتراف عشق کرتی تھی اور دوسری طرف وہ کہتی تھی ''میں اسے صاف کہتی ہوں زبیر میں روز حشر تمہیں معاف نہیں کروں گی''
میں ہاں پاگل خانے میں اپنے آخری پاگل خانے میں دوبارہ سے جی اٹھنے کا عزم نرگس سے لے کر اٹھی، وہیں میرے ہاتھ کئی زریں اصول بھی ہاتھ لگے۔
پاگل خانہ۔۔۔دنیا اک بہت بڑا پاگل خانہ ہے جو بہت سے چھوٹے چھوٹے خانوں میں منقسم ہو چکا ہے!
پاگل خانے کے مجرم خود ان جرائم پہ اپنے آپ کو برحق سمجھتے ہیں، یہ بھی ایک اصول ملا!
خود ان پاگل خانوں کی قیدی، تمام تر اعتراف و جانکاری کے، مردانگی کے پاگل پن کو تسلیم کر کے اسے ایک آڑ مہیا کرنے کو تیار رہتی ہے۔۔۔یا صدیوں کی مشق نے اسے اس کی عادت ڈال دی ہے!
وہ اپنے نقصان کو قسمت اور اپنی پرواز کی آرزو کو بیماری قرار دے کر پرواز صرف پاگلوں کا حق سمجھتی ہے!
وہ ان پاگل خانوں کی قیدی ہے، ان پاگل مجرموں کے ساتھ رہتے رہتے محبت اور مجبوری کا فرق بھول چکی ہے!
وہ ان مجرموں کو یہ بتانے سے بھی قاصر ہے کہ تمہاری عقل کے غرور نے دنیا کو جنگ، بھوک، افلاس اور پاگل پن کے سوا کچھ نہیں دیا!
اس پاگل خانے سے نکلنے والا سب سے سنہری، آب زر سے لکھا جانے والا اصول یہ تھا کہ ان پاگلوں سے مقابلہ کرنے کو کچھ پاگل ہونا پڑے گا!
اور آج میں، مدحت فاطمہ، اِک معزز استاد بظاہر ایک معزز مرد کی بیوی اور بچوں کی ماں اپنی کہانی آپ سے بانٹ چکی ہوں تو کیا یہ امید میں آپ سے رکھوں کہ آپ اسے انسانی بنیادوں پہ ایک انسانی کہانی سمجھیں گے؟؟
اِک عورت کتھا نہیں؟!
شاید میں واقعی پاگل ہوں جو ایسا سوچتی ہوں!

لومبارڈی

سرورغزالی (برلن جرمنی)

اٹلی کے ایک گاوں کی کہانی جہاں کبھی ھن برستا تھا اور اب وھاں کی در و دیواروں سے وحشت ٹپک رھی ھے۔ ایک آدمی کی کہانی جس کی پوتی سوئل اور ببریا سے ھوکر آتی ھے۔ وباکی کشمکش اور موت کارقص....

لومبارڈی میں موت کا رقص جاری تھا۔۔۔۔۔گارڈیسی قوم کے باشندے ایک دور دراز علاقے کمپانین کے اس چھوٹے سے گاوں میں جو کہ سطح سمندر سے تقریبا" ہزار میٹر اونچائی پر نہایت سرسبز پہاڑی پر واقع ہے، اس پرفضا مقام پر رہتے ہیں۔ان کی صحت اس پرفضا آلودگی سے پاک ماحول میں قابل رشک تھی۔اور یہاں کے باشندوں کی طویل العمری کا رازان کے رہن سہن کے علاوہ اس پرفضا مقام کی مرہون منت تھی۔کل تقریبا" دو ہزار نفوس پر مشتمل یہ گاوں دشوار گزار پہاڑی سلسلے کے اختتام پر واقع ہے یہاں کے لوگ نہ صرف بہت صحت مند بلکہ خاصے دولت مند بھی ہیں۔لومبارڈی کی وجہ شہرت اس کی اپنی خوبصورتی، اس کے دلکش مناظر کے ساتھ ساتھ اسی نام کی ایک گلوکارہ اور دوسرے کئی فنکار بھی ہیں۔

قلوپطرہ لومبارڈی، جب جب اپنے تھکا دینے والے کنسرٹ کے دورے سے لوٹتی تو سب سے پہلے اپنے دادا تھامس لومبارڈی سے ملنے اور اپنی تھکن اتارنے اپنے گاوں لومبارڈی پہنچ جاتی اور یہاں چند دن گزار کر واپس کسی نئے دورے پر نکل جاتی یا پھر اپنے دوست کے پاس پڑوس ملک جرمنی چلی جاتی۔ جہاں اس کا مستقل قیام ہوتا۔وہ ہر سال کچھ عرصہ ضرور بوڑھے دادا کے ساتھ گزارتی۔

لومبارڈی شمالی اطالیہ کے شہر میلان کے قرب میں واقع ہے

میلان شمالی اطالیہ کا اہم کاروباری اور صنعتی مرکز ہے اور معیشت کے پہیے کا دھرا۔لومبارڈی کے آس پاس ایسے کئی

خوبصورت اور پروقار علاقے ہیں جہاں دولت برستی ہے۔ بڑے بڑے رہائشی مکانات ہیں۔۔۔۔۔مگر اس کی رونق صرف اور صرف سیاحوں کے دم سے باقی رہ گئی ہے۔ سارا دن یہاں خاموشی اور متانت اور بوڑھی ہوتی اداسی گھروں سے نکل کر آتی جاتی ہے ورنہ بس خموشی۔ موسم گرما میں یہاں رنگ برنگ پھول کھلتے ہیں اور سیاحوں کو اپنی جانب متوجہ کرتے ہیں تو جیسے علاقے کی جوانی لوٹ آتی ہے۔۔۔۔۔علاقے کے رہائشی بوڑھے جو کبھی کبھار اپنے بچوں کی آمد پر خوش ہوتے ہیں سیاحوں کی آمد پر پہلے خوش ہوتے ہیں پھر رشک کرتے ہیں اور پھر ان کی ہلچل اور شور سے گھبرا کر ان سے منہ موڑ لیتے ہیں۔۔۔۔

تھامس بہت خوش تھا کہ اس کی پوتی مشہور زمانہ گلوکارہ تھی اور اکثر اس سے ملنے آجاتی تھی۔ ورنہ تو اس کے پڑوسیوں کے بچے جب جوان ہو کر یہاں سے نکلتے تو میلان اور روم کی یونیورسٹیوں میں پڑھائی کے دوران تو اپنے باپ ماں سے ملنے آتے رہتے تھے مگر جونہی انہیں لندن یا برلن میں کوئی اچھی نوکری مل جاتی تو انہیں واپس پلٹنے کی فرصت ہی نہ ملتی۔ کبھی کوئی اپنے بوائے یا گرل فرینڈ کو لیکر آتا تو آتا ورنہ وہ بھی نہیں۔۔۔۔۔تھامس کی پوتی مگر زرا مختلف طبیعت کی مالک تھی اور وہ خود اتنی زیادہ دولت کما رہی تھی کہ اسے اپنے باپ دادا کی دولت جائیداد کی کوئی پرواہ نہ تھی اور وہ بغیر کسی مطلب کہ صرف ان سے ملنے ہی لومبارڈی آیا کرتی تھی۔

قلوپطرہ لومبارڈی اپنے دو چھوٹے بچوں اور بچوں کے باپ، اپنے دوست مائیکل لومبارڈی کے ساتھ جنوبی جرمنی کی ریاست ببریا میں ایک بڑے سے کاٹج میں ہنسی خوشی رہ رہی تھی۔

وہ ایک کامیاب گلوکارہ کے طور پر ابھر رہی تھی۔ پھر جب اسے جنوبی کوریا کے شہر سوئل سے ایک بڑے کنسرٹ کی دعوت ملی تو وہ اپنی قسمت پر نازاں ہوگئی۔ وہاں کی ایک بہت بڑی میوزک کمپنینے اسے سوئل آنے اور اپنی آواز کا جادو جگانے کی دعوت دی تھی۔ اور ایک عظیم الشان کنسرٹ پر بے شمار رقم لگا کر اس کمپنی نے قلوپطرہ سے بہت ساری امیدیں وابستہ کرلیں تھیں۔۔۔۔۔۔قلوپطرہ پر بھاری ذمہ داری عائد ہوگئی تھی کہ وہ اپنے اس تاریخی دورے میں سوئل کے نوجوانوں کو اپنی موسیقی اور گلوکاری سے ایک ایسے سحر میں مبتلا کردے۔ جس کی مثال اس سے پہلے کبھی نہیں قائم ہوئی تھی۔ قلوپطرہ کنسرٹ کی تیاری میں لگ گئی۔ اس نے خوب محنت اور دل لگا کر تیاری کی اور کوئی چھ ماہ کا عرصہ صرف اس کنسرٹ کی تیاری میں لگا دیا۔۔۔۔

اور پھر وہ دن بھی آگیا جب سوئل میں ایک کھچا کھچ بھرے اسٹیڈئم میں قلوپطرہ نوجوان لڑکے لڑکیوں کو مسحور کیے دے

رہی تھی۔۔۔۔کنسرٹ بہت کامیاب رہااور کمپنی کے مالک نے آگے بڑھ کر قلوپطرہ کو گلے لگالیا۔
یوں بھی پچھلے چھ ماہ سے دونوں، میل، ٹیلی فون اور ویڈیو چیٹ کے ذریعہ ایک دوسرے کے خاصے قریب آ چکے تھے۔اوراس دن کی کامیابی نے جذبات کے سارے بندھن توڑ دیئے۔۔۔۔
کنسرٹ کے بعد قلوپطرہ، کمپنی کے مالک نوجوان ہوان لی کی خصوصی دعوت پرشہر کے سب سے مہنگے پانچ ستارہ ہوٹل میں کھانے پر مدعو تھی۔۔۔۔۔کھانے کے بعد جام لنڈھائے جانے کا دور چلتا رہااور پھر رات بہت بھیگ گئی تو پھرسب اپنے اپنے سوٹ کوسدھارے گئے۔۔۔۔۔
ہوان نے اس قدر کامیاب بزنس سے خوش ہوکر قلوپطرہ کو ایک ہفتے کی سیاحت پر چلنے کی دعوت دے ڈالی۔۔۔۔قلوپطرہ اس عظیم الشان کامیابی کے نشے میں چور ہوان کا دل نہ توڑ سکی۔اس کے ٹور کے مقامی مینجر نے بھی قلوپطرہ کو یہی صلاح دی کہ مستقبل میں مزید اسی طرح کی بے مثال کامیابی کے حصول کی خاطر اسے ہوان کی دعوت پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیئے۔
ہوان،قلوپطرہ کے دعوت کے قبول کر لینے سے اتنا خوش ہوا کہ اس نے اپنے مینجر کوسڈنی میں مزید ایک اور کنسرٹ ٹور کے لیے بات چیت کرنے کا حکم دے ڈالا۔۔۔۔۔
قلوپطرہ ہوان کے اس پے در پے مہربانیوں سے خوشی کے مارے پاگل ہوئی جارہی تھی۔
اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کیا وہ واقعی اتنی اچھی گلوکارہ ہے یا ہوان اس سے اتنا متاثر ہوا جارہا ہے۔۔۔۔۔مگر کنسرٹ کی کامیابی بہر حال اس کی گلوکاری کی گواہی تو دے رہی تھی۔۔۔۔۔
قلوپطرہ کی دنیا ہی بدل چکی تھی وہ شہرت کے ایسے سنگھاسن پر بیٹھی تھی کہ جہاں سے وہ پہلے والی قلوپطرہ ہی نہیں رہی تھی۔ہوان کی دوستی صرف دوستی نہیں بلکہ محبت میں بدل چکی تھی۔اور قلوپطرہ اب اپنا سب کچھ داو پر لگانے پر تلی بیٹھی تھی۔ہوان نے اسے وہ سب کچھ دیا تھا جو وہ اب تک نہ پا سکی تھی۔دولت،شہرت اور سب سے بڑھ کر محبت۔وہ اپنی تمام تر کاروباری مصروفیات کے باوجود قلوپطرہ کو بہت وقت دے رہا تھا جو اسے اپنے دوست سے کبھی نہیں ملا تھا۔ہوان ٹوٹ کر چاہنے والا شخص تھا۔۔۔۔۔اس نے قلوپطرہ کو جذبات اور ہیجان کے ایسے سات آسمانوں کی سیر کرائی کہ وہ دنگ رہ گئی۔۔۔۔
قلوپطرہ لومبارڈی لوٹی تو وہ اب پہلے والی قلوپطرہ نہیں رہی تھی۔اس کے اور ہوان کے مابین ایک رشتہ استوار ہو چکا تھا۔ہوان نے جلد لومبارڈی آنے کا وعدہ کرلیا تھا۔اوراس قبل قلوپطرہ کو اپنے دونوں چھوٹے بچوں کو لومبارڈی لانا

تھا اور اپنے دوست سے بچوں کی ملاقات اور دیگر ضروری قوائد طے کرنے تھے۔

لومبارڈی میں صرف چند گھنٹے گزار کر وہ پیریا پہنچ گئی۔ اس نے اپنے دوست کو صاف صاف بتا دیا کہ وہ اس کنسرٹ دورے میں اپنا نیا دوست بنا چکی ہے اور اب اس کے ساتھ مذید زندگی نہیں گزارنا چاہتی۔ اس کے دوست کو بہت افسوس ہوا اس نے قلوپطرہ اور اپنی دوستی بچانے کی بہت کوشش کی مگر اسے کامیابی کی کوئی امید نظر نہ آئی تو پھر اس نے قلوپطرہ پطرہ کے سامنے سر ڈال دیا۔ اور وعدہ کر لیا کہ وہ دونوں جلد ہی اپنے اپنے وکیلوں کی معرفت بچوں سے ملاقات، چھٹیوں میں گزارنے کے اوقات اور بچوں کے اخراجات کی ادائیگی جیسے معاملات طے کر دیں گے۔ ایک دو دن بعد قلوپطرہ بچوں کے ساتھ لومبارڈی لوٹ گئی۔

لومبارڈی میں اس نے اپنے دادا کیگھر کے قریب ہی واقع ایک اور فلیٹ، جو اسی کے خاندان کی ملکیت تھا کو رہنے کے لیے چنا اور اس کی زیبائش اور آرائش میں لگ گ ء۔

چند دن بعد ہوان لومبارڈی آ چکا تھا۔ اور قلوپطرہ اس کے دونوں بچے اور ہوان فلیٹ میں رہتے ہوئے ایک مکمل اور مطمئین خاندان لگ رہے تھے۔ ہوان لومبارڈی کی خوبصورتی اور دلکشی میں کھویا ہوا تھا اور قلوپطرہ اس کی محبت سے سرشار تھی۔

ابھی چند دن ہی گزرے تھے کہ قلوپطرہ کے دادا کی طبیعت خراب ہوگئی۔ اسے فلو ہو گیا تھا۔ دو ایک روز میں جب اس کی کھانسی کم ہونے کی بجائے بڑھنے لگی تو قلوپطرہ اسے ڈاکٹر کے پاس لیکر گئی۔

ڈاکٹر نے اسے آنٹی بائیوٹک لکھ دیا اور خوب آرام و احتیاط کرنے کو کہا۔ ساتھ میں اس کے خون اور تھوک کا تجزیہ کرنے کے لیے نمونے بھی لیے۔

قلوپطرہ کو اندازہ نہ تھا کہ ڈاکٹر کیوں اس قدر جتن کر رہا ہے اور معمولی سی کھانسی بخار کو کیوں اس قدر اہمیت دے رہا ہے۔

دنیا اس وقت کورونا وبا سے صرف اتنا واقفیت رکھتی تھی کہ چین پر اس وائرس کی مصیبت آئی ہوئی ہے۔

چار دن بعد جب ٹیسٹ رپورٹ آئی تو ڈاکٹر کا شک درست نکلا۔۔۔۔۔ تھامس پر کورونا وائرس کا حملہ ہوا تھا۔۔۔ اور اسے سخت احتیاط کی ضرورت تھی۔ قلوپطرہ بہت پریشان ہوگئی۔ ڈاکٹر نے فوری طور پر گھر میں بند الگ تھلگ رہنے کا مشورہ دیا۔ اور یہ بھی کہا کہ قلوپطرہ سمیت کوئی بھی تھامس سے ملنے نہ جائے۔ یہ بڑی عجیب وغریب پابندی تھی۔ عام طور پر بیماریوں میں انسان ہسپتال میں رہتا ہے تو وہاں اس کے عزیز و اقارب اس سے ملنے آتے

ہیں جس سے انسان کیڈھارس بندھتی ہے۔مگر یہ عجیب وغریب بیماری تھی کہ اس میں قید تنہائی کی سزا مل رہی تھی۔
تھامس کے ساتھ اس کے پاس پڑوس اور محلے کے کئی ایک بوڑھے کورونا مرض کا شکار ہو چکے تھے۔
جب وبا ایک دم پھیلنا شروع ہوئی تو عوام اور حکام میں تشویش کی لہر دوڑ گئی۔وبا تیزی سے یوں پھیل رہی تھی کہ ہر ایک فرد تین مذید افراد میں یہ مرض پھیلانے کا باعث بننے لگا۔اس بیماری کے اثرات سب سے زیادہ ضعیف اور ایسے افراد میں نمایاں دکھائی دے رہے تھے۔جن میں بیماری سے دفاع کا نظام کمزور تھا۔لومبارڈی سمیت کمپانین کا علاقہ کورونا مرض کا گڑھ بن چکا تھا۔
اس رات تھامس نے اپنی پوتی کوفون کیا:
"قلو مجھے سانس لینے میں سخت تکلیف ہورہی ہے" تھامس نے بری طرح کھانستے ہوئے اپنا جملہ مکمل کیا۔۔۔۔
"تھامس تم پریشان مت ہو میں ایمبولینس بلاتی ہوں۔اور پھر تمہاری طرف آتی ہوں" قلوپطرہ بولی۔
"نن۔۔۔نہیں تم۔۔تم مت آو۔۔۔" تھامس اس سے آگے نہ بول سکا۔
قلوپطرہ نے ایمبولینس کوفون کیا۔اور دادا کی بگڑتی صورتحال کا بتانے لگی۔
تمام نام پتہ لیکر۔۔۔۔ایمبولینس کے عملے نے قلوپطرہ سے کہا کہ وہ اپنے فلیٹ کے نیچے آکر ان کا انتظار کرے اور اگر اس کے دادا کے گھر کی چابی اس کے پاس ہو تو لیتی آئے۔
قلوپطرہ چاہتے ہوئے بھی دادا کے گھر نہ جاسکی۔
وہ گرم کوٹ پہن کر باہر نکلنے لگی تو ہوان دروازے کے سامنے اس کا راستہ روکے کھڑا تھا۔
"تم اس وقت کہاں جارہی ہو۔"؟اس نے نیند بھرے لہجے میں قلوپطرہ سے سوال کیا۔
"وہ وہ دادا کی طبیعت بہت خراب ہے اور مجھے اسے اسپتال لے جانا ہے۔" قلوپطرہ ایک طرف ہوکر نکلنے کی کوشش کرنے لگی۔مگر ہوان اسے باہر جانے دینے سے روکتے ہوئے پھر بولا۔۔۔۔۔
"مم مگر تم تھامس کے پاس کیسے جاسکتی ہو۔۔۔۔۔یہ مرض بہت جلدی ایک سے دوسرے کو لگ جاتا ہے۔۔۔تم ایمبولنس بلاو۔"
"ہاں وہی کر رہی ہوں۔۔۔۔تم مجھے جانے دو" قلوپطرہ تیزی سے بولی اور پھر روہانسی آواز میں دھیرے سے بڑ بڑائی۔۔۔۔" آہ میرے پیارے تھامس میں تمہاری اس مشکل گھڑی میں تمہارا سر سہلانے سے بھی قاصر ہوں۔۔۔۔"۔

اور پھر ہوان کو مخاطب کر کے بولی: "میں ایمبولینس کے ڈاکٹر سے مل کر اسے تھامس کی چابی دوں گی اور وہ لوگ تھامس کو لیکر جائیں گے۔۔۔"۔ اتنا کہہ کر وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔
ایمبولینس والوں نے چابی لیکر قلوپطرہ کو واپس جانے کا کہہ دیا۔ وہ خود ہی تھامس کو اسپتال لے جانا چاہتے تھے۔
قلوپطرہ واپس اپنے فلیٹ چلی آئی اور کھانے کے کمرے سے تھامس کے گھر کو ٹکٹی باندھے دیکھنے لگی۔
ایمبولینس ذرا سا چل کر تھامس کے گھر کے سامنے رک گئی تھی اور اس کا مستعد عملہ گھر میں داخل ہو چکا تھا۔
قلوپطرہ کھڑکی سے لگی دیکھتی رہی چند منٹوں بعد ہی ایمبولینس کے عملے دو افراد تھامس کو پکڑ کر دروازے تک لے آئے تھے اور وہ اسے ایک پہیوں والی کرسی پر بٹھا رہے تھے۔ پھر وہ لوگ اسے ایمبولینس میں بٹھا کر اسے ابتدائی طبی امداد دیکر اسپتال روانہ ہو گئے۔ اسپتال میں تھامس کی حالت مذید خراب ہوئی تو اسے اسپتال کے انتہائی نگہداشت کے شعبے میں داخل ہونا پڑا۔ تھامس کے پھیپھڑے تیزی سے متاثر ہوتے ہوئے، سانس لینے کے عمل کو چھوڑ رہے تھے۔
اسپتال سے ایک نرس روز فون پر قلوپطرہ کو تھامس کی طبیعت کی آگاہی دیتی اور قلوپطرہ کو سختی سے منع کرتی کہ وہ اسپتال نہ آئے۔
اطالیہ میں روز بروز کورونا کی وبا میں مبتلا افراد کا اضافہ ہو رہا تھا۔۔۔ اسکول بند کر دیئے گئے تھے۔۔۔ اور ایسے میں ایک دن ہوان نے قلوپطرہ کو یہ خبر سنا کر اس کے اوسان خطا کر دیئے۔ کہ۔۔۔ ہوان سوئل واپس جانا چاہتا ہے۔۔۔ وہ اپنے وطن میں خود کو زیادہ محفوظ سمجھتا تھا۔۔۔۔ پھر یہ کہ اس کے اطالیہ کے کاغذات بھی ابھی پوری طرح مکمل نہ ہوئے تھے۔۔۔۔ ہوان کو پاس پڑوس کے لوگ مشکوک نظروں سے بھی دیکھتے تھے۔ اطالیہ پوری طرح سے وبائی مرض میں جکڑا جا چکا تھا اور وبا کے پھیلنے سے لوگوں میں افواہیں بھی پھیل رہی تھیں۔۔۔۔ لوگوں میں یہ چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں کہ یہ وبا چینی سیاحوں کی وجہ سے اطالیہ میں پھوٹ پڑی ہے۔۔۔۔۔ ان سب حالات کے پیش نظر ہوان سمجھتا تھا کہ اس کا اس وقت سوئل چلے جانا ہی بہتر ہے۔
ہوان کے چلے جانے سے قلوپطرہ بالکل تنہا رہ گئی تھی۔ اس کا دادا بدستور اسپتال میں انتہائی نگہداشت کے شعبے میں مقید تھا۔۔۔ کبھی وہ خود اسپتال فون کرتی کبھی اسے اسپتال سے فون کر کے اطلاع دیتا کہ اس کا دادا اب بھی زندہ تو ہے مگر زندگی اور موت کی سرحد پر جنگ آزمائی کا شکار ہے۔
لومبارڈی، کمپانین اور میلان سمیت جنوبی اطالیہ کے تمام علاقے آفت زدہ قرار دیئے جا چکے تھے۔ اسپتال

مریضوں سے پٹے پڑے تھے۔ان میں مریضوں کو رکھنے کی جگہ نہ تھی۔ یہاں وبا سے تقریبا" ساٹھ سے ستر فیصد افراد متاثر ہو چکے تھے،شرح اموات آٹھ فیصد تک پہنچ چکی تھی۔علاقے میں کہرام مچا تھا۔

لوگوں کو دوسری جنگ عظیم کا دور دورہ یاد آ گیا تھا۔

قلوپطرہ اپنے دونوں چھوٹے بچوں کے ساتھ بے حد پریشان تھی۔

ایک دن صبح ہی صبح قلوپطرہ کے سابقہ دوست نے اسے فون کیا وہ بچوں کی خیریت جاننا چاہتا تھا۔۔۔۔اس نے لومبارڈی کی موجودہ صورتحال کے پیش نظر بچوں کو ببریا لے جانے کی خواہش ظاہر کی جسے قلوپطرہ نے بخوشی مان لیا۔

فون بند کر کے اس نے بچوں کی آیا سے کہا کہ وہ بچوں کو تیار کرے،ان کا سامان باندھے اور خود بھی بچوں کے ساتھ مائیکل کے یہاں چلی جائے۔کم از کم دو ہفتے بچے اور وہ وہیں رہیں گے اور باقی کی بعد میں دیکھی جائے گی۔ چند گھنٹوں بعد ہی مائیکل بچوں کو لینے آ گیا۔قلوپطرہ بچوں اور آیا کو نیچے چھوڑنے آئی۔ بچے خوشی خوشی مائیکل سے مل رہے تھے اور آیا انہیں گاڑی میں بٹھانے لگی تھی۔ مائیکل نے ہوان کو موجود نہ پا کر قلوپطرہ کو بھی ساتھ چلنے کی دعوت دے ڈالی۔

قلوپطرہ نے صرف پرنم آنکھوں سے مائیکل کو دیکھا اور بولی کچھ نہیں۔ چلتے وقت جب مائیکل نے اس سے دوبارہ ساتھ چلنے کی درخواست کی تو وہ بولی:

"تم جانتے ہو میں تھامس کو اس جان کنی حالت میں چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔تم جاو بچوں کا بہت خیال رکھنا۔"

"میں نے میونخ کے ایک اسپتال میں گرینڈ پا کے علاج معالجے کی بات کی ہے۔" مائیکل بولا "اگر تم۔چاہو تو میں انہیں فوری طور پر ایک طبی ہیلی کاپٹر کے ذریعہ میونخ منتقل کروا سکتا ہوں۔اخراجات کی تم پرواہ مت کرو"۔

"نہیں یہ بات نہیں۔تھامس کی طبیعت کچھ سدھرے تب ہی ایسا سوچا جا سکتا ہے۔۔۔۔۔مگر اس پر عمل تب ہی ہوگا جب تھامس ایسا کرنے پر رضامند بھی ہو"۔قول پطرہ کی آواز گلوگیر ہو گئی۔ مائیکل اسے دلاسہ دیتا رہا۔۔۔۔اور پھر وہ بچوں کو لیکر روانہ ہو گیا۔

قلوپطرہ اوپر اپنے فلیٹ میں چلی آئی۔۔۔۔اس کا دل بہت اداس ہو رہا تھا۔۔۔۔بچوں کے چلنے جانے سے وہ خود کو بالکل تنہا محسوس کر رہی تھی۔۔۔۔

اس نے گھبرا کر ہوان کو فون لگایا۔۔۔۔۔گھنٹی بجتی رہی۔کئی بار فون کرنے کے باوجود وہ صرف گھنٹی بجنے کی آواز

سن سن کر مذید الجھ گئی۔
اسے اچانک سے محسوس ہوا کہ اس کے کانوں میں فون نہیں بلکہ اس کے اپنے محلے کے چرچ کی گھنٹیوں کے بجنے کی آوازیں آ رہی ہیں۔۔۔۔۔۔۔
وہ اٹھ کر کھڑکی کے پاس آ گئی۔۔۔سچ مچ چرچ کی گھنٹی بج رہی تھی۔ چرچ کی گھنٹی کا یوں بجنا پھر کسی موت کا سوگ منانے کی علامت تھی۔۔۔۔۔۔ نیچے کفن دفن کرنے والی ایک گاڑی ٹھیک وہیں کھڑی تھی جہاں چند گھنٹے قبل مائیکل نے اپنی کار کھڑی کی تھی۔۔۔۔۔
قلوپطرہ نے ایک موم بتی تلاش کی اور ماچس سمیت اسے لیکر نیچے اتر آئی۔۔۔۔۔۔
اس نے چرچ کی طرف جاتے ہوئے میت گاڑی پر نگاہ ڈالی۔۔۔کفن دفن کا عملہ کسی کی لاش کو گاڑی میں ڈالا رہا تھا۔۔۔دونوں فرد ایک خلائی مخلوق کو پہنائے جانے والے لباس میں ملبوس تھے۔۔۔ان کے سر اور چہرے بھی کسی ہیلمٹ اور اس کے ماسک سے ڈھکے ہوئے تھے۔۔۔۔۔۔۔قلوپطرہ کو داخلی دروازے پر دیکھ کر دونوں افراد نے صرف ہاتھ کے اشارے سے اسے قریب آنے سے روک کر وہاں سے فوری طور پر جانے کا کہا۔۔۔۔۔۔قلوپطرہ جان نہ سکی کہ کس کی موت ہوئی تھی۔
وہ بوجھل قدموں سے چل کر چرچ تک آئی۔۔۔۔۔۔ چرچ کا دروازہ مقفل تھا۔۔۔۔مگر گھنٹی بدستور بج رہی تھی۔۔۔وہاں پر کئی لوگ تھوڑا فاصلہ رکھتے ہوئے۔۔۔چرچ کی سیڑھیوں پر موم بتی جلا کر رکھتے جا رہے تھے۔۔۔۔۔قلوپطرہ بھی قطار میں لگ کر انتظار کرنے لگی۔۔۔۔۔گو اس کے آگے صرف تین ہی فرد کھڑے تھے۔۔۔۔مگر سماجی دوری کا بھوت انہیں ایک دوسرے سے قریب آنے سے روک رہا تھا۔۔۔۔اور معانقہ جو ایسے موقع پر کیا جاتا تھا۔۔۔۔قصہ پارینہ بن چکا تھا۔۔۔

گھر کا چراغ

ڈاکٹر اختر آزاد (جمشید پور)

موبائل : 9572683122

مولانا جانشین حیدر کا شمار گاؤں کی اہم شخصیتوں میں ہوتا تھا۔عزت کی سیڑھی سے رسوخ کی دیواریں چڑھتے چڑھتے مُکھیا ہو گئے تھے۔عمر پچپن چھپّن کے قریب رہی ہوگی۔آج بھی سچائی، ایمانداری، اور پاک بازی کے معاملے میں اپنی مثال آپ تھے۔تمام مسائل کا حل ان کے پاس تھا۔دور دراز سے بھی لوگ آیا کرتے۔لیکن جب اپنے گھر کے چراغ کا مسئلہ سامنے آیا تو وہ اُلجھتے چلے گئے۔

کبھی وہ گبرو نوجوان تھا۔پونے چھ فُٹ سے بھی نکلتا قد۔گندمی رنگ، لمبی ناک، بولتی آنکھیں ، گھنگھریالے بال۔سلیقے دار داڑھی، چال میں ٹھہراؤ اور باتوں میں جادوئی انداز۔اس پُرکشش شخصیت کے باعث لوگ کھنچے چلے آتے تھے۔لڑکیاں جان چھڑکتی تھیں۔لیکن اُنہوں نے کبھی کسی پر بُری نظر نہیں ڈالی۔گھر والوں کو اپنے جانشین پر بھروسہ تھا۔لیکن ڈر بھی تھا کہ کہیں کوئی لڑکی اس کے دل پر جادو نہ کر دے اور بغیر بارات ڈولی کے وہ بہو بن کر گھر نہ آجائے۔اس لئے جلد سے جلد اس کی شادی کر دینا چاہتے تھے۔لیکن اس نے گاؤں میں رشتہ کرنے سے انکار کر دیا۔

پڑوسی گاؤں سے دُلہن کا انتخاب کیا گیا۔خوبصورت، کمسن اور ساتھ میں نازک۔عمر اٹھارہ انیس ......جانشین چھبّیس ستائیس کا۔صحت مندی کا پیکر۔چوڑا سینہ۔شبابی جوش سے بھرپور کمر کا گھیرا۔بازوؤں میں فولادی طاقت۔نشے سے پاک۔صنفِ نازک جیسی بیماری سے بھی محفوظ تھا۔

پہلی رات.........

جیسے برساتی پانی گھاٹی میں آہستہ آہستہ جمع ہوتا رہا ہو اور ایک دن باندھ کے کنارے کو کاٹتے ہوئے سیلاب بن کر آس پاس قہر برپا رہا ہو۔اُسے احساس تھا کہ وہ زیادتی کر رہا ہے لیکن اس کے بعد بھی وہ خود کو قابو میں

نہیں کر پایا۔ نازک سی جان نے کسی طرح اپنی جان بچائی۔

دوسری رات اُس نے صاف انکار کردیا۔ ہر رات فیصلہ کرتی کہ کل سے وہ اُسے قریب نہیں آنے دے گی۔ لیکن جانشین محبت بھری باتوں میں اسیر کر کے اُسے بازوؤں میں قید کر لیتا۔ منا لیتا۔ اور یہی سب معمول کا حصہ بن گیا۔

شبابی گھوڑے دوڑاتے ہوئے مولانا جانشین حیدر نے یہ نہیں دیکھا کہ سڑک کیسی ہے؟ بس من موجی انداز میں رفتار کے گھوڑے دوڑاتا رہا۔ تیز رفتاری حادثے کا پیش خیمہ بنی تو نازک حسینہ خوشی سے اُچھل پڑی کہ اب اُس کے لئے آسمان سے راحت کا پیغام اُترے گا۔ کمر کا دائرہ پھیلتے ہی شروعاتی دنوں میں اسکولی بچّے کی طرح ہفتے میں ایک دن بستے کا بوجھ کم ہوا۔ سوار کے اوپر سے کچھ اور بوجھ کم کروانا چاہتی تھی۔ جانشین ''ہاں'' میں ''ہاں'' ملاتا۔ لیکن جیسے ہی رات اپنے بھیگے پنکھ سکھانے گرم بستر تک آتی وہ اُسے دبوچ لیتا۔ اس دن تو حد ہی ہوگئی تھی۔ جب اُسے معلوم ہوا کہ دن پورے ہو گئے ہیں اور کسی وقت ہسپتال میں داخل کرنا پڑ سکتا ہے۔ چالس دن کی چھٹی ہو سکتی ہے۔ درد شروع ہو گیا تھا لیکن اس حالت میں بھی اُسے ترس نہیں آیا۔ منع کرنے کے باوجود وہ سوار ہو ہی گیا۔

دن مکمل کر چکے بچے کے دماغ میں گہری چوٹ آئی۔

جب وہ پیدا ہوا تو بالکل عام بچوں کی طرح تھا۔ لیکن جیسے جیسے بڑا ہوتا گیا حرکات وسکنات سامنے آتے گئے۔ ذہنی مفلوجیت آشکار ہوتی چلی گئی۔ مولانا جانشین حیدر پریشان رہنے لگے۔ اسپیشلسٹ سے رابطہ قائم کیا۔ پیسے کی پرواہ نہیں کی۔ لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ بس ایک امید کہ وقت کے ساتھ تبدیلیاں رونما ہوں گی، اور زندگی کچھ حد تک عام ڈگر پر چلی آئے گی۔

لیکن سوال یہ تھا کہ ایک بیٹا ہے وہ بھی اپاہج۔ اور کہیں اپاہج نے اپاہج کو جنم دیا تو پھر...... پھر ان کی نسل کا کیا گا؟

کبھی کبھی وہ خود کو تسلی دیتے کہ کسی کو تو بچّے کا سکھ تک نہیں ملتا ہے۔ کم سے کم نیم پاگل ہی سہی۔ اُن کے پاس بیٹا تو ہے۔ لیکن اس کا قصوروار کون ہے؟ اگر اُس دن نفس پر قابو پا لیتے تو آج اُن کی نسل اپاہج نہیں ہوتی۔ لیکن جب یہی بات بیگم جانشین کہتی تو وہ ماننے سے انکار کر دیتے۔ اُلٹا اُسے ہی قصوروار ٹھہراتے کہ اُس نے ہی کوئی اونچ نیچ کی ہوگی۔ اور کبھی سوچتے کہ اچھا آدمی بھی عورت کے قریب جا کر پاگل ہو جاتا ہے۔ تو پھر ایک پاگل عورت کے پہلو میں سمٹ کر آدمی جیسا فعل کیوں نہیں دہرا سکتا۔ جانے انجانے میں اپنے جیسے کو تو جنم دے ہی سکتا ہے۔

مولانا جانشین حیدر نے ابتدائی سات آٹھ سالوں میں بیگمی جسم کا سارا رس چوس لیا تھا۔ چار بچّے ہوئے۔ مفلوج حال بیٹا کی پیدائش کے بعد اپاہج وراثت سامنے کھڑی تھی۔ لیکن وہ صحت مند وراثت کے حامی تھے ۔ اس چاہت میں ایک کے بعد ایک تین لڑکیاں چلی آئیں۔ ڈاکٹر نے اُنہیں سمجھایا کہ اب اگر پھر سے حمل ٹھہرا تو زچّہ اور بچّہ دونوں کو خطرہ لاحق ہے۔

لیکن اس کے بعد بھی وہ لڑکے کی چاہ میں آگے بڑھے کہ کسی طرح ڈاکٹر اُنہیں پانچویں بچّے کی اجازت دے دیں۔ ڈاکٹر نے بیگم جانشین کو بتایا کہ اس حمل سے اس کی جان کو خطرہ ہے........ پھر کیا تھا: زندگی سے بچھڑنے کا غم آنکھوں میں چھلک آیا۔ اس نے شوہر کے پاؤں پکڑ لئے۔ لیکن پھر انہوں نے بھی سوچا کہ اگر بیوی مر گئی تو جسمانی خواہشات کا کیا ہوگا...؟ بیٹیوں کا کیا ہوگا......؟ آخر کار ڈاکٹر کی بات ماننے پر وہ مجبور ہوئے۔

زندگی جب کشمکش کا شکار ہوتی ہے تو اثبات ونفی کے درمیان کا راستہ تلاش کرتی ہے۔

اس دوران گاؤں میں الیکشن ہوا تو وہ مولانا گری چھوڑ کر مکھیا گری میں قسمت آزمانے اُترے۔ اور قسمت دیکھئے کہ مدرسہ میں پڑھاتے پڑھاتے مکھیا بن گئے۔

پھر تین چار سال کے اندر تینوں بیٹیاں ایک ایک کر کے سسرال چلی گئیں۔

اب باری تھی بیٹے کی۔

لیکن سیمنٹ کے درخت کی آبیاری کر کے پھل کی اُمید کرنا بے وقوفی تھی۔ پھل اب بھی اُن کی اندرونی شاخوں میں لٹک رہے تھے۔ لیکن گاؤں کی تاریخ میں اب تک ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ کسی نے دوسری شادی کی ہو۔۔ اس لئے پہل کرنے سے گھبرا رہے تھے۔ حج کر لیا تھا۔ داڑھی تو پہلے سے ہی تھی۔ دو پلی سیاہ ٹوپی نے اُن کی شخصیت کو اور بھی باوقار بنا دیا تھا۔ ایسے میں لوگ ان کے بارے میں کیا کہیں گے۔ بیوی کبھی سوتن کی اجازت نہیں دے گی۔ بدنامی اور رُسوائی کی خاطر وہ دل مسوس کر رہ جا رہے تھے۔

اِدھر بیوی کی صحت کچھ اور خراب رہنے لگی تھی۔

پہلے جتنا زور زبردستی کرنا تھا وہ کر چکے تھے۔ بے احتیاطی کا مطلب تھا اپنے ہاتھوں بیوی کی قبر کھودنا ۔ پہلے ہفتے میں چھٹی۔ اور اب ہفتے میں صرف ایک دن کام۔ آبِ پُشت کا پورا بخار باہر نکلے تو نکلے کیسے......؟ جب وقت تھا تو پارسا بنے رہے اور اب جب جسمانی سکون کم کم میسّر ہے تو چاہتے ہیں کہ کوئی اُن کے دُکھ کا مُداوا بن جائے۔ جو کبھی اُن پر مرتی تھیں وہ اپنی اپنی چہار دیواری میں خوش تھیں۔ پہل کرنے سے اب بھی دو چار مطلبی

عورتیں مل سکتی تھیں۔ لیکن انہیں اپنی عزّت اور شہرت پیاری تھی پارسائی کے ایسے دور میں وہ چاہتے تھے کہ ایک عورت اُن کی زندگی میں آئے، جو نہ صرف جسمانی سکون عطا کرے بلکہ 'وارث' سے بھی نوازے۔

سوچ کے اس آسمان میں حقیقت کے چاند تارے ٹانکنا آسان کام نہیں تھا۔

لیکن اس مشکل کام کو آسان سے آسان تر بنانے کی جستجو میں ہمہ جہت جُٹے رہے۔ جب پہلی بار بیگم سے کہا کہ وہ بیٹے کی شادی کرنا چاہتے ہیں تو اُس نے فوراً منع کر دیا کہ یہ عورت ذات کی توہین ہے۔ بیٹا جب اس لائق نہیں ہے تو شادی کے بارے میں سوچیں بھی نہیں۔ لیکن وہ ماننے والے نہیں تھے۔ رٹ لگائے جا رہے تھے۔ ''اُنہیں ہر حال میں کا 'وارث' چاہئے۔ چاہے بیٹے سے ملے یا پھر اُن سے۔ لیکن خون اُنہیں کا ہونا چاہئے۔''

''تو ایسا کرتے ہیں کہ بڑی بیٹی کے ایک بیٹے کو گود لے لیتے ہیں۔'' بیوی نے سمجھ کی تجویز سامنے رکھی۔

''خاندان مردوں سے چلتا ہے بیگم۔'' بات کو خارج کرتے ہوئے۔ ''بیٹی اب پرائی ہو گئی ہے۔ اس لئے خاندانی وراثت کی باگ ڈور ناتی کو نہیں دے سکتا۔ مجھے اپنا وارث چاہئے جس میں میرا خون ہو۔''

پہلی بار جب بیگم جانشین دو ماہ کے لئے بستر سے چپک گئیں اور انہیں الگ رہنا پڑا تو نفس بے قابو ہو گیا تھا۔ ایسے میں مکھیا جی بیگم سے بہانہ کر کے بیٹے کو علاج کے لئے شہر لے آئے۔ جہاں اُن کا دوست عامر رشیدی اس مشکل گھڑی میں ساتھ کھڑا تھا۔ وہ نیم پاگل دلنشیں صفدر عرف راجا کو ریڈ لائٹ ائریا لے گئے۔ پیچھے سے مکھیا جی پہنچے تا کہ اصلیت معلوم ہو سکے۔ طوائف نے بتایا۔ ''راجا ذہنی طور پر پاگل ضرور ہے لیکن اس کے اندر اتنی طاقت ہے کہ وہ بیک وقت دو دو عورتوں کو خوش کر سکتا ہے۔''

مکھیا جی کا چہرہ اچانک سپاٹ ہو گیا تھا۔ بیٹے کے علاج میں لاکھوں روپے خرچ کئے تھے۔ اور اب جب مثبت نتیجہ سامنے آیا تو پریشان ہو گئے۔ پھر ایک ایسے ڈاکٹر سے رجوع کیا گیا جو پیسوں کے عوض ضمیر بیچتا ہو۔ اُسے بتایا گیا کہ ''بیٹا نیم پاگل ہے اور جنسی دورہ پڑتا ہے۔ ایک دو بار ماں کو پکڑ کر ساڑی تک کھینچ چکا ہے۔ بہنیں اس کے کمرے میں گھسنے سے ڈرتی ہیں۔ پڑوس کی کئی لڑکیوں نے بھی شکایت کی ہے کہ وہ آتے جاتے اُن کا راستہ روک لیتا ہے۔ غلط جگہ پر ہاتھ مارتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب! اب آپ ایسا نسخہ دیں کہ جنسی خواہشات ہمیشہ کے لئے اس کے اندر دم توڑ دے۔''

''آپ کا بیٹا مطلب میرا بیٹا۔ آپ کی عزّت میری عزّت۔ بالکل بے فکر رہیں سب ٹھیک ہو جائے گا

۔'' نوٹوں بھرا بیگ لیتے ہوئے ڈاکٹر نے اپنائیت کا ثبوت دیا۔

چھ ماہ تک وہ بیگم سے جھوٹ بول کر بیٹے کو دوا کھلاتے رہے۔ کورس مکمل ہونے کے بعد ایک بار وہ دلنشیں صفدر عرف راجا کو لے کر پھر شہر پہنچے۔ اُسے عامر رشیدی کے حوالے کیا۔ وہ اُسے لے کر ریڈ لائٹ ایریا پہنچے اور اُسی طوائف سے ملے۔ جب نتیجہ سامنے آیا تو مکھیا جی خوشی سے اُچھل پڑے۔

خوشیوں کے مدار پر زندگی اب پہلے سے تیز گھوم رہی تھی۔

شہر سے لوٹتے ہی مولانا جانشین حیدر یعنی مکھیا جی نے سب سے پہلے بیگم کو پسند کی مارکیٹنگ کروائی اور سونے کے زیوارات گفٹ کیے۔ بیگم سمجھنے سے قاصر تھی کہ اچانک اُن کے شوہر اُن پر اتنے مہربان کیوں ہیں؟ بن مانگے زہر نہیں ملتا تو مفت میں سوغات کون دیتا ہے؟

لیکن جب اُس رات بھی بیگم پہلو سے نکل گئی تو اُنہیں اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کا خوبصورت بہانہ مل گیا۔۔

''یہ ٹھیک ہے بیگم! کہ تمہاری صحت دن بہ دن خراب ہوتی جا رہی ہے۔ لیکن میں تو ابھی پوری طرح تندرست ہوں۔''

''میری صحت لوٹا دیں۔ ایسا حال تو آپ نے ہی کیا ہے نا جی......؟''

''بہانے مت بناؤ۔''

''جب صحت مند تھی تو چار چار بچے بھی دیئے ہیں میں نے۔''

''تم سمجھنے کی کوشش کرو۔''

''آپ بے صبرے ہوگئے ہیں۔ خود کو سمجھائیں۔''

''لیکن یہ عادت کس نے ڈلوائی؟ دیکھو اگر میں کہیں منہ مارنے لگوں تو کیا سمجھتی ہو صرف میری بدنامی ہوگی۔ تمہاری بھی ہوگی محترمہ! لوگ تھوکیں گے منہ پر کہ عورت ہو کر تم نے اب خوش کرنے کا ہنر کھو دیا ہے۔''

شوہر کی باتوں میں اُسے کچھ حد تک سچائی نظر آئی۔ جب اُس کے بھائی نے ایک دوسری عورت رکھ لی تھی تو اس کی ماں نے بھی ایسی ہی باتیں بھابی سے کہی تھیں.........پھر اُسے تو شادی سے پہلے ہی سکھایا گیا تھا کہ میاں کی کسی بات کا 'نہ' نہیں کرنا۔ کیوں کہ یہ انسانی فطرت ہے کہ پیٹ میں آگ لگے تو اندھیرے میں چوری کر کے بجھاتا ہے۔ پیٹ سے نیچے کی بھوک ہو تو دن میں بھی لوگ بے شرمی پر اُتر آتے ہیں۔ اگر ایسا ہوا تو اس بدنامی کو

سہنااس کے لئے مشکل ہوگا۔عجیب کشمکش میں وہ کچھ دیر مبتلا رہی۔

''اگر آپ نے ٹھان لی ہے تو سوتن لے آئیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔''

''لیکن تم تو جانتی ہو کہ اب تک گاؤں میں کسی نے نہ کسی کو طلاق دی ہے اور نہ ہی دوسری شادی کی ہے ۔شریعت اپنی جگہ......اور ویسے بھی میرے پاس کوئی بہانہ نہیں۔اگر گاؤں کا مکھیا ہوتے ہوئے میں یہ سب کچھ کروں تو بڑی بدنامی ہوگی۔رہی سہی ساکھ بھی جائے گی اور آنے والے دنوں میں ایم ایل اے کا ٹکٹ بھی۔

''تو ہفتے میں ایک دو بار کوٹھے پر چلے جایا کرو۔''

''نہیں!کسی نے دیکھ لیا تو جینا دوبھر ہو جائے گا۔''

''اور بغیر یہ سب کئے خواہشات کی تکمیل بھی تو ممکن نہیں۔''

''تم صرف ساتھ دو تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''ارے!اس سے زیادہ کوئی عورت اور کیا ساتھ دے سکتی ہے۔''

''دیکھو اپنا راجا نیم پاگل کے ساتھ ساتھ جنسی طور پر مفلوج بھی ہے۔''

''نہیں آپ غلط کہہ رہے ہیں۔ میں کئی بار اُسے دیکھ چکی ہوں۔وہ ہاتھ کا استعمال بخوبی جانتا ہے۔''

''محترمہ!پانچ چھ ماہ قبل مجھے بھی ایسا لگا تھا۔اور پھر میں نے فیصلہ کیا تھا کہ راجا کی شادی کر دوں گا۔ لیکن پہلے میں پوری طرح مطمئین ہونا چاہتا تھا۔اس لئے تم سے بہانہ کر کے اُسے شہر لے گیا۔''وہ کچھ دیر رُکا اور سچ اور جھوٹ کی آمیزش سے ایک نئی کہانی فوراً گڑھ لی۔''ڈاکٹر نے معائینہ کے بعد مشاہداتی تجربے کے طور پر نرس کو بغیر کپڑے کے اس کے پاس بھیج دیا۔اور دوسرے کمرے سے کمپیوٹر اسکرین پر سب کچھ دیکھتا رہا۔اُس نے تھوڑا بہت اُسے چھوا ضرور۔لیکن نرس کے لاکھ کوشش کے باوجود راجا کے اندر وہ سنسناہٹ پیدا نہیں ہوئی جو مردانگی کی علامت ہے۔''

''آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟''

''نیم پاگل اور جنسی مفلوج ہوتے ہوئے بھی ہم راجا کی شادی کریں گے۔''

''پاگل تو نہیں ہو گئے۔آپ ایک طرف خود کہہ رہے ہیں کہ وہ اس لائق نہیں ہے اور دوسری طرف شادی.......؟''بیگم نے اپنا سر پکڑ لیا۔

''تم سمجھنے کو کوشش کرو بیگم جانشین!میں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے۔اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ

تُمہیں بیٹھے بٹھائے گھر میں کام کرنے والی نوکرانی مل جائے گی۔ راجا کے ساتھ تمہاری ہاتھ پاؤں دبائے گی۔ اور ضرورت پڑنے پر میرا بھی خیال رکھے گی۔'' مسکراتے ہوئے۔'' پھر گھر کے چراغ کا وہ مسئلہ خود بخود حل ہو جائے گا۔'ہنگ لگے نہ پھٹکری، رنگ آئے چوکھا' والی بات۔ سمجھی بیگم بیمار!''

بیگم جانشین عجب کشمکش میں مُبتلا تھی۔ جہاں نہ وہ انکار کر سکتی تھی اور نہ ہی اقرار۔ انکار کی صورت میں سوار کو اپنے اوپر بٹھانا ہوتا اور اگر اقرار کرتی تو سوتن کو بہو کا نام دینا ہوتا۔ آخر کار اُس نے موت پر زندگی کو اولیت دی۔ مولانا جانشین حیدر نے بڑھ کر منہ چوم لیا۔

پھر تلاش شروع ہوئی گاؤں سے باہر ایک ایسی خوبصورت لڑکی کی جو نہایت غریب ہو، اور ساتھ میں یتیم ہو اور سیدھی سادھی بھی......اور پھر چند ہی روز میں ایک اٹھارہ انیس سال کی ایسی ہی لڑکی پسند کر لی گئی۔ بوڑھی نانی کے ساتھ رہتی تھی۔ اُسے دیکھتے ہی مکھیا کے منہ میں لعاب بننے لگا تھا۔ غربت کی وجہ سے بوڑھی نانی اکثر فکر مند رہتی تھی کہ شادی کیسے ہوگی؟ لیکن جب ایک مکھیا اپنی بہو کے لئے پسند کر لیا تو وہ جھومنے لگی تھی کہ لڑکا تھوڑا بہت پاگل ہے تو کیا ہوا راج تو یہی کرے گی۔ لیکن یہ بات اس نے اپنی نتنی سے اُس وقت چھپالی تھی۔

شادی دھوم دھام سے ہوئی۔

دونوں طرف کے اخراجات مکھیا نے ہی اُٹھائے۔

دن بھر عورتوں کا آنا جانا جاری رہا۔ سب کی سب دُلہن کی خوبصورتی کے قصیدے پڑھتے نہیں تھک رہی تھیں اور ساتھ ہی ساتھ پاگل کی قسمت پر رشک بھی کر رہی تھیں۔ اور کچھ دبی زبان میں دُلہن کی قسمت کو کوس رہی تھیں کہ اتنی خوبصورت لڑکی اور پلّے بندھی بھی تو ایک پاگل کے۔

سسرال میں ارمانوں بھری یہ پہلی رات تھی۔

سیج پھولوں کی خوشبوؤں سے عطر بیز تھا۔

مہمان جا چکے تھے۔

دُلہن ارمانوں سے بھری بیٹھی تھی۔ بیگم جانشین اپنی شادی کے دلچسپ قصّے سنا رہی تھی۔ وہیں پاس میں راجا عجیب وغریب حرکتیں کر رہا تھا۔ دُلہن اُس کی حرکتوں پر کبھی ہنس رہی تھی اور کبھی اُسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ روئے یا کیا کرے؟ لیکن اُسے ایک اطمینان تھا کہ ساس کی صورت میں اُسے 'ماں' مل گئی تھی۔ سسر کو اس نے پہلے سے دیکھ رکھا تھا۔ وہ بھی اچھے لگے تھے۔ ساس بہو میں کچھ ہنسی مذاق کی باتیں بھی ہو رہی تھیں کہ تبھی اسکرین روشن

ہوااورساس کے موبائل پرمس کال چمکنے لگی۔

''تمہارے سسُر کا فون ہے۔یاددلا رہے ہیں کہ راجا کے دوا کھانے کا وقت ہوگیا ہے۔''

بیگم جانشین نے شیلف میں رکھے میڈیسن باکس سے دوا نکالی۔گلاس میں پانی بھرااور بیٹے کے حلق میں اُتاردیا۔کچھ دیر بعد غنودگی سی طاری ہوگئی،اور راجا وہیں پلنگ پر ڈھیر ہوگیا۔ماں نے اُسے پکڑ کر سیدھا کیا۔سر کے نیچے تکیہ رکھا۔دُلہن حیرت زدہ یہ سب دیکھتی رہی۔بیگم جانشین کو سمجھتے دیر نہیں لگی۔وہ سمجھانے کے انداز میں دُلہن سے گویا ہوئی ''راجا کو ہر رات دس بجے دوا کھلانی پڑتی ہے۔دوا کے بغیر اُسے نیند نہیں آتی ہے۔ دماغ سے تھوڑا کمزور ہے۔کبھی کبھی پاگل پن کا دورہ بھی پڑتا ہے۔ایسے میں وہ کسی کے ساتھ کچھ بھی کرسکتا ہے۔ یہاں تک کہ گلا بھی دبا سکتا ہے۔ایک دو بار اس نے میرے ساتھ بھی ایسا کیا ہے۔بہنیں جب تک بیاہی نہیں گئی تھیں تب تک اس کی دیکھ بھال کرتی تھیں۔لیکن وہ سب رات میں کبھی اس کے کمرے میں نہیں گئیں۔دوا وہ ہمیشہ میرے ہاتھوں سے کھایا کرتا ہے۔لیکن اب تم آگئی ہو تو دو چار دنوں کے بعد خود سے کھلایا کرنا۔''

دُلہن اب ارمانوں کے سیج سے اُتر کر سوچ کی فرش پر بے چینی سے ٹہلنے لگی تھی.........

آج اُس کی پہلی رات ہے۔شوہر بھلے نیم پاگل ہی کیوں نہ ہو،اُسے جگا ہوا ہونا چاہئے۔پاگل پن ایک طرح سے دماغی خلفشار ہے لیکن ایسی رات کا تعلق دماغ سے کم جسم سے زیادہ ہوتا ہے۔لیکن جسم ہی سوجائے تو پھر سارا کھیل ختم........اُسے افسوس ہو رہا تھا کہ اگر اُسے پہلے سے معلوم ہوتا تو وہ نو بجے ہی سر درد کا بہانہ کر کے بستر پر لیٹ جاتی۔کم سے کم ایک گھنٹہ تو اُس کے حصّے میں آتا۔اُس ایک گھنٹے میں وہ دیکھتی کہ وہ کتنا پاگل ہے۔سہیلیوں نے کہا تھا مرد کا پاگل پن عورت کی قربت سے دور ہوجاتا ہے۔وہ آج یہ تجربہ بھی کر کے دیکھنا چاہتی تھی۔لیکن دیکھ نہیں پائی۔اس لئے آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔

بیگم جانشین نے اُس کی طرف دیکھا۔وہ اُس کی حالت سمجھ رہی تھی۔لیکن وہ کر کیا سکتی تھی۔مرد کے ہاتھ کی کٹھ پتلی جو تھی۔بولی........''تم راجا کو سونے دو۔صبح جب اُٹھے گا تو پھر اُس کے پاس آجانا۔ابھی تم میرے ساتھ نیچے چلو۔وہاں تمہارے سسُر انتظار کر رہے ہیں۔منہ دکھائی میں سونے کا ہار دینے والے ہیں۔لاکھوں کا ہے۔کہہ رہے تھے کہ دُلہنیا کو صبح ہوتے ہی گھر کی چابھی تھما دینا۔کل سے وہی اس گھر کی مالکن ہوگی......''پھر کچھ رُک کر اُس کے خوبصورت سراپے کا جائزہ لیتے ہوئے۔''میں بیمار رہتی ہوں دُلہن۔اب مجھ سے کام نہیں ہوتا۔گھر کا سارا کام تمہیں ہی سنبھالنا پڑے گا۔میرے اور راجا کی تو کوئی بات نہیں۔تمہیں سب سے زیادہ مکھیا جی یعنی سسر

صاحب کا خیال رکھنا ہے۔ بہت ضدّی ہیں وہ۔ نہیں سننے کی اُنہیں عادت نہیں ہے۔ گاؤں میں کوئی اُن کے سامنے منہ کھولنے کی ہمّت نہیں کرتا۔ تم خوش نصیب ہو جو تمہیں ایسا سسر ملا ہے۔ اگر کچھ کہیں تو انکار نہیں کرنا۔ سر پر بٹھا کر رکھیں گے وہ تمہیں۔ سمجھی دُلہنیا.......!''

اور پھر سمجھا بُجھا کر وہ اُسے اپنے ساتھ اوپری منزل سے نیچے لے آئی، جہاں پلنگ پر مکھیا جی پاؤں پسارے بیٹھے تھے۔ شیروانی ویسی ہی پہن رکھی تھی جیسی راجا نے پہنی تھی۔ کمرے میں بہو کا ہاتھ پکڑ کر داخل ہوتے ہی بولی۔

''چلیئے منہ دکھائی نکالیئے۔'' چہرے سے سرخ گھونگھٹ پلٹتے ہوئے۔ ''چاند ہے میری بہو۔''

مولانا جانشین حیدر نے تکیہ کے بغل میں رکھے لال رنگ کے مخملی ڈبّے پر پہلے ہاتھ پھیرا۔ ہتھیلی میں مخملی احساس جاگزیں ہوتے ہی پورے بدن میں مخملی لہر سی دوڑ گئی۔ پھر مخملی نظروں سے اُس کی طرف دیکھا۔ اور پھر سونے کا چمچماتا ہار نکال کر اُس کی طرف بڑھے۔ دُلہن تھوڑی شرمائی پھر اپنی گردن سامنے کی طرف جھکا دی۔ ہار پہنانے میں مکھیا جی نے جہاں اُس کی گردن کے بہانے گال کو چھوا وہیں دونوں سرے پر بنے ایس نُما ہُک کو لگاتے وقت اُس کی پیٹھ کا مخملی لمس بھی حاصل کیا۔ دُلہن کے اندر سہرن سی پیدا ہوئی۔ اُسے سسر کا اس طرح سے ہار پہنانا اچھا نہیں لگا تھا۔ لیکن کسی طرح کا کوئی تاثر چہرے پر نہیں لائی۔ سوچی شاید بے خیالی میں ایسا ہو گیا ہوگا۔

پھر بیگم جانشین نے پیار سے دُلہن کا ہاتھ پکڑا اور پلنگ پر بٹھا دیا۔

''بہورانی! یہ یاد رہے کہ تمہاری ضرورت کا سارا خیال تُمہارے سُسر جی رکھیں گے۔ اُن کے ہوتے ہوئے تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ کیوں مکھیا جی!'' بیگم جانشین نے 'کیوں' پر زور دیتے ہوئے کہا۔

اور مکھیا جی نے دُلہن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے مسکرا کر حامی بھری۔

جس انداز میں انہوں نے یہ سب کیا، اُسے دیکھ کر دُلہن حیران تھی۔ لیکن کچھ ہی ثانیے بعد حیرانی کچھ اور بڑھ گئی جب ساس نے بلائیں لیتے ہوئے کہا تھا۔ ''تمہارے سُسر صاحب کو سونے سے پہلے پاؤں دبوانے کی عادت ہے۔ آج میں تھکی ہوئی ہوں.......تم آ گئی ہو تو اس کام کی شروعات آج سے ہی کر لو، کل سے تو تمہیں پورا گھر سنبھالنا ہے۔''

بیگم جانشین کے اتنا کہتے ہی مکھیا جی نے اپنے پاؤں پسار دیئے۔ دُلہن کو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے۔ لیکن ساس کا حکم تھا۔ ٹال نہیں سکتی تھی۔ پھر پہلے ہی اُسے بتا دیا گیا تھا کہ سسر صاحب کو نہ سُننے کے

عادت نہیں ہے۔ انکار کی صورت میں غریبی کی دلدل اور بوڑھی نانی سامنے تھی۔ وہ کچھ سوچتی ہوئی آگے بڑھی۔ جھجکی اور پھر آہستہ آہستہ پاؤں دبانے لگی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے باپ کا چہرہ آگیا تھا۔ وہ مسکرانے لگی تھی۔

لیکن اُس وقت مولانا جانشین حیدر کے اندر لڈو پھوٹنے لگے تھے۔ اُنہیں لگا کہ لاکھوں کا ہار کام آگیا ہے۔ اس لئے اُنہوں نے آنکھوں ہی آنکھوں سے بیوی کو اشارہ کیا تا کہ وہ راجا کی حقیقت آشکار کر دے اور اُن کا کام آسان ہو جائے۔

بیگم جانشین نے ایک نظر گھڑی پر ڈالی۔ پھر جماہی لی۔ جیسے تھکے جسم کی شاخوں پر نیند کا پرندہ بیٹھنے والا ہو۔ بھاری پلکوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دُلہن کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ پھر سہلاتے ہوئے بولی۔

''بہو تم تو جانتی ہو کہ خاندان مردوں سے چلتا ہے۔ میری صحت ایسی نہیں کہ اس گھر کو دوسرا وارث دے سکوں۔ رہی بات راجا کی تو وہ اُس لائق نہیں......' کہتے کہتے بیگم جانشین کی سانسیں تیز تیز چلنے لگی تھیں۔ وہ کچھ ثانیے کے لئے رُکی اور پھر ایک لمبی سانس چھوڑتے ہوئے بولی۔ ''اب اس گھر کی عزّت تمہارے ہاتھ میں ہے۔ کل ہو کر تمہیں ہی سارا سکھ بھوگنا ہے۔ یہ ساری دولت یہ ساری جائداد تمہاری ہونے والی ہے۔ میرا کیا ہے آج ہوں کل نا رہوں۔ اس لئے اس بیمار ساس کی التجا ہے کہ جس طرح سے بھی ہو سکے اس گھر کو ایک وارث دے دو......'' پھر رُخ بدل کر۔ ''کیوں مکھیا جی! میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا؟''

''ہاں دُلہن! صرف ایک بچّہ۔'' مکھیا جی نے ملتجی نگاہوں سے دیکھا۔

''بچّہ!'' دُلہن کے منہ سے اس طرح بے اختیار نکلا جیسے یہ بھی کوئی بات ہوئی۔

''ہاں بچہ!'' دونوں کے منہ سے یکبارگی نکلا۔

پھر بیگم جانشین نے حوصلہ بڑھانے کے انداز میں اُس کی پیٹھ تھپتھپائی اور جب مثبت ردِ عمل سامنے دکھائی دینے لگا تب وہ باہر جانے کے لئے تیزی سے مڑی۔ مولانا جانشین حیدر عرف مکھیا جی عین اُسی وقت ہاتھ پکڑ کر پیار سے قریب کرنے والے تھے۔ بازوؤں میں بھر کر محبّت لُٹانے والے تھے کہ تبھی نئی نویلی دُلہن خوشی سے پاگل ہوگئی۔ جھومنے لگی اور جھومتے جھومتے خود بخود مکھیا کی بانہوں میں چلی آئی۔ پہلے اِٹھلائی۔ پھر سینہ اور کمر کے درمیان ہاتھ رکھتے ہوئے مسکرائی اور بولی۔

''اب آپ لوگ پریشان نہ ہوں۔ میں اپنے گھر کا چراغ ساتھ لائی ہوں۔''

پھر وہ تیزی سے اُوپری منزل کی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

سوراخ

ڈاکٹر ولاء جمال العسیلی (قاہرہ۔مصر)

آج پھر سنیچر ہے۔۔کتنا مشکل دن ہوتا ہے یہ۔اس دن مجھے
چھ بجے صبح کو جلدی اٹھنا پڑتا ہے۔اپنے شوہراور بچوں کے لئے ناشتہ تیار کرنا پڑتا ہے،اس کے بعد یہ فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ لیسنز جانے کے لئے بچے کیا پہنیں،دوپہر کے کھانے میں کیا کھائیں،اوراسی طرح سے دن کے دوران درجنوں فیصلہ کرنے پڑتے ہیں۔میں بھی اوروں کی طرح اپنے بچوں کے لئے بہت فکرمند رہتی ہوں، خاص طور پر جب وہ اس دن ٹیوشن کے لیے زیادہ وقت گھر سے باہر گزارتے ہیں۔دن بھر میرے دل ودماغ کوسکون نہیں ملتا،جب تک کہ میرے سب بچے گھر واپس نہیں آجاتے ہیں۔پریشانی کے ساتھ ساتھ میرے کاندھے پر گھر کا پورا کام کاج سنبھالنے کا بوجھ دوگنا ہوجاتا ہے۔اگر سچ کہوں تو سانس لینے کی فرصت نہیں ہوتی ،جس کی وجہ سے میرا مزاج بھی چڑچڑا ہوجاتا ہے۔

پانچ بجے شام کے وقت میں کپڑے تہہ کررہی تھی کہ دروازے کی گھنٹی بجی۔میں دستک سن کر دروازہ کھولنے کے لئے بھاگی۔میری یہ عادت ہے کہ دروازہ کھولنے سے پہلے دوربینی سوراخ سے دروازے پر کھڑے ہوئے شخص کو دیکھتی ہوں،تاکہ جان سکوں کہ کون ہے۔حسب معمول میں نے سوراخ سے جھانک کر دیکھا تو میری منجھلی بیٹی دروازے پر کھڑی تھی اوراس کے پیچھے کچھ فاصلے پر ایک مرداورایک کم سن لڑکی سیڑھیاں چڑھ رہے تھے۔میں نے جلدی سے دروازے کوکھول کر اپنی بیٹی کو اندرداخل کیا اورفوراً دروازہ بند کردیا۔دروازہ کھولتے وقت دونوں اجنبیوں نے جب مجھے دیکھا تو اس مرد نے لڑکی سے کہا کہ' لگتا ہے غلطی ہوگئی ہے شاید، یہ وہ فلیٹ نہیں ہے جو ہم چاہتے تھے'۔پھر دونوں سیڑھیاں اترنے لگے۔

لڑکی خوبصورت تھی اورتقریباً پندرہ سولہ سال کی لگ رہی تھی۔جبکہ مرد کی عمر تقریباً تیس پینتیس سال کی رہی ہوگی۔پتہ نہیں کیوں مجھ میں تجسس پیدا ہوا،اس لئے میں نے پھر سے دوربینی سوراخ سے جھانکنا شروع کیا۔

اچانک ہی میں نے دونوں کو چپکے چپکے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے دیکھا۔اور چونکہ میرا فلیٹ عمارت کی آخری منزل پر ہے،اس لئے دونوں چھت پر چلے گئے۔دوربینی سوراخ سے جھانکتے ہوئے میں انتظار کررہی تھی کہ دونوں جلد ہی نیچے اتریں گے، کیونکہ اوپر کوئی اور فلیٹ نہیں تھالیکن ایسا نہیں ہوا۔جس سے میرا تجسس اور خوف مزید بڑھ گیا۔ میں تقریباً دس پندرہ منٹ انتظار کرتی رہی،اس درمیان میں نے عمارت کے چوکیدار کواور اس کے ساتھ چار لوگوں کو سیڑھیاں چڑھتے ہوئے دیکھا۔ان لوگوں میں ایک آدمی اپنے ہاتھ میں ایک بڑی سی چھڑی پکڑے ہوئے تھا۔ سب عمارت کی چھت کی طرف جارہے تھے۔اس وقت میں کافی پریشان تھی، میرا ذہن کام نہیں کررہا تھا،سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ کیا ہورہا ہے!!۔

میری آنکھیں اب بھی دروازے کے دوربینی سوراخ سے لگی ہوئی تھیں۔ایک لمحے کے لئے بھی میری آنکھیں نہیں جھپکیں۔ مجھے ڈر تھا کہ کوئی انہونی نہ ہو جائے اور میں اس سے ناواقف رہوں، خاص طور پر اس لئے کیونکہ میری بڑی بیٹی ابھی تک گھر سے باہر تھی۔اوراس کے آنے کے دوران کہیں عمارت کی سیڑھیوں پر کوئی حادثہ نہ ہو جائے، یا کچھ ہو نہ جائے اور کہیں وہ لوگ مجھ پر اور میرے بچوں پر حملہ نہ کردیں اور کہیں دروازہ نہ توڑ دیں۔ میں اسی سوچ میں اتنی الجھی ہوئی تھی کہ اچانک میں نے عمارت کے چوکیدار کو سیڑھیاں اترتے اور چیختے ہوئے سنا:

''اے حرام زادے! مجھے تم دونوں پر پہلے ہی شک ہوا تھا جب میں نے تم دونوں کو دیکھا تھا کہ ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے ہوئے عمارت کی طرف جارہے ہو۔ان دنوں ہر جگہ پر آوارہ نوجوانوں کی تعداد کافی بڑھ گئی ہے۔ روزتم جیسوں کو دیکھتا ہوں،اے کمینے !تم دونوں کو عمارت کی چھت کے سوا کوئی اور جگہ نہیں ملی، کہ تم اپنی جنسی ہوس کی آگ بجھا سکو!! بدمعاش!!''۔

چوکیدار کی بات سن کر میں اپنا توازن کھونے لگی۔ میرا دل زور سے دھڑکنے لگا۔ میرے ہونٹ خشک ہو گئے ، سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں !صرف یہ جملہ دہرانے لگی: 'رحم کر میرے رب۔۔۔'۔

میں دروازے کے دوربینی سوراخ سے سارا منظر دیکھ رہی تھی ،ایک مرد لڑکی کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھااور لوگ ان دونوں کو الگ کرنے کی کوشش کررہے تھے۔انہوں نے لڑکی کا دوسرا ہاتھ پکڑ کے اسے کھینچنا شروع کردیا۔لڑکی درد سے کراہ رہی تھی۔تھوڑی دیر کی کوششوں کے بعد وہ لوگ لڑکی کواس سے الگ کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ان میں سے کسی نے لڑکی سے کہا: ''اپنے گھر جاؤ! یہاں سے بھاگ جاؤ!''

لیکن عجیب بات یہ ہے کہ لڑکی اپنی جگہ سے نہیں ہلی۔ بلکہ وہ کہہ رہی تھی کہ ''اسے بھی چھوڑ دیں، میں

اس کے ساتھ کسی اور جگہ پر نہیں جاؤں گی، قسم سے سیدھے اپنے گھر جاؤں گی' لیکن لوگوں نے اس کی بات نہ سنی، بلکہ اسے نیچے جانے کے لئے دھکا دیتے رہے۔ لڑکی نے کئی بار ان لوگوں سے التجا کی، لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ آخر کار وہ نیچے اتر گئی۔

لڑکی کے جانے کے بعد لوگوں نے اس مرد کی جم کر پٹائی کی، خوب مارا۔ پھر اسے اپنے ساتھ لے کر نیچے چلے گئے۔ میں بھاگ کر جلدی سے بالکونی کی طرف گئی۔ باہر جھانک کر دیکھا کہ سڑک پر چوکیدار لڑکی کو اپنے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اپنے قریب لا رہا تھا لیکن لڑکی نے اس کو جھٹک دیا اور ایک رکشہ پر سوار ہو کر چلی گئی۔ اس منظر کو دیکھ کر میں کافی الجھن میں آ گئی۔ میری حیرت کی انتہا نہیں رہی!!!

تھوڑی دیر بعد، باقی لوگ سڑک پر نمودار ہو گئے اور وہ پٹائی کرنے کے بعد مرد کو ایک گاڑی میں بٹھا کر لے گئے، چلے گئے۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کہاں گئے؟! مجھے محسوس ہوا کہ شاید قریبی پولیس اسٹیشن اسے لے جائیں گے!!

میں پورے منظر کو دیکھ کر کافی پریشان ہوئی اور اس بارے میں سوچنے کی مزید ہمت نہیں کر سکی۔ اس واقعہ کے بعد میرے ذہن میں کئی سوال الجھن پیدا کر رہے تھے۔ کیوں اس مرد نے لڑکی کا ہاتھ اس قدر مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا!! کیا وہ آدمی واقعی اس لڑکی سے پیار کرتا تھا!! اسے اس کی فکر تھی!! یا وہ چاہتا تھا کہ لڑکی اس کے ساتھ رہے، تا کہ وہ اپنے آپ کو لوگوں سے بچائے، خاص طور پر لڑکی کے ساتھ لوگوں کی ہمدردی دیکھنے کے بعد!!۔

گھر کے کام کاج میں مصروف رہنے کے ساتھ ساتھ، آج کل کے ناجائز جنسی تعلقات کی اصل وجہ کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ کیا یہ موبائل کی وجہ سے ہوتا ہے! جو اس دور میں ہم سب کے پاس دستیاب ہے اور یہ ہماری بدقسمتی اور پریشانیاں لے کر آیا ہے۔ رات ڈھلتے ہی عورت اور مرد میٹھی میٹھی باتیں کرنے لگتے ہیں۔ پھر دھیرے دھیرے ان کی ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ جہاں تک ملاقات کی جگہ اور وقت کا تعلق ہے .. تو ان کی پسندیدہ جگہ ریستوراں اور کیفے ہوتے ہیں، جہاں وہ اپنی ملاقات کی خواہش پوری کر لیں اور اپنی ہوس کی آگ کو کچھ پل کے لیے بجھا دیں۔ اور اس طرح وہ کچھ دیر کے لیے اپنے آپ کو بھول جاتے ہیں۔۔۔ وہ یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ خدا ان کو دیکھ رہا ہے، گویا وہ خدا کی موجودگی کو محسوس نہیں کرتے!!!

رات ڈھل چکی۔۔۔اوہ کتنا مشکل دن تھا!! تھکاوٹ کی وجہ سے سینچر کو حسب معمول سب سو گئے۔ اور میں نے اپنا تھکا ہوا جسم بستر پر پھینک دیا، اپنی آنکھیں بند کر لیں مگر مجھے نیند نہیں آئی، میری آنکھ کافی دیر تک کھلی

رہی۔آج جو کچھ ہوا اس سے مجھے رات کو خوفناک بھوتوں اور ڈراؤنے خوابوں میں بدل دیا ہے، جس سے میں اپنی آنکھیں بند کرنا شروع کردی تو مجھے گھیر لیتے ہیں۔

آج کے واقعہ نے میرا ذہنی سکون چھین لیا۔میرے ذہن میں یہ سوالات اٹھ رہے تھےکہ کیوں لوگوں نے صرف اس مرد کو سزا دی۔شاید اس لئے کیوں کہ وہ عمر دراز تھا اور لڑکی سے بڑا لگ رہا تھا!! یا اس مرد کے پاس لڑکیوں کو دھوکہ دینے کے سوا کچھ بھی نہیں ہے؟!۔کیا وہ ان مردوں کی طرح انہیں اپنی میٹھی میٹھی باتوں اور جھوٹے وعدوں سے دھوکہ دیتا ہے اور اگر اسے اپنی مرضی کی چیز مل جائے تو وہ دوسری لڑکی کی تلاش میں لگ جاتا ہے اور اس طرح وہ مذہب اور حیا سے باز نہیں آتا۔وہ ایک وحشی درندے کی مانند ہے، جو اپنی بھوک مٹانے کے لیے اپنے شکار کی تلاش میں صحرا میں بھٹکتا رہتا ہے؟ اس کے ایک اشارے اور دھوکے میں لڑکی اس کے جال میں آجاتی ہیاور وہ اپنا فون نمبر اس لڑکی کی طرف پھینک دیتا ہے، وہ اسے کال کرتا ہے اور اس سے اپنی خواہش کا اظہار کرتا ہے اور اس سے اپنی محبت اور پیار کا اظہار کرتا ہے۔ اپنی میٹھی باتیں اسے سنانے لگتا ہے، جن سے لڑکی محبت اور جذبے کی دنیا میں تیرنے لگتی ہے۔وہ اپنے فریب سے لڑکی کے دل پر قبضہ کر لیتا ہے، یہ کہ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اسے چھوڑ نہیں سکے گا، کیونکہ وہ اس کے لیے ہوا کی طرح ہے، اگر وہ اس سے جدا ہو جائے، وہ مرے گا!! اور چونکہ لڑکی بھولی ہے اور اس محبت میں دھوکہ کھا جاتی ہے تو وہ اس پر مسحور ہو جاتی ہے، وہ اس سے بہت لگاؤ محسوس کرتی ہے اور اس سے الگ نہیں ہو سکتی۔جس پر وہ یقین رکھتی ہے اور خواہشات کا تبادلہ کرتی ہے، اور جب اس بدکار کو لگتا ہے کہ لڑکی پک گئی ہے اور توڑنے کے لیے تیار ہو گئی، تو وہ اسے نگل جاتا ہے جیسا کہ وہ دوسری لڑکیوں کے ساتھ کیا کرتا ہے؟؟؟

میں بھی اس لڑکی کے بارے میں سوچ رہی تھی، جس کے پتے کھلے، جوانی پھولی، وہ غافل ہو کر پرہیزگاری کی باڑ کو بھلا چکی تھی، اس لیے خواہش کی جھیل میں تیر گئی اور نہ جانے اس پر کیا گزرے گی۔وہ آزادی کے ساتھ زندگی گزارتی ہے، بغیر کسی پابندی یا نگرانی کے، اور والدین کی طرف سے اعتماد کی باڑ اسے نتائج کی قدر کیے بغیر کسی بھی نام نہاد بوائے فرینڈ کو لینے پر مجبور کر سکتی ہے، اور شیطان آزادی اور خود اعتمادی کی باڑ سے ٹکرا جاتا ہے۔اور یہ کہ یہ معمول کی بات ہے، لڑکی دوڑتی ہے اور پھر ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے اور کال آتی ہے، وہ اس کے پاس جاتی ہے اور جہاں چاہے جاتی ہے، اور والدین کو کچھ نہیں معلوم، کیونکہ وہ ان سے جھوٹ بولتی ہے!!!!
میں بستر سے اٹھ کر اپنی بیٹیوں کے کمرے میں چلی گئی۔وہ سب نیند میں ڈوبی ہوئی تھیں۔میرے اندر کی کشمکش کے

بارے میں کچھ نہیں جانتی تھیں۔۔ میں سوچ رہی تھی کہ میں اس زمانے میں خودکو اور اپنی بیٹیوں کو کیسے محفوظ رکھ سکوں گی؟!!! اس دنیا میں کیسے انہیں احمقانہ کاموں سے بچا سکوں گی؟!

سماج میں جو بدعنوانی پھیلی ہے اس کا ذمہ دار کون ہے؟! کیا اب اس جنسی بے راہ روی کے طوفان کو روک پانا ممکن نہیں؟!

اگر چوکیدار کو کوئی رشوت دے دیتی ہے تو وہ خاموش رہے گا اور غلط کام چلتا رہتا ہے؟!

کیا معاملہ صرف مار پیٹ سے حل ہونے والا ہے؟!

اب میں بدلتی ہوئی دنیا کو زیادہ گہرائی سے دیکھ رہی ہوں۔ میں نے آج اپنی آنکھوں سے عفت کی راہ سے انحراف کی قیمت دیکھی ہے۔ فضول اور تماشا کا نتیجہ بھی دیکھا ہے۔ اور مجھے لگتا ہے کہ دروازہ کا سوراخ روز بروز بڑا ہوتا جارہا ہے۔

نظم ______________________ ڈاکٹر شعیب نظام

آج کی رامائن

عصر کہن سے عہد رواں تک
سر حد حق سے وہم وگماں تک
من کے روپہلے سے پردے پر
کھیل مسلسل جاری ہے
ہم دیکھ رہے ہیں اس پردے پر
رام بھی ہیں اور راون بھی
لکشمن بھی اور سیتا بھی
میگھ ناتھ کی سینا بھی ہے
گدا لئے ہنومان کھڑے ہیں
جنگ مسلسل جاری ہے
اور ہم صرف تماشائی ہیں
ایک تماشہ دیکھ رہے ہیں
رام سے ہم کو ہمدردی ہے
لیکن راون جیت رہا ہے
رام کی سیتا بے بس سی ہے
میگھ ناتھ کے تیر سے گھائل
رن میں لکشمن تڑپ رہے ہیں
پون پتر سنجیونی لیکر
اب کیا واپس آپائیں گے
ایک فریبی کے ہونٹوں سے
رام نام کا نغمہ سن کر
سفر کا مقصد بھول گئے ہیں
راون کی ہنکار کے آگے
بانر سینا بھاگ رہی ہے
رام کی عظمت سے بھی زیادہ
موت کی عظمت جاگ رہی ہے
لیکن ہم شرمندہ کیوں ہوں
ہم تو صرف تماشائی ہیں
اور تماشہ دیکھ رہے ہیں

عید

عید کے ہنگام پر
اپنا بچپن یاد آتا ہے مجھے
پیاری پیاری بے ریا، بے لوث باتیں
سچی سچی مسکراہٹ
پیار کی خوشبو کے پیچھے
بے تحاشا بھاگنا
اک شرارت بے وجہ سی
خواہشیں معصوم سی کچھ
اور بہت کچھ
ساری خوشیاں
سب امنگیں
راستے میں رہ گئیں
عمر کی رفتار اتنی تیز تھی
سوچتا ہوں، عید کے ہنگام پر
کیا مرے جذبات میں اب اتنی طغیانی نہیں
یا ہلالِ عید میں پہلی سی تابانی نہیں
کیا خوشی کے لمس کو محسوس کرنے کا ہنر
کھو چکے ہیں ہاتھ میرے

عید کے ہنگام پر
اپنے اندر جھانک کر میں دیر تک دیکھا کیا
نفرتوں کا ایک جنگل
مصلحت کا ایک صحرا
گھپ اندھیرا
دور تک گہرا اندھیرا
کیا یہی اندھا سفر اب عمر کا حاصل رہے گا
عید کے ہنگام پر
سوچتا رہتا ہوں میں
ایسا بھی کوئی چاند نکلے
ایسی بھی کوئی عید ہو جو
سب کدورت
ساری نفرت دور کر دے
روح کو مسرور کر دے
اور دلوں میں نور بھر دے
عید کے ہنگام پر
سوچتا رہتا ہوں میں

کشمشی شال

(امّی کی تیسری برسی پر کہی گئی نظم)

ابھی پچھلے برس کے تہہ شدہ
کپڑوں کی الماری نہیں کھولی
ابھی سورج
ذرا دَکھن کی جانب اور سر کے گا
ابھی سرسوں کے پودے
سر اٹھا کے دھوپ سینکیں گے
ہوا کچھ سرد ہولے اور
تپش کرنوں کی مدھم ہو
تو پٹ کھولوں گی
اور اوپر کے خانے میں رکھی
اس کشمشی
برسوں پرانی شال میں
خود کو سمیٹوں گی
کوئی خوشبو پرانی
چوم کر ماتھا
گلے سے آ لگے گی
بدن میں کچھ حرارت آ ہی جائے گی
لگے گا جیسے تیری گود
مجھ کو پھر میسر ہو گئی ہے۔۔!

ذرا سی دیر ساحل پر

ابھی کچھ وقت ہے
کہ اس سے پہلے
زمینیں دلدلی ہو جائیں
سمندر ریت اگلیں
شفق ملبوس شامیں خون تھوکیں
شبوں کی جگمگاہٹ
بجھتے انگاروں میں ڈھل جائیں
تم اپنا ہاتھ دو جاناں
ذرا سی دیر ساحل پر
ہوائے نم کے جھونکوں میں
تمہارا ہاتھ تھامے رقص کرنا چاہتی ہوں۔۔۔۔!

نظمیں ______________ کہکشاں تبسم

زندگی

زندگی تو سلگتی ہوئی ریت پر اک مسلسل سفر
سر پہ تپتا ہوا لال سورج لئے
دائیں بائیں دہکتی ہوئی
گرم وحشی ہوا کا چٹختا بدن
اور لبوں پر اٹھائے ہوئے
تشنگی کا گراں بار کرب
ان گنت خواہشوں کے لہو کا
زباں پر عجب ذائقہ
نگاہوں کی جلتی ہوئی سطح پر
چند بے نام خوابوں کے پگھلے ہوئے
گرم سیال پیکر رواں
زندگی مدتوں سے یوں ہی گامزن
آگے پھیلا ہوا بے کراں دشت ہے
پیچھے اپنے ہی قدموں کے جھلسے ہوئے
پھوٹ پڑتے ہوئے
آبلوں کے بلکتے نشاں
کوئی آغاز ہی خوشنما
اور نہ انجام پیشِ نظر
زندگی تو سلگتی ہوئی ریت پر اک مسلسل سفر۔۔۔!

شترمرغی تماشے

تماشے خوب ہیں یہ
دعاؤں کی چمکتی جھنڈیوں سے
فصیلیں اور محرابیں سجائیں
پرانے مخملی جزدان میں لپٹا صحیفہ
طاقِ نسیاں سے اتاریں
یا مصلوں پر
کئی نفلوں کی نیت کر کے بیٹھیں
یا کوئی تعویز اونچی شاخ میں ٹانگیں
یا کوئی آیت بھرا پرچم
چھتوں پر ایستادہ کر کے خوش ہو لیں
کنارے بستیوں کے
اذاں کی گونج سے باندھیں
یا کوئی تقریری مجلس
جو لہو کو گرم کرتی ہو
یہ سب کے سب
نٹھلوں کے شترمرغی تماشے ہیں
ہمارے ہوش کے ناخون تو ٹوٹے ہوئے ہیں
اور بلائیں
بستیوں میں بلبلاتی پھر رہی ہیں !

ٹیکسی

بچپن کی پگڈنڈی پر
ماں، کی انگلی کیا چھوٹی
میرے کچے تن کی
خوشبو مجھ سے روٹھ گئی
اس دن سے میں آج تلک
بے حس و ناداری کے عالم میں
جسم فروشی پر آمادہ ہوں
پھر بھی اک امید مرے احساس میں اکثر
دوڑتی ہے
کوئی جیالا اک دن آ کر
رحم مرے اوپر کھائے گا
ٹیکسی، کہنے والی آوازوں پر
ضرب لگائے گا

پھر وہی خواب

پھر وہی خواب عطا کر
مری آنکھوں کو خدا
جس میں لپٹا ہوا بیٹھا تھا
میں، ماں سے اپنی
اور ماں کے وہی انداز
محبت والے
میری بے چین سی راتوں کے
سکوں کی خاطر
اپنی ہستی کو مٹانے پہ تلے رہتے تھے
آج ماں تو نہیں لیکن یا رب
میری بے چین سی راتوں میں کبھی
ایسے خوابوں کا نظارہ رکھ دے
جس میں ماں چوم رہی ہو
مجھے آغوش میں بھر کر اپنی

کسک

طوائف کے غموں سے آشنا ہوتے ہوئے بھی
طوائف کے دکھوں پر جن کی آنکھوں میں
کبھی آنسو نہیں آتے/ طوائف کی جو عزت کے
کبھی خواہاں نہیں ہوتے/ وہی جب اہلِ زر
تاریکیاں چہروں پہ باندھے
کسی کوٹھے پہ جاتے ہیں
دکھوں سے پرُ لب و رخسار کی توصیف کو
مذہب سمجھتے ہیں
تڑپتی روح سے نظریں چرا کر
بدن کی لذتوں میں ڈوب کر/ یہ بھول جاتے ہیں
طوائف کے شگفتہ خوبصورت جسم کے اندر
جو زخمی روح بستی ہے
وہ سچے پیار کا احساس پانے کو
ترستی ہے......!

سید انجم رومان (آسنسول)

موبائل : 9832242047

کول فیلڈ

نگاہ کی وسعتوں میں بکھرا
سیاہ مٹی کا دور تک اک دبیز منظر
اور اس پہ دھبیلو کے ہر سو
یہاں پہ رقصاں مہیب سائے ہیں مافیا کے
غبارِ رہ میں نہائے بچے
ہیں بھوک سے کچھ بجھے بجھے سے
کہ چشمِ مادر میں خشک آنسو کہیں بھرا ہے
نشے کی لت میں ہے مست غربت
کہیں چتاؤں کے تند شعلے
یہ پوچھتے ہیں
کہ کب تلک ہونگے دفن زندہ
جو مفلسی کے ہیں مارے انساں
وہاں سے آگے
ذرا سے ہٹ کر
سیاہ ہیروں کی منتیں ہیں
یہ رونقیں ساری زندگی کی
کہ چشمِ دلبر میں غرق کوئی
تو گیسوئے خم میں گم ہے کوئی
وگرنہ کوئی
لبوں کی شبنم ہی پی رہا ہے
نئی روش کی نئی ہوا میں
ہر ایک بندہ ہے اپنی دھن میں
یہاں ہی ہم کے ہیں فسانے
کھنکتے ساغر میں خونِ بسمل یہاں بھرا ہے
ہے شہر روشن مسرتوں سے
نظامِ ظلمت ابھی ہے باقی
ہے آسماں پر اڑان سب کی
زمیں کی کس کو یہاں خبر ہے؟

لفظوں کی موت

فکرِ فردا کی انگیٹھی میں جلا امروز جب
برگِ گل شاخِ تمنا کے ہوئے جب زرد کچھ
یاس کی حدّت سے آبِ چشم جب کافور تھا
دیر تک الفاظ ہونٹوں سے مدد مانگا کئے
پھر خموشی کے خلا میں جا کے وہ بھی گم ہوئے

عادت

دل میں ایک مقتل چھپائے
تشنگی لب پر جگائے
آنکھ میں بے نور افسانے بسائے
خوں میں لتھڑی انگلیوں سے
ایک کالے کینوس پر
میں نے پھر سورج اگایا

نظمیں ____________ احمد نثار

موبائل : 8409242211

لیلائے عشق ہے زندگی

زندگی کھیل نہیں
صحرا کا طواف ہے یارو
آبلہ پا ہو اگر
مہلت نہیں دم لینے کی
گرم ریت پہ
چلتے چلتے
تم جو ٹھہر جاؤ گے
تو مر جاؤ گے
ہے اگر جینے کی خواہش
تو ایسا کرلو
نام لیلیٰ کا لکھو سینے پر
ورد اس نام کا کرتے جاؤ
عشق صحرا کو بھی گلزار بنا دیتا ہے
عشق پتھر پہ بھی اشجار اُگا دیتا ہے

گلاب رُت

سرمئی شام کے آنچل میں
اجلے اجلے پھول
اور ترے ماتھے پر
روشنی کی دھول
صدیوں میں سمٹے یہ حسین لمحے
چائے کی پیالیوں کی کھنک
یہ فضائیں یہ دھنک
ریت پر
چلتی پھرتی لڑکیاں
ڈابھ، لاجنس، ٹافیاں
پارکوں کی چہل پہل
دو منٹ میں غالباً
سب کچھ اوجھل ہو جائے گا
یہ شہر پھر جنگل ہو جائے گا

نظمیں ______________ احمد نثار

موبائل : 8409242211

ایک نظم

میری چلتی ہوئی زبان
رمتا جوگی ہے
تم دانے ڈالو یا کرو دیوار کھڑی
میں تم سے رحم کی زندگی نہیں مانگونگا
یہ لفظ لفظ جملے
میرے کاغذی لشکر ہیں
تم آگ لگاؤ یا سمندر رالٹ دو
میں تم سے رحم کی زندگی نہیں مانگونگا
لیکن تم بھول چکے ہو کہ
تمہاری ہی ذات کی تہہ میں
روشن ہے
اک سیاہ حاشیہ
تم اپنی پہچان جکڑ لو
ان مضبوط اندھیروں میں
کیونکہ
اسکی ولادت کا دن
قریب آ چکا ہے

ایک نظم

میں ایک شخص
ذہن کشادہ میرا
شعور میں سمٹے
کئی درد کے صحرا
جنوں میں
لہو میں
آنسوؤں میں
مرتی ہوئی شادابی میں
یعنی مرے وجود سے باہر
کوئی صدا ہی نہیں
قد انفرادیت کا اپنا اونچا ہے
مرا لبادہ مگر کسی اور پہ سجتا ہے

رباعیات ______________________ حافظؔ کرناٹکی

پلکوں سے نُمایاں ہیں ہمارے آنسو
کس درجہ درخشاں ہیں ہمارے آنسو
ماتم کی علامت نہ سمجھنا اِن کو
جشنِ غمِ دوراں ہیں ہمارے آنسو

جب آیا بڑھاپا تو خُدا یاد آیا
ہر حوصلہ ٹُوٹا تو خُدا یاد آیا
عیش اور تعیش میں جوانی گذری
مشکل ہُوا جینا تو خُدا یاد آیا

ہم نے بھی محبت میں کمائے آنسو
معشوق کی فرقت میں گنوائے آنسو
پھولوں کی قطاریں ہیں وہاں آج کھلی
مٹی میں جہاں ہم نے مِلائے آنسو

ہم نے کبھی احساس کو مرنے نہ دیا
لب سُوکھ گئے پیاس کو مرنے نہ دیا
دامن میں کبھی پُھول تھے جو اَب نہ رہے
لیکن ابھی بوباس کو مرنے نہ دیا

زندہ ہیں کئی لوگ محبت کے بغیر
زلفوں کی گھنی چھاؤں کی راحت کے بغیر
ہم بھی ہیں اُنہی لوگوں میں شامل حافظؔ
جی لیتے ہیں جو کوئی مسرّت کے بغیر

یہ دَور ہے ہشیار بنے رہنے کا
اک جاگتی تلوار بنے رہنے کا
نقصان بہت ہوگا تغافل سے ہمیں
فن سیکھو خبردار بنے رہنے کا

چلنے کا ہنر ہم کو سکھائے ٹھوکر
چوکس ہمیں آئندہ بنائے ٹھوکر
ہر ایک کو چلنے کا سلیقہ بخشے
گرنے سے زمانے کو بچائے ٹھوکر

ارمان غریبوں کے نکلتے ہی نہیں
برسوں میں بھی دن اِن کے بدلتے ہی نہیں
معلوم نہیں کب انہیں خوشیاں ہوں نصیب؟
غم اِن کے کبھی خوشیوں میں ڈھلتے ہی نہیں

تاریخ کے دامن پہ ہیں دَھبّہ وہ لوگ
کرتے ہیں جو ایمان کا سودا وہ لوگ
مل جُل کے رہا کرتے ہیں سب میں لیکن
پہچان لئے جاتے ہیں تنہا وہ لوگ

آنکھوں میں تری یاد کے پہلو چمکے
دُنیا یہ سمجھتی ہے کہ جگنو چمکے!!
چُندھیا گئیں تاروں کی نگاہیں حافظؔ
راتوں کے اندھیروں میں جو آنسو چمکے

نیندوں کی نہ خوابوں کی مدد چاہتی ہے
دریا نہ سرابوں کی مدد چاہتی ہے
حافظؔ اِسے مطلوب ہے کچھ اور ہی شئے
تنہائی کتابوں کی مدد چاہتی ہے

غزلیں ________________ ابراہیم اشک

موبائل : 9820384821

بزمِ امکانِ وفا نور بر انگیز ہوئی
موسمِ گل میں محبت کی ہوا تیز ہوئی
جانے کیوں آج یہ سرشار ہے دل کی دھڑکن
سانس کی موج بھی اب جیسے جنوں خیز ہوئی
تشنگی اپنی بجھائی نہ کسی دریا سے
شانِ غیرت سے مری زندگی لبریز ہوئی
سب پرندوں کو منڈیروں سے اڑا دیتے ہیں
کٹ گیا پیڑ تو دنیا بھی ستم ریز ہوئی
وقت ہی اپنا برا ہو تو کسے دیں الزام
اپنی تقدیر بھی جیسے کوئی چنگیز ہوئی
مسکرا کر جو سرِ راہ کسی نے دیکھا
وادیءِ دشت بھی اپنے لئے گل ریز ہوئی
میں بھی سورج کو اشارے سے بلا لیتا ہوں
کتنے برسوں میں ریاضت مری تبریز ہوئی
ظلم نے ہاتھ میں تلوار اٹھائی جب سے
میری تحریر بھی تب سے شرر آمیز ہوئی
اپنے ہی رنگ میں رنگ دیتی ہے فنکاروں کو
اشک یہ طرزِ ادا اپنی جو رنگریز ہوئی

یہ روشنی سی جہاں میں کہاں سے آتی ہے
مرے ہی عشق سے دنیا یہ جگمگاتی ہے
ستم وہ ڈھاتا ہے جب بھی کبھی غریبوں پر
امیرِ شہر کی آواز بیٹھ جاتی ہے
کبھی جو دشت سے گزرو تو دھیان سے سننا
ہوا کی موج مری ہی غزل سناتی ہے
تمام بزمِ ثریا میں دھوم ہے اپنی
مری ہی دھن پہ وہ لعل و گہر لٹاتی ہے
یہ جو بھی گرمیءِ بازار ہے زمانے میں
مرے ہی رقص میں آتی ہے اور جاتی ہے
جدھر بھی آبلہ پا چل دیے ہیں صحرا میں
اُدھر زمین گلابوں سے سجتی جاتی ہے
نہ ہو شعور اگر بادشاہ میں کوئی
تمام قوم ہی صدمے کئی اٹھاتی ہے
بہت حسین ہے یہ کائنات کیا کہیے
ہر ایک روپ میں انسان کو لبھاتی ہے
غزل ہے اشک شعورِ وفا کا آئینہ
جو زندگی کی حقیقت ہمیں دکھاتی ہے

غزلیں ــــــــــــــــــــ پروفیسر طرزی

موبائل : 9472480803

توقیرِ وفا میں نے کچھ اور بڑھادی ہے
خود اپنے ہی قاتل کو جینے کی دعا دی ہے
اب کیسے کرے کوئی منصف کی شکایت کچھ
تھا جرم نہیں جس کا اس کو بھی سزا دی ہے
ہر فعل معمّہ ہے شیشے کے مسیحوں کا
بازار میں پتھر کی قیمت ہی گھٹا دی ہے
اے شوقِ نشیمن اب ویرانے کی جانب چل
دشمن نے تو گلشن کی ہر شاخ جلادی ہے
تہذیب کی مشعل جو اسلاف سے پائی تھی
اک شورشِ طوفاں نے مغرب کے، بجھادی ہے
اب شیخ بھی کرتے ہیں رندوں کی طرفداری
کیا جانئے ساقی نے کیا اُن کو پلادی ہے
طرزیؔ کو شکایت ہے آئینے سے بس اتنی
چہرے کی سیاہی بھی کیوں اس نے دکھا دی ہے

مدعا و آرزو، شوق و تمنا آپ ہیں
کس کوکس کو میں بتاؤں میرے کیا کیا آپ ہیں
میکدہ، ساغر، صراحی اور صہبا آپ ہیں
جو کسی صورت نہ اُترے ایسا نشّہ آپ ہیں
جس پہ کرتی ہے محبت میری دعویٰ آپ ہیں
جس کا دل شام وسحر پڑھتا وظیفہ آپ ہیں
اے مری جانِ غزل! شہرِ وفا و شوق میں
میری عذرا اور سلمیٰ میری نورا آپ ہیں
آپ ہیں اے جانِ جاں میرے سخن کی آبرو
سچ تو یہ ہے کہ غزل کا مصرع مصرع آپ ہیں
آپ کی زلفوں کا میں ہی تو نہیں تنہا اسیر
کر گئی برباد جو زاہد کی تقویٰ آپ ہیں
جذبۂ پاکیزہ میرے دل کا ہیں کچھ آپ ہی
میری چشمِ شوق کا سارا تماشہ آپ ہیں
عہدِ پیری میں غزل طرزیؔ میاں ایسی جواں
عشق میں کس کے بھلا اتنے بھی رسوا آپ ہیں؟

غزلیں ـــــــــــــــــــــــــــــــ پروفیسر طرزی

موبائل : 9472480803

خود اپنی ذات سے بڑھ کر خیال رکھا ہے
سخن میں فکر و نظر کا جمال رکھا ہے

بساطِ شوق کو اپنے نہ داد کیسے دوں
اسی نے شہرِ تمنّا سنبھال رکھا ہے

جمالِ یار سے آنکھیں مری وضو کرتیں
وقار میں نے وفا کا بحال رکھا ہے

خدائے پاک کا کرتا ہوں اپنے شکر ادا
مرے سخن میں جو حسنِ کمال رکھا ہے

کرم نہیں ہے یہ اس کا تو اور کیا کہئے
عدو کے حصے میں سارا زوال رکھا ہے

طلب جو خوب سے دائم ہے خوب تر کی رہی
شرابِ شوق کا ساغر اچھال رکھا ہے

سلوک جو کرے مجھ سے زمانہ مرنے پر
حیات بھر تو بطور مثال رکھا ہے

ترے کمال کی پھیلی ہے داستاں طرزیؔ
غموں نے گرچہ پراگندہ حال رکھا ہے

کام آئے گا، جنوں سختیٔ زنجیر نہ دیکھ
خود کو گر دیکھنا ہے گردشِ تقدیر نہ دیکھ

گاہے کردیتی ہے کچھ دور بھی مقصد سے یہی
خواب سے پہلے کبھی خواب کی تعبیر نہ دیکھ

عقلِ عیّار کو شرمندۂ وحشت کردے
برسرِ دار مچل کاہشِ تعذیر نہ دیکھ

تیشہ برداروں سے ہر دَور کی تاریخ بنی
کاوشیں دیکھ، کبھی حاصلِ تدبیر نہ دیکھ

عصرِ حاضر کے تقاضوں کو پسِ پشت نہ ڈال
شاعرِ شعلہ صفت! شبنمی تحریر نہ دیکھ

قوّتِ بازو پہ، رکھ عزمِ مصمّم پہ نظر
سعیٔ پیہم کے سوا نسخۂ تسخیر نہ دیکھ

منتظر آج بھی کچھ تازہ افق ہیں طرزیؔ
کوچۂ شوق میں آ، درد کی تفسیر نہ دیکھ

غزلیں ــــــــ ڈاکٹر رؤف خیر

موبائل : 9440945645

مجھ کو بتا رہا تھا وہ ابنِ فلاں حسب نسب
میں نے بھی یار پڑھ دیا تبّت یدا ابی لہب

نا پختہ شیخ و برہمن ،ظلم ِ عظیم میں مگن
خلاّقِ دو جہان کو دیتے ہیں دعوتِ غضب

لہو و لعب میں مبتلا ،لیت و لعل کا سلسلہ
اِس کے سوا ہے اور کیا نسلِ نوی کے روز و شب

گزری ہے ہر گمان سے ،حق الیقیں کی آس میں
حرف ِ غلط کی بے کلی، حرفِ صحیح کی طلب

ہم سے ادا نہ ہو سکا فرض ِ کفایہ ایک بھی
ایسے میں کیا بنیں بھلا حصہ ٔ محفلِ طرب

جس کے لیے لکھا گیا ،جس کے لیے کہا گیا
اُس نے مجھے پڑھا ہی کب،اُس نے مجھے سنا ہی کب

نظم ِ رؤف خیر سے ،نثر ِ رؤ ف خیر تک
تنقید ِ شرو بے ادب ،تائید ِ خیرِ باادب

مجھے ٹوک مت خدارا، مجھے چھوڑ مت خدارا
میں علامت ِ خطا ہوں، تو عطا کا استعارہ

مرے جاں نثار ہمدم مجھے یہ نہیں گوارا
مرے فائدے کی خاطر ہو ترا کوئی خسارہ

یہ فُرات ہے سراپا، وہ سمندر اور کھارا
ہے الگ الگ جو دھارا ، ہے انا کا کھیل سارا

نہیں واپسی کا رستہ نہ سہی تری گلی سے
مجھے لوٹنا گوارا نہ ہے لوٹنے کا یارا

تری بے زبانیوں نے مجھے گُنگ کردیا ہے
مجھے فون کرنے والے کبھی بات کر خدارا

اُسے زعمِ خود نمائی سے نکالیے خدارا
وہ بجائے خود نہ محفل نہ بجائے خود ادارہ

ترے گاؤں میں نہ جاؤں نہ زباں پہ نام لاؤں
یہی خیؔر طے اگر ہے تو کہاں کا استخارہ

غزلیں ______ ڈاکٹر رؤف خیر

موبائل : 9440945645

بہت دنوں میں یہ عقدہ کھلا ، مخالف ہے
جسے میں دوست سمجھتا رہا مخالف ہے
بُرا نہ چاہا نہ احسان ہی کیا اُس پر
تو پھر وہ کس لیے آخر مرا مخالف ہے
میں منزلوں کے لیے، منزلیں ہیں میرے لیے
مری بلا سے جو ساری فضا مخالف ہے
جو حوصلہ ہے تو کھل کر وہ سامنے آئے
پتہ چلے کہ موافق ہے یا مخالف ہے
نہیں ہوں میں جو کسی سلسلے سے وابستہ
اسی خیال سے ہر سلسلہ مخالف ہے
مرے لیے تو ہے دشمن بہ درجۂ اولیٰ
وہ نا بکار اگر آپ کا مخالف ہے
رؤف خیر اب اندھیر اور کیا ہوگا
ہوا تو خیر ہوا ہے ، دیا مخالف ہے

اک بھکاری کے سرہانے سے خزانے نکلے
نوٹ بندی کے مگر نوٹ پرانے نکلے
آزمائش میں سبک دوش نہ شانے نکلے
ہم سراسر ترا احسان اٹھانے نکلے
پاؤں شل ہو گئے ، بینائی نے جی چھوڑ دیا
تیرے کوچے سے کہیں اور جو جانے نکلے
استخارے میں لگے رہ گئے اربابِ خرد
تیری راہوں میں جو نکلے تو دوانے نکلے
دشت ہی دشت ہے ویرانی ہی ویرانی ہے
خاک زادے جو کہیں خاک اڑانے نکلے
اور کیا ہوگی بھلا علم و ادب کی توہین
جن کو پڑھنا نہیں آتا وہ پڑھانے نکلے
ہم نے دیکھے تو ہیں ہاتھوں میں اُسی کے پتھر
جس کی راہوں میں ہم آئینے سجانے نکلے
بے ٹھکانوں نے ٹھکانا بھی دلوں میں ڈھونڈا
خیر صد شکر ٹھکانے کے ٹھکانے نکلے

غزلیں ______ تسلیم نیازی

خاموش رہا کرتا ہوں اس خوف سے بابا
اچھا نہیں لگتا ہے اسے شور شرابا

اس بار بھی سر ہو نہ سکا معرکۂ شوق
یوں رات گئی بیت کہ اک پاؤں ہی دابا

یہ آپکی تقدیر ہے یہ میرا مقدر
یہ آپ کا خس خانہ ہے یہ میرا خرابا

تو خیر منا اے مری آنکھوں کے شناور
اٹدانہ کبھی سامنے تیرے یہ دو آبہ

کچھ روز سے دل کی طرف آتے نہیں ارماں
کہتے ہیں کہ ہوتا ہے یہاں خون خرابا

حاجات مری اور ترے الطاف کے مابین
درکار ہے بس ایک خوشامد کا قلابہ

یہ عجز بیاں میرا، تری شانِ سماعت
اک پانچ ستارہ ہے تو اک راہ کا ڈھابہ

اب وہ ہاں اور نہ ہوں بولے گا
اب چرا بولے گا چوں بولے گا

آستینوں کو پتہ ہے کہ نہیں
ایک اک قطرہ خوں بولے گا

کیا خبر تھی کہ محبت کا نشہ
اس طرح روز فزوں بولے گا

عشق شہرت سے گریزاں ہے مگر
دل جلے گا تو جنوں بولے گا

مڑ کے مت دیکھیو وقتِ رخصت
اس کی آنکھوں سے فسوں بولے گا

اب غزل ہو کے رہے گی شاید
اب مرا سوزِ دروں بولے گا

تو ہی جو بولے تو بولے تسلیم
کون اس شہر میں یوں بولے گا ؟

غزلیں ______ تسلیم نیازی

دشمن تھے ہزاروں میں مرے، گھر نہیں جاتا
اک دوست کے قدموں پہ جو میں گر نہیں جاتا

غم ہو کہ بلا ہو کہ مصیبت ہو کہ مشکل
آتا ہے جو اک بار مسافر نہیں جاتا

باغوں میں کہ کھیتوں میں کہ دریا کے کنارے
تنہا مرے ہمراہ وہ شاطر نہیں جاتا

جو سحر کہ مجھ پر تری آنکھوں نے کیا ہے
اس اوجِ ہنر تک کوئی ساحر نہیں جاتا

مرنے کے مراکز تھے زمانے میں کئی اور
اے کاش میں جاں سے تری خاطر نہیں جاتا

یوں ضرب سزا کی مرے دل تک نہ پہنچتی
تو اپنی گواہی سے اگر پھر نہیں جاتا

رہی نہ عشق میں فکرِ مآل کی عادت
جگر بحال نیازی، جلال کی عادت

کبھی کبھی تو کئی وقت کچھ نہیں کھا کر
گئی نہیں ہے تمہاری خلال کی عادت

مری زباں پہ خدارا نہ جائیے صاحب
اِسے تو ہے یونہی بے جا سوال کی عادت

یہ زخم ہیں مرے محبوب کے لگائے ہوئے
انہیں ازل سے نہیں اندمال کی عادت

اِدھر ہوس کی روایت اُدھر ادا کا رواج
اِدھر سوال، اُدھر قیل وقال کی عادت

میں عرضِ حال نیازی کروں جو وہ چھوڑے
ذرا سی بات پہ جنگ و جدال کی عادت

گریزاں تو کبھی منسوب صاحب
ہے سیمابی مِرا محبوب صاحب
مِرے ہی روبرو گُل کو مسلنا
ہُوا انداز بھی کیا خوب صاحب
شبِ ہجراں وہ نم دیدہ پھرے تھے
دمک اُٹھی چمن کی دوب صاحب
نہ ہو سر سبز کیوں فصلِ حمیّت
کوئی کب تک رہے معتوب صاحب
فسوں کاری کے کوہ شرفشاں سے
کہاں ہوتا ہوں میں مرعوب صاحب!
بڑا ضدّی تھا خوش فہمی کا سایہ
پڑی پھر وقت کی جارُوب صاحب
تغافل سے چراغِ شوق کی لَو
بھڑک اٹھی پےَ مطلوب صاحب
تخیّل کی جگالی کی کہوں کیا
رہے تازہ مگر اسلوب صاحب
بھلے ہم بیٹھ کر کیڑے نکالیں
کسے دنیا نہیں مرغوبؔ صاحب

عقل جب تُخمِ فکر بو دے گی
آگہی، چاہئے گا سو دے گی
شب سے مل کے گلے بچاری شام
پَل میں اپنا وجود کھو دے گی
شوخ ندّی کل اپنا زورِ شباب
بحرِ بے پیر میں ڈبو دے گی
وہ ہٹیں بھی کہ میری میّت پر!
کوئی بدلی تو آ کے رو دے گی
وہ سمجھتے ہیں خامُشی کی پھُوار
داغ دامن کے سارے دھو دے گی
یوں سرِ عام کیفیت کا لفاف
کُھلتے ہی سرخوشی بھی رو دے گی
بے رُخی اُن کی مسئلہ ہے مگر
لذّتِ انتظار تو دے گی
تیرگی، سارے گم شدہ منظر
میری آنکھو میں کیا سمو دے گی؟
شاعری کی لگن آثرؔ تجھ کو
فَن کی تسبیح میں پرو دے گی

غزلیں ______________________ خورشید اکبر

موبائل : 9631629952

تھیر ہے آنکھوں میں پانی، سب روانی کھو گئی
داستاں اس کی چلی، اپنی کہانی کھو گئی

پھول سے رخسار پر تتلی کے بوسے کی طرح
کھیلتی رہتی تھی اک ساعت زبانی، کھو گئی

وعدۂ مشوق سے پھلتی نہیں شاخِ نصیب
پھول سوکھے رہ گئے، خوشبو پرانی کھو گئی

کوئی شے دنیا میں یکساں حال پر ٹکتی نہیں
روشنائی بجھ گئی، روشن بیانی کھو گئی

زندگی بھر شاہزادے کو یہ غم ڈستا رہا
سب علاقے حل ہوئے، اک راجدھانی کھو گئی

باہر سے بہت سخت ہیں اندر سے کھلیں گے
یہ تشنہ علاقے نئے تیور سے کھلیں گے

برسیں گے کسی باغِ بہشتی کے فلک پر
سو رنگ مری جاں! ترے پیکر سے کھلیں گے

اس چاند کے پہلو میں قصیدے کی طرح لوگ
بادل کے سفینے ہیں کبوتر سے کھلیں گے

لوٹے ہوئے، ٹوٹے ہوئے پیاسوں کے یہ خیمے
صحرا کے مقدر ہیں سمندر سے کھلیں گے

کچھ وعدۂ معشوق ابھی ہیں پسِ ادراک
جو شہر نصیباں میں قلندر سے کھلیں گے

خورشید! یہ مٹی کے پرندے سرِ افلاک
پرواز کریں گے، نئے شہپر سے کھلیں گے

غزلیں____________________خورشید اکبر

موبائل : 9631629952

تھکا سا دن، ذرا جھکی سی رات ہو گئی ہے
قضا کے شہر میں پل بھر حیات ہو گئی ہے
وہ میرے ساتھ ہے جنگل میں رات ہو گئی ہے
پھر اس کے بعد خفا کائنات ہو گئی ہے
اس ایک نام سے نسبت ہے ان کہی پھر بھی
خدا بچائے! جو کچھ اور بات ہو گئی ہے
اسی بدن پہ نچھاور سبھی ستارے ہیں
وہ ایک جان غضب کائنات ہو گئی ہے
کوئی بچا ہے کہاں غزنوی کی آنکھوں سے
یہ اور بات کہ وہ سومنات ہو گئی ہے
بہت ہی تازہ شگفتہ تھی آرزو کی طرح
ذرا سا چھوتے ہی میلی وہ ذات ہو گئی ہے
میں اس زباں پہ نمک مدعا کا بن گیا ہوں
وہ میرے شہر میں شیریں صفات ہو گئی ہے
یہ اور بات بچھی ہے عجب طرح سے بساط
یہ اور بات مگر شہہ کو مات ہو گئی ہے

شاخ سے ٹوٹے نہ پیڑوں کے گھرانے ہوئے ہم
اے زمیں تیری امانت کے بہانے ہوئے ہم
پھل کی مانند پکے ہم نہ ہوئے لقمۂ تر
چھانوؤں میں کھیلتے بچوں کے نشانے ہوئے ہم
تشنگی! تیرے لبِ خشک کو تر کرنا تھا
جاں کے بوسے نہ لیے اور سیانے ہوئے ہم
سرخرو ہوتے ہیں سب دستِ طلب کر کے دراز
اے خدا! کون سی دنیا کے خزانے ہوئے ہم
ایک تو عشق نے رکھی تھی قیامت بنیاد
اس پہ مجنوں کے محلے کے دوانے ہوئے ہم
اپنی بھی ایک شریعت ہے درختوں کی طرح
کچھ تھکے ہارے پرندوں کے ٹھکانے ہوئے ہم
یہ الگ بات کہ میراث بڑی تھی اپنی
مدتوں چھکے تو ماتم کے گھرانے ہوئے ہم
صبح تا شام اجالوں سے نہ الجھے خورشید!
رات آئی تو چراغوں کے سرہانے ہوئے ہم

غزلیں ______ عالم خورشید

موبائل : 8084095789

اٹھائے سنگ کھڑے ہیں سبھی ثمر کے لیے
دعائے خیر بھی مانگے کوئی شجر کے لیے

ہوائیں پوچھنے لگتی ہیں میرے گھر کا پتہ
میں جب چراغ جلاتا ہوں رہگذر کے لیے

یزید وقت کو نشہ چڑھا خدائی کا
تنی ہوئی ہیں کمانیں ہمارے سر کے لیے

نچا رہا ہے فقط چاک اپنی وحشت میں
بچا نہیں ہے کوئی کام کوزہ گر کے لیے

بشر نما یہ درندے کہاں سے آئے ہیں
زمیں بنائی گئی تھی اگر بشر کے لیے

خیال آتا ہے منزل کے پاس آتے ہی
کہ کوچ کرنا ہے اک دوسرے سفر کے لیے

سمجھ رہا تھا جنہیں غم گسار میں عالمؔ!
وہ لوگ آئے تھے اخبار کی خبر کے لیے

تمام لوگ تھے بے تاب دیکھنے کے لیے
نئے نظام کے آداب دیکھنے کے لیے

عبث اداس ہیں تعبیر کے تعاقب میں
ملی ہیں آنکھیں ہمیں خواب دیکھنے کے لیے

کھلی جو آنکھ تو ہم ڈوبتے نظر آئے
گئے تھے دور سے گرداب دیکھنے کے لیے

اڑان بھرتے ہیں ہر سال کچھ پری زادے
مرے دیار میں سیلاب دیکھنے کے لیے

ترس رہی ہے مرے شہر کی فضا کب سے
کسی درخت کو شاداب دیکھنے کے لیے

دعائیں کرتے ہیں دستور میں لکھے الفاظ
عدالتوں کو ظفریاب دیکھنے کے لیے

نظر جھکائے کھڑی ہیں عقیدتیں عالمؔ!
شکستِ گنبد و محراب دیکھنے کے لیے

غزلیں ________________ عالم خورشید

موبائل : 8084095789

کیوں خیال آتا نہیں ہے ہمیں یکجائی کا
جب ہر اک شخص گرفتار ہے تنہائی کا

وہ بھی اب ہونے لگے ایذا رسانی کے مریض
جن کو دعویٰ تھا زمانے کی مسیحائی کا

شک نہیں کرتا میں رشتوں کی صداقت پہ کبھی
بس یہی ایک سبب ہے مری رسوائی کا

زخم بھرتے ہی نہیں میرے کسی مرہم سے
جب بھی لگتا ہے کوئی تیر شناسائی کا

بزدلی سمجھی گئی میری شرافت ورنہ
کب مجھے شوق رہا معرکہ آرائی کا

اپنی رسوائی کو اعزاز سمجھ لیتے ہیں
خوب یہ شوق ہے احباب کی دانائی کا

چھیڑتا رہتا ہوں میں صنفِ غزل کو عالمؔ
میں فسانہ نہیں لکھتا کسی ہرجائی کا

میں پرستار ہوں اب گوشۂ تنہائی کا
خوب انجام ہوا انجمن آرائی کا

بس وہی ملنے، بچھڑنے کی کہانی کے سوا
کیا کوئی اور بھی حاصل ہے شناسائی کا

خود ہی کھنچتے ہوئے آتے ہیں ستارے ورنہ
چاند کو شوق نہیں حاشیہ آرائی کا

اب کسی اور نظارے کی تمنا ہی نہیں
اب میں احسان اٹھاتا نہیں بینائی کا

کتنے بے خوف تھے دریا کی روانی میں ہم
کوئی اندازہ نہ تھا جب ہمیں گہرائی کا

ہم نے سمجھا نہیں دنیا کو تماشا ورنہ
یوں بھی ہوتا ہے کہیں حال تماشائی کا

پھر غزل روز بلانے لگی عالمؔ صاحب!
اور کچھ شوق ہے شاید اسے رسوائی کا

غزلیں ______________ لطیف ساجد (پاکستان)

ایسی حالت جو ترے شہر نے کر دی میری
اس سے بہتر تھی کہیں دشت نوردی میری

پھول ہوں برگ خزاں دیدہ کی تمثیل نہیں
آپ سرسوں سے ملا سکتے ہیں زردی میری

کوئی خورشید ہے اس شخص کی پیشانی میں
ایک بوسے سے اتر جاتی ہے سردی میری

تنگ دامن ہوں کہاں عرضِ تمنا رکھوں
تو نے جھولی تو شکایات سے بھر دی میری

اس نے آئینہ دکھانے میں بھی ابہام رکھا
ایک تصویر مرے سامنے دھر دی میری

پھوٹ پڑتا ہے کسی کوہ سے جیسے چشمہ
کوئی الجھن بھی نکل آئی ہے دردی میری

کس کو ہے دشت نوردی کا سلیقہ ساجدؔ
کون پہنے گا اتاری ہوئی وردی میری

جانے کس سمت رخِ لالہ و گُل جاتے ہیں
لوگ خوشبو کے نشانات پہ رُل جاتے ہیں

اب یہ اعجاز ہے مخصوص، عدالت کے لیے
کچھ گنہگار یہاں دودھ سے دُھل جاتے ہیں

جو کسی دشت وغیرہ میں نہیں جا سکتے
تیرے لاہور کی آغوش میں رُل جاتے ہین

روز پربت سے بلاتا ہے کوئی شخص ہمیں
روز ہم شبنمی آواز میں گُھل جاتے ہیں

آمد و رفت مفادات سے بالا رکھنا
بند اونچے ہوں تو سیلاب میں پُل جاتے ہیں

ورنہ یہ دھوپ کبھی پیچھا نہیں چھوڑے گی
ایسا کرتے ہیں کسی پیڑ پہ گُھل جاتے ہیں

صرف رخسار ہی شاداب نہیں ہوتے لطیفؔ
اشک گرنے سے کئی پاپ بھی دُھل جاتے ہیں

شعبدہ باز بتاتے ہوئے جل جاتے ہیں
کھوٹے سکے بھی ترے ہاتھ سے چل جاتے ہیں
کج کلاہی کا بھی احساس ہے میخواروں کو
جب کوئی غور سے دیکھے تو سنبھل جاتے ہیں
روندنی پڑتی ہے پیروں میں انا کی چادر
صرف جلنے سے کہاں رسی کے بل جاتے ہیں
پارسا لوگ ہیں میخانے سے گھر جاتے ہوئے
اپنی کالک بھی کسی اور پہ مل جاتے ہیں
گالیاں چیخ پکار اور نہ جانے کیا کیا
تیرے ہنسنے سے کئی حادثے ٹل جاتے ہیں
تجھ کو اس عمر میں دیکھا ہے تو محسوس ہوا
آنکھ چندھیائے تو منظر بھی بدل جاتے ہیں
بھوک بیواؤں کی وحشت سے بھی مٹ جاتی ہے
ڈر نہیں بچے یتیمی میں بھی پل جاتے ہیں
اپنی دانست میں مشرق ہے نہ مغرب کوئی
جس طرف تو ہو اسی سمت میں ڈھل جاتے ہیں
حسن والے بھی ہیں آوارہ پرندے ساجدؔ
انگلیاں کھولیں تو ہاتھوں سے نکل جاتے ہیں

لوگ ایسے تو مجھے دیکھ کے حیران نہیں
عمر بھر جاگتے رہنا کوئی آسان نہیں
فکر لاحق ہے کسی اگلے پڑاؤ کی ہمیں
زندگی.! تیرے حوالے سے پریشان نہیں
باقی سب ٹھیک ہے جھرنا بھی وہی ہے لیکن
تُو نے بولا تھا جہاں لکڑی کی دوکان نہیں
سب کی اشکال ہیں محفوظ مری آنکھوں میں
کوئی یاقوت مرے سامنے مرجان نہیں
ہم ہیں قرطاس پہ موجود دکھاوے کے لیے
حرفِ علت کی طرح شاملِ اوزان نہیں
خوش نہ ہو میری مشقت کا بھی اندازہ لگا
تُو محبت ہے کوئی حاصلِ عرفان نہیں
مرشدا! خواب اٹھا لوں میں یہاں سے اپنے؟
جب ترے پاس کوئی صورت امکان نہیں
سو جا اس پیڑ کے سائے میں بلا خوف و خطر
بس پرندے ہیں یہاں حضرتِ انسان نہیں
حافظ آباد میں دستور الگ ہے ساجدؔ
لوگ عاشق ہیں مگر چاک گریبان نہیں

اتنا بھی سہل نہیں یار معطّل کرنا
عہدِ نو کی کوئی رفتار معطّل کرنا
اے ہوا میری گذارش بھی یہی ہے تجھ سے
فصلِ اُمّید نہ اِس بار معطّل کرنا
اے سیہ ابر برسنا ہے تو برسو لیکن
پھر کوئی پیڑ نہ پھلدار معطّل کرنا
میرے محبوب بتاؤ یہ کہاں کی ہے رسم
بے سبب پیار کا اظہار معطّل کرنا
بے سہاروں پہ ستم ہوتے ہوئے دیکھو اگر
اپنے ہاتھوں کی نہ تلوار معطّل کرنا
ایک ہی رنگ میں جب رنگ گئی ہے دُنیا
سہل ہے حرص کا بازار معطّل کرنا
آدمیت کا سبق یہ تو نہیں ہے آتشؔ
کسی ناچار کا گھربار معطّل کرنا

دریا کے ساتھ ساتھ گھٹا بھی خموش ہے
ہلچل مچائے کون ہَوا بھی خموش ہے
کل تک تھی آرزوؤں کی محفل سجی ہوئی
کیوں آج شب کدے کا دیا بھی خموش ہے
کچھ بھی مرے سوال کا دیتا نہیں جواب
کیوں سُن کے پتھروں کا خدا بھی خموش ہے
زہریلے موسموں کے دھوئیں کا اثر ہے یہ
شہروں سے گاؤں تک کی فضا بھی خموش ہے
معلوم ہو سکا کہاں سربستہ راز کچھ
کیوں سازِ زندگی کی صدا بھی خموش ہے
اُمّید کوئی عدل کی رکھتا ہے اب فضول
آئینِ نو کی شمعِ وفا بھی خموش ہے
آتشؔ نے غورو خوض کیا اِس پہ کیا کبھی
کیوں اپنی چاہتوں کی ضیا بھی خموش ہے

چنے کا جھاڑ

منظور وقار (گلبرگہ)

موبائل : 9731428416

شاید دنیا میں جھاڑوں (درختوں) کی تعداد کا صحیح اندازہ ہمارے جیسے کم علم انسان کے بس کی بات تو کیا بڑے بڑے سائنس داں، انجینئرس، ریاضی داں اور ماہرین جنگلات کے بس کی بھی بات نہیں کیونکہ جھاڑوں (درختوں) کی افزائش نسل کا معاملہ بھی ہم ہندوستانیوں کی طرح ہے ایک مرتا ہے تو اسکی جگہ ایک ہزار بچے پیدا ہوتے ہیں لیکن سڑکوں کی توسیع میٹرو ریلوے پلوں عالیشان بنگلوں فائیو اسٹار ہوٹلوں اور وسیع وعریض کھیل کے میدانوں کی تعمیر وتوسیع کیلئے جھاڑوں کی اس بے دردی کے ساتھ کٹائی ہورہی ہے۔اس کٹائی کو دیکھ کر پہاڑوں کے دل بھی دہلتے ہوں گے۔ جھاڑوں کی کٹائی کا نتیجہ شہر نہ صرف اپنی خوبصورتی اور ٹھنڈک کھور ہے ہیں۔ بلکہ اپنی بقا کی خیر منارہے ہیں۔

دھوپ اور گرمی کی شدت سے تپتے ہوئے ریگستان میں تبدیل ہورہے ہیں جھاڑوں کی تعداد کا اندازہ تو نہیں لگایا جاسکتا البتہ اسکی قسموں کی صحیح تعداد ہم خود بتا دیتے بشرطیکہ ہے کہ ہمیں فیس بک، واٹس ایپ، یوٹیوب، انٹرنیٹ گوگل اور جنرل نالج کی کتابوں میں تانک جھانک کرنے کی عادت ہوتی لہٰذا ہم اتنا ضرور کہہ سکتے ہیں، جھاڑوں کی قسموں کی تعداد لاکھوں میں نہ سہی ہزاروں میں تو ضرور ہوگی ہماری اور آپ کی نظروں سے گزرنے والے ہمارے اچھے بُرے وقت میں کام آنے والے چند جھاڑوں کے نام کچھ اس طرح ہیں۔

ناریل کا جھاڑ، نیلگری کا جھاڑ، نیم کا جھاڑ، املی کا جھاڑ پیپل کا جھاڑ، کیکر کا جھاڑ، آم کا جھاڑ، جام کا جھاڑ جامن کا جھاڑ، انجینئر کا جھاڑ، انار کا جھاڑ، اناس کا جھاڑ سپاری کا جھاڑ بادام کا جھاڑ بیر کا جھاڑ، باڑ کا جھاڑ، تاڑ کا جھاڑ، ساگوان کا جھاڑ سیب کا جھاڑ، پھنس کا جھاڑ، سیتا پھل کا جھاڑ شہتوت کا جھاڑ، صندل کا جھاڑ، گھکرو کے کانٹوں کا جھاڑ، چپل سینڈ کا جھاڑ۔(آخر الذکر دو جھاڑوں کی خصلت بعض انسانوں میں بھی ہوتی ہے)۔

مندرجہ بالا جھاڑوں کے علاوہ سب سے اہم سب سے پاور فل سب سے کارآمد سب سے خطرناک

سب سے مشہور اور سب سے مقبول ایک جھاڑ ہے جیسے'' چنے کا جھاڑ'' کہا جاتا ہے۔ یہاں چنے کا جھاڑ سے ہمارا مطلب وہ چھوٹا سا نازک اور نمکین چنے کا جھاڑ نہیں جسکے دانوں سے چنا زور گرم یا بابا یا بگھاری دال کا مزہ لیتے ہیں۔ ہم جس چنے کے جھاڑ کا ذکر کرنے جار ہے ہیں اس جھاڑ کا کمال یہ ہے کہ یہ کسی کو نظر نہیں آتا یہ جھاڑ صرف ان لوگوں کو نظر آتا ہے۔ جو اس پر چڑھتے ہیں یا دوسروں کو چڑھاتے ہیں اگر کسی شخص کو بیوقوف بنا کر اسکی خوشحال زندگی کو برباد کرنا ہوتا ہے تو لوگ اس شخص کو چنے کے جھاڑ پر چڑھا دیتے ہیں۔ تعجب تو اس بات کا ہے لوگ کسی شخص کو چنے کے جھاڑ پر چڑھانے کیلئے اتنے بے چین نہیں ہوتے جس قدر بعض لوگ چنے کے جھاڑ پر چڑھنے کیلئے بے چین نظر آتے ہیں۔ چنے کے جھاڑ پر چڑھنا یا چڑھانا تو بس ایک محاورہ ہے اس محاورے کے اندر تہہ در تہہ اتنے پرت ہیں کہ ان پرتوں کو کھولتے جائیں گے۔ تو صفحات کے صفحات سیاہ ہو جائیں گے اور پھر ڈر اس بات کا بھی ہے ان پرتوں کو صفحۂ قرطاس پر دیکھ کر پتہ نہیں کتنے لوگوں کے چہرے سیاہ پڑ جائیں گے۔ ہوسکتا ہے کچھ لوگ ڈنڈا لے کر ہمارے پیچھے لگ جائیں گے کچھ بھی ہوگا۔ بعد میں دیکھا جائے گا۔ آج ہم چنے کے جھاڑ کی پرتیں کھول کر ہی رہیں گے۔ جب آپ اپنے قیمتی وقت میں سے بہت سارا وقت نکال کر یا دل پر پتھر رکھ کر ہمارے اس مضمون کا مطالعہ کریں گے ۔تو حیرت سے آپ کی آنکھیں اس بری طرح پھٹ پڑیں گی کہ۔ آپ کی آنکھوں کا چشمہ ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا ۔کہ ایک ایسا جھاڑ جو کسی کو نظر بھی نہیں آتا اس میں اتنی خوبیاں اور کرشمہ سازیاں موجود ہیں جو لوگ بلند قد ہوتے ہیں وہ پست قد والوں کو بونا کہہ کر چنے کے جھاڑ پر چڑھ جاتے ہیں حالانکہ انسان قد سے نہیں بلند کردار بلند اخلاق بلند سوچ اور بلند ارادوں سے بلند کہلاتا ہے جنکے پاس مندرجہ بالا خوبیاں نہیں ہوتیں وہ اونٹ کی طرح بلند قد ہو کر بھی بونا ہی کہلاتے ہیں جو لوگ صرف اپنے قد کی وجہ سے چنے کے جھاڑ پر چڑھے ہوئے ہیں بے چارے اس بات سے نابلد ہیں کہ بعض بلند قد انسانوں کی عقل گھٹنوں کے نیچے ہوتی ہے بعض لوگوں کو دوسرے لوگ چنے کے جھاڑ پر چڑھاتے ہیں تو بعض قلمکار اور شعراء اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کے ذریعہ اپنا جشن ادبی خدمات کا شاندار انعقاد کروا کر خود کو چنے کے جھاڑ پر چڑھواتے ہیں اس کام کیلئے انہیں اتنی بڑی رقم خرچ کرنی پڑتی ہے اس رقم سے انکے اگلے پچھلے تمام قرض ادا ہو سکتے ہیں۔

بعض قلمکاروں اور شعراء کو نقادانِ ادب گھاس نہیں ڈالتے مطلب چنے کے جھاڑ پر نہیں چڑھاتے تو اس صورت میں شہرت کے بھوکے قلمکار اور شعراء خود ہی اپنی شخصیت اور قلمی کاوشوں پر تعریفی مضامین قلمبند کر کے اپنی بیوی بیٹی بہو سالے سالی یا شاگردوں کے نام سے اخبارات اور رسائل میں شائع کرواتے ہیں ان مضامین میں

اس طرح کی باتیں ہوتی ہیں'' فنکار موصوف کی شعری اور نثری تخلیقات دنیا بھر کے ادبی رسائل میں شائع ہوتی ہیں واٹس ایپ فیس بک اور گوگل پر انکی تخلیقات کو امریکہ برطاینہ فرانس اور جاپان کے وہ انگریز اور جاپانی بھی جوق و شوق کے ساتھ پڑھتے ہیں جنہیں اس بات کا بھی علم نہیں کہ دنیا میں اردو نام کی کوئی زبان بھی موجود ہے۔
ہمارے مسلسل لکھنے ملک بھر کے اخبارات اور رسائل میں چھپتے رہنے سے متاثر ہو کر یا ہماری عزت افزائی کے مقصد سے شہر اور بیرونی شہر کے ادبی اجلاسوں اور سیمیناروں میں ہمیں مہمان خصوصی اور صدر اجلاس بنایا جانے لگا تو ہمارا دماغ آسمان پر پہنچ گیا اور ہم چنے کے جھاڑ پر چڑھ گئے چنے کے جھاڑ پر چڑھتے ہی قلم و قرطاس سے ہمارا رشتہ کٹ گیا یعنی ہم نے لکھنا پڑھنا ہی چھوڑ دیا جب ہماری تخلیقات اخبارات اور رسائل میں آنی بند ہو گئیں ۔تو اردو انجمنوں اور ادبی تنظیموں نے ہمیں مہمان خصوصی بنانا چھوڑ دیا مہمان خصوصی تو دور کی بات ہے بہ حیثیت سامع بھی ہمیں مدعو کرنا ضروری نہیں سمجھا جانے لگا مہمان خصوصی کے چکر میں ہم ادھر کے رہے اور نہ ادھر کے فوراً چنے کے جھاڑ سے نیچے اتر کر دوبارہ قلم و قرطاس سے رشتہ جوڑ لیا خدا کا شکر ہے کہ ہم مسلسل لکھ رہے ہیں۔ہم نے قسم کھالی ہے کہ چنے کے جھاڑ پر چڑھنا تو کجا اس پر نظر بھی ڈالیں گے۔
'' لڑکی یا لڑکے کی شادی کے موقع پر قریبی رشتہ دار مثلاً بھائی بہن چچا چچی، ماموں ممانی، وغیرہ کو مدعو کرنا بڑا مشکل مرحلہ ہوتا کیونکہ اس وقت یہ لوگ چنے کے جھاڑ پر چڑھے ہوئے ہوتے ہیں انہیں دولہا یا دولہن کے والدین سے جو بھی ناراضگی ہوتی ہے اس وقت ابھر کر آتی ہے دولہے یا دولہن کا والد انہیں شادی میں شرکت کی دعوت دینے کیلئے انکے مکان پہنچتا ہے تو یہ رشتہ دار کھنچے کھنچے نظر آتے ہیں مطلب چنے کے جھاڑ پر بیٹھے ہوئے ہوتے ہیں انہیں دعوت نامہ دے کر پچھلی ناراضگی کے لئے معافی مانگنی پڑتی ہے حتیٰ کہ اس غلطی کی بھی معافی مانگنی پڑتی ہے جو ان سے سرزد نہیں ہوئی کافی مسکہ پالش کے بعد یہ لوگ غصہ تھوک کر شادی میں شرکت کے لئے راضی ہو جاتے ہیں انہیں چنے کے جھاڑ سے اترتے ہوئے دیکھ کر دلہا یا دلہن کے والد کے چہرے پر خوشی کھل اٹھتی ہے۔
جب وعظ و بیان کیلئے مولانا ڈائس پر تشریف فرما ہونے لگتے ہیں تو حاضرین جلسہ خصوصاً نوجوان نعرہ تکبیر اللہ اکبر مولانا زورالبیان زندہ باد کے نعرے بلند ہونے لگتے ہیں مولانا ڈائس پر تشریف فرما ہوتے ہیں تو ناظم جلسہ مولانا کو کوئی آدھا درجن خطابات اور القابات کے ساتھ دعوت خطاب دیتا ہے نعروں کی آوازوں خطابات اور القابات کو سن کر مولانا چنے کے جھاڑ پر چڑھ جاتے ہیں نتیجتاً مولانا اپنی شعلہ بیانی میں دیگر مسلک کی جماعتوں اور انکے علماؤں کو عقل کے اندھے کم علم اور جاہل کا خطاب دینے لگتے ہیں انکا مذاق اڑانے اور سامعین کو ہنسانے میں

کوئی کسر باقی نہیں رکھتے۔

اسمبلی الیکشن کا اعلان ہوتے ہی شہر کے چھوٹے موٹے سیٹھ ساہوکاروں اور سوشل ورکروں کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں اس موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے انکے دوست نما دشمن انہیں اسمبلی الیکشن میں کھڑے ہونے کیلئے اکساتے ہیں انکی کامیابی کی گارنٹی دیتے ہیں انہیں چنے کے جھاڑ پر ایسا چڑھا دیتے ہیں کہ انہیں دن ہی میں رکن اسمبلی اور وزیر کہلانے کے خواب نظر آنے لگتے ہیں۔ چنانچہ یہ لوگ الٹے سدھے کاروبار سے کمائی ہوئی دولت پانی کی طرح بہاتے ہیں۔ الیکشن نتائج آتے ہیں تو پتہ چلتا ہے وہ چاروں خانے چت ہو چکے ہیں مطلب ضمانت کے ساتھ ساتھ چنے کا جھاڑ بھی ڈوب جاتا ہے۔ نقد اور جہیز کے بھوکے لوگ جب کسی دولت مند باپ کی اکلوتی بیٹی کو بہو بنا کر گھر لاتے ہیں تو بہو جہیز اور موٹر کار کے ساتھ چنے کا جھاڑ بھی لے آتی ہے وہ چنے کے جھاڑ پر بیٹھ کر شوہر کو زر خرید غلام سسرال والوں کو نوکر سمجھنے لگتی ہے۔ اسی طرح جب کسی دولت مند باپ کی ان پڑھ اور کالی کلوٹی لڑکی کا بیاہ کسی بے روزگار تعلیم یافتہ نوجوان سے ہو جاتا ہے تو اس نوجوان (داماد) کے سسرال میں وارے نیارے ہوتے ہیں سسرال والے سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں اس کا ہر مطالبہ ہر خواہش پوری کرتے ہیں۔ لہٰذا کالی کلوٹی لڑکی کا ہنڈسم شوہر چنے کے جھاڑ پر چڑھ جاتا ہے یہاں تک کہ ایک دن سسر کی جائیداد اور عالیشان بنگلے کا مالک بن جاتا ہے۔

تاریخ کے صفحات پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں ایسے بے شمار واقعات ملتے ہیں کہ کسی راجہ مہاراجہ بادشاہ یا شہنشاہ کو اسکے مفاد پرست وزیروں نے چنے کے جھاڑ پر چڑھایا یا حکومت اقتدار اور دولت کے نشے میں وہ خود چنے کے جھاڑ پر چڑھ گئے ہر دو صورتوں میں تخت و تاج سے بے دخلی کے ساتھ ساتھ تباہی بربادی ذلت اور شکست انکے حصے میں آئی چنے کے جھاڑ پر چڑھ کر عوام سے دوری وزیروں کی سازشوں سے لاپرواہ حکمراں اور اقتدار کے نشے مست گھمنڈ اور تکبر میں مبتلا حکمرانوں کا انجام اتنا دردناک کربناک شرمناک اور عبرتناک ہوا ہے کہ اسے دیکھ کر تاریخ کے صفحات بھی تھر تھر کانپ اٹھتے ہیں۔

نمرود کو اسکے غرور نے چنے کے جھاڑ پر چڑھایا تو وہ خود کو خدا کہنے لگا یہاں تک کہ اپنی ایک جنت بھی بنا ڈالی خدا کو اسکا غرور اور تکبر پسند نہ آیا ایک مچھر کو اسکی ناک میں داخل کر دیا مچھر نمرود کے دماغ میں پہنچ کر بھیجہ کترنے لگا نمرود درد کی تاب نہ لا کر دیواروں سے سر ٹکراتا اپنے خدمتگاروں کے ذریعہ سر پر جوتیاں پٹواتا یہاں تک کے ایک دن جوتیوں کی مار سے اسکا سر پھٹ گیا اور وہ اپنے انجام کو پہنچ گیا۔

فرعون کو اسکے غرور اور تکبر نے چنے کے جھاڑ پر ایسا چڑھایا تھا کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ کی باتوں کا مذاق

اڑانے لگا انہیں طرح طرح کی تکلیفیں دینے لگا خود کو خدا سمجھنے لگا انجام فرعون اپنی فوج اور چنے کے جھاڑ کے ساتھ دریائے نیل میں غرق ہوگیا۔ قوم نوح قوم عاد قوم ثمود اور قوم لوطؑ یہ وہ نافرمان خودسر جاہل اور مغرور قومیں ہیں جو اپنے وقت کے پیغمبر کی باتوں کا مذاق اڑایا اور اپنے غرور اور تکبر کی وجہ سے چنے کے جھاڑ پر بیٹھ گئے ان کا عبرتناکی انجام ہوا اس سے ہم سب واقف ہیں۔

میوسلینی جرمنی کا اچھا بھلا حکمران (صدر) تھا لیکن اسکے افسروں (چمچوں) نے اسے چنے کے جھاڑ پر چڑھایا تو اسکا دماغ بگڑ گیا وہ پوری دنیا کو فتح کرنے کے خواب دیکھنے لگا افسروں کو غلام دانشوروں کو بیوقوف اور عوام کو کیڑے مکوڑے سمجھنے لگا لیکن جب عوام کا غصہ عتاب بنکر اس پر ٹوٹ پڑا تو حکومت اور اقتدار دونوں ہاتھ سے نکل گئے۔ جو لوگ میوسلینی کے قریب جانے سے گھبراتے تھے وہی لوگ اسے مونیخ کے بازار میں پھانسی پر لٹکا دیا کئی دنوں تک اسکی لاش بازار میں لٹکتی رہی تاکہ لوگ اس کی لاش کو دیکھ کر عبرت حاصل کریں کہ چنے کے جھاڑ پر چڑھنے والے خودسر اور معزور حکمرانوں کا انجام کتنا عبرتناک ہوتا ہے۔

عراق کی سرزمین پٹرول کی شکل میں سونا اگلنے لگی تو عراق کے صدر صدام حسین دولت اقتدار اور شہرت کو سنبھال نہ پائے، عالم عرب نے ''انہیں صحرا کا شیر کا خطاب دیا تو چنے کے جھاڑ پر چڑھ گیا حکومت اور اقتدار کے نشے میں اپنے ہی پڑوسی ملک کویت پر ناجائز قصبہ جمالیا بازاروں اور چوراہوں میں اپنے قدآدم مجسمے نصب کروائے تنقید اور مشوروں کے دروازے بند کردیئے گئے صدام اس کی زبان سے نکلنے والا ہر لفظ حکم اسکی تکمیل عوام کی ذمہ داری بن گئی بالآخر صدام حسین اور اسکی فوج کو امریکی حکومت اور اسکے اتحادیوں نے بتاہ تاراج کردیا انجام حکومت عراق تباہ ہوگئی تیل کے چشمے داہیں داہیں جلنے لگے ملک میں افراتفری اور بغاوت پھیل گئی صدام حسین کے گلے میں پھانسی کا پھندا ڈالا گیا چنا رہا اور نہ چنے کا جھاڑ۔

یوگنڈا جیسے چھوٹے سے ملک کا خودسر اور جاہل حبشی حکمراں عدی امین کو اسکے افسروں اور چمچوں نے چنے کے جھاڑ پر اتنی اونچائی تک چڑھا دیا تھا کہ وہ مٹھی بھر نا تجربہ کار فوج کے بل بوتے امریکی حکومت کو دھمکیاں دینے لگا یورپ کے گوری چمڑی والے انگریزوں کا مذاق اڑانے لگا نتیجہ ذلت شکست تباہی اور بربادی اور اس کی عبرت ناک موت اندرا گاندھی کو مفاد پرست کانگریسیوں نے چنے کے جھاڑ پر ایسا چڑھا دیا تھا کہ وہ خود کو ناقابل تسخیر وزیرآعظم سمجھنے لگی اپنی ضد اور طاقت کا مظاہرہ کرنے کیلئے ملک میں ایمرجنسی لگا کر کئی سینئر سیاسی قائدین کو جیلوں میں پٹک دیا بکرے کی ماں کب تک خیر مناتی اپنے ہی باڈی گارڈ کے گن سے نکلنے والی گولیوں سے چھلنی ہوگئی۔

شیخ مجیب الرحمٰن کو مشرقی پاکستان کے لوگوں نے اپنا قائد اور مسیحا تسلیم کرلیا تو وہ چنے کے جھاڑ پر چڑھ گیا اپنے ہی ملک پاکستان سے بغاوت کر کے بنگلہ دیش بنا ڈالا نتیجہ اسکے ہی فوجیوں نے اسے اور اسکے افراد خاندان کو گولیوں سے بھن ڈالا۔

ایک دن ہمارے دانشور دوست سے ہم نے سوال کیا۔''علامہ انسان کے پاس جب دولت حکومت اور اقتدار آجاتے ہیں تو وہ چنے کے جھاڑ پر کیوں چڑھ جاتے ہیں'' علامہ بولے''وقار لوگ چنے کے جھاڑ پر چڑتے نہیں شیطان مردود انہیں چنے کے جھاڑ پر چڑھاتا ہے ہر کامیاب انسان کے پیچھے شیطان لگا رہتا ہے کہ کسی طرح اس کو ورغلا کر چنے کے جھاڑ پر چڑھتے بعد ازاں اسے چنے کے جھاڑ سے منھ کے بل زمین پر پر گرادوں جو لوگ شیطان کے شر سے محفوظ رہتے ہیں کامیابی انکے قدم چومتی ہے جو لوگ شیطان کے بہکاوے میں آ کر چنے کے جھاڑ پر چڑھ جاتے ہیں۔وہ تباہ و برباد ہو کر رہ جاتے ہیں''

علامہ کاروباری کا جواب سنکر ہم دنگ رہ گئے کیونکہ علامہ خود شیطانی دماغ کے مالک ہیں مگر کبھی کبھی اتنی مفید باتیں کرتے ہیں کہ عقیدت سے علامہ کا ہاتھ چومنے کو جی چاہتا ہے ہم ایسا نہیں کریں گے۔ہماری اس طرح کی حرکت علامہ کو چنے کے جھاڑ پر چڑھا دے گی اگر علامہ چنے کے جھاڑ پر چڑھ گئے تو انہیں نیچے اتارنے کے لئے ہمیں لوہے کے چنے چبانے پڑیں گے!!!

مضمون : دوسری اور آخری قسط

[جنگ بہادر گوئل کی ہندی کتاب ''یہ عشق نہیں آساں'' سے ڈاکٹر رینو بہل کا ترجمہ]

اَن کہی داستاں

ڈاکٹر رینو بہل (چنڈی گڑھ)

موبائل : 9781557700

''تناسخ کے مقصد نے میری تاریک راہوں کو روشناس کر دیا ہے۔ ذرا سوچ کر دیکھو ہماری ملاقات کیسے ہوئی۔ ہم ٹیڑھے میڑھے راستوں سے ہوتے ہوئے آخر مِل ہی گئے۔ کون سوچ سکتا تھا کہ تمہارے اور میرے درمیان اور بشریٰ اور کولمبیا کے بیچ اتنا گہرا روحانی رشتہ ہوسکتا ہے۔ اگر میرے بھائی نے بوسٹن کو نہ چُنا ہوتا تو کیا ہم کبھی مِل سکتے تھے؟ جس وقت تم اسٹوڈیو میں آئیں اگر اُس وقت میں وہاں حاضر نہ ہوتا اور اگر تم تنہا نہ آئی ہوتیں تو میں تمہارے نزدیک آ کر تصویروں کے متعلق بات کرنے کی ہمت بھی نہ جُٹا پاتا۔ میری کیا یہ سب باتیں، واقعات، سوچ، خواب اور خواہشات فقط اتفاق ہی ہیں؟''

''نہیں جبران بالکل نہیں۔ مگر لوگوں کے لئے اتفاق ایک ایسا لفظ ہے جس کے ذریعے وہ قدرت کے پوشیدہ ارادوں کو بڑی آسانی سے بیان کر سکتے ہیں۔''

''زندگی کا آغاز جنم نہیں اور انجام بھی موت نہیں۔ ہم مکمل کی تلاش میں ہیں۔ ہم سب اللہ کی تلاش میں ہیں مگر اُسے بھلا کوئی شخص سو یا ہزار سال میں کیسے تلاش کر سکتا ہے؟ میں سوچتا ہوں کہ انسان کی زندگی کا حساب کتاب مسلسل چلتا رہتا ہے۔ ہم بار بار جنم لیتے ہیں۔ تمام حساب کتاب چُکتا ہونے کے بعد ہی وہ ہمارے کھاتے پر لکیر لگاتا ہے اور ہمیں جنم مرن کے اِس جنجال سے آزاد کرتا ہے۔''

''جبران مجھے اُمید ہے کہ میرے سر پر تیرا جو قرض ہے وہ میری ادائیگی کی حیثیت سے بڑھ کر نہیں ہوگا۔'' ایک سرد آہ بھر کر میری نے کہا۔

''اپنا حساب کتاب تو اِس بات پر ہی پورا ہو جاتا ہے کہ میں تمہاری موجودگی میں خود کو اکیلا محسوس نہیں کرتا جو دوسرے لوگوں کی موجودگی میں کرتا ہوں۔ تمہارے ساتھ بات کرتے محسوس ہوتا ہے جیسے میں خود سے

باتیں کررہا ہوں۔ جب تم مجھ سے دُور ہوتی ہو تو میں خود کو اِس دُنیا میں اجنبی محسوس کرتا ہوں۔''

''جبران میں جانتی ہوں تم عربی زبان کے نامی گرامی ادیب ہو مگر تم انگریزی میں کیوں نہیں لکھتے؟''

''انگریزی زبان پر مجھے عبور حاصل نہیں۔''

''میں اپنی قابلیت کے مطابق تمہاری اِس سلسلے میں مدد کرنے کو تیار ہوں۔''

''فی الحال میں اپنے فن پر ہی توجہ دینا چاہتا ہوں۔''

''کیا تم اپنے فن کو نکھارنے کے لئے پیرس جانے کی خواہش رکھتے ہو؟''

''یہ تو میری دِلی خواہش ہے مگر۔۔۔۔''

''تمہارے پاس اس خواہش کو تکمیل تک پہچانے کا ذریعہ نہیں۔؟ میں تمہارے ٹکٹ کا خرچ دینے کو تیار ہوں اور ہر ماہ تمہیں خرچ کے لئے 75 ڈالر دینے کا وعدہ کرتی ہوں۔ میں تمہارے فن کی قدر دان ہوں اگر تم چاہو تو اِس سے زیادہ رقم بھی ہر ماہ تمہیں دے سکتی ہوں۔''

یہ سُنتے ہی جبران کی آنکھیں برسنے لگیں۔ یہ شُکرانے کے آنسو تھے جو اُس کے دِل سے میری ہیسکل کی بات سُن کر بے ساختہ بہہ نکلے۔

جبران کی زندگی کا ایک نیا باب شروع ہونے والا تھا۔ پیرس جانے کے لئے جب وہ جہاز سے روانہ ہوا تو اُس نے میری ہیسکل کو ایک تار بھیجا۔

''تم ایک ایسا فرشتہ ہو جو مجھے ایک شاندار مُستقبل کی جانب لے کر جا رہی ہو اور میرے ذہنی، رُوحانی اور مالی کامیابی کے دروازے کھول رہی ہو۔''

جبران جب بوسٹن میں تھا تو وہ میری ہیسکل کو اپنا دوست، ہمدرد، سرپرست اور اُستاد سمجھتا تھا مگر اُس سے جُدا ہو کر اُس نے دِل کی گہرائیوں سے محسوس کیا کہ وہ حقیقت میں میری ہیسکل سے محبت کرتا ہے۔ پیرس کے قیام کے دوران جبران نے جتنے بھی خط اُسے لکھے وہ اُس کے محبت بھرے پیغام ہی تھے۔ یہ سب خط Beloved Prophet نام کی کتاب میں شامل ہیں۔ پیرس پہنچتے ہی اُس نے میری کو خط میں لکھا:۔

''وہ دن اب دور نہیں جب میں یہ کہنے کے قابل ہو جاؤں گا کہ مجھے فن کار میری پیاری میری ہیسکل نے بنایا۔''

خلیل جبران نے پیرس کے مشہور آرٹ اسکول میں داخلہ لے لیا۔ ایک مرتبہ اُسے دُنیا کے مشہور سنگ

تراش رونداسے ملنے کا موقعہ ملا جس نے اُسے ولیم بلیک کی شاعری پڑھنے کا مشورہ دیا۔ بلیک کو پڑھنے کے بعد جبران نے جو کچھ بھی لکھا یا مصوری کی، اُس میں بلیک کے اثرات صاف نظر آتے ہیں۔ وہیں پر اُس نے نطشے کی کتاب ''تھس سپیک جراتھوسر'' پڑھی اور دیر تک اُس کے سحر میں ڈوبا رہا۔

میری ہیسکل سے ہر ماہ ملنے والے 75 ڈالر اُس کی ضرورتوں سے کہیں زیادہ تھے۔ وہ باقی بچی رقم اپنی بہن میریانہ کو ہر ماہ بھیجنے لگا۔ ایک مرتبہ جبران نے میری ہیسکل کو شکریہ کہتے ہوئے خط لکھا۔ میری نے جواب میں جبران کو لکھا:-

''دولت پر کسی کا بھی حق نہیں ہوتا۔ یہ تو ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ تک جانے کے لئے ہوتی ہے۔ دولت کسی کی ذاتی ملکیت نہیں۔ اِس کے ساتھ ہمارا رشتہ صرف اتنا ہے کہ یہ صحیح ہاتھوں میں اور صحیح کام میں لگے۔ تمہارے شکریہ کے الفاظ پڑھ کر مجھے بے چینی ہوتی ہے۔''

پیرس کے قیام کے دوران میری ہیسکل کے خطوط ہی اُس کی تنہا زندگی کے ساتھی تھے۔ جبران نے ایک خط میں لکھا:-

''میری! میں جب دُکھی ہوتا ہوں تو تمہارے خط نکال کر پڑھنے لگتا ہوں۔ وہ مجھے حقیقت سے روبرو کراتے ہیں۔ مجھے اُن چیزوں سے بچنے سے آگاہ کرتے ہیں۔ جو نہ اچھی ہیں اور نہ خوبصورت۔ پیاری میری ہر شخص کے پاس ایک ایسا ٹھکانہ ضرور ہونا چاہیے جہاں وہ سکون سے پناہ لے سکے۔ میری روح کی تم آخری پناہ ہو جدھر تمہارا احساس ہمیشہ میرے ساتھ ہوتا ہے۔''

6 دسمبر 1908 میں اُس نے اپنی سالگرہ کے موقعہ پر میری ہیسکل کو مخاطب کرتے محبت بھرا مکالمہ لکھا:-

''میری روح کی محبوبہ کیا تمہیں یاد ہے وہ گلستان جہاں ہم اِک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکتے بنا ہلے ڈلے دیر تک کھڑے رہے؟ کیا تم جانتی ہو اس وقت تمہاری آنکھوں نے میری آنکھوں کو کیا کہا تھا؟ اُنہوں نے کہا تھا کہ میرے لئے تمہارا پیار کسی رحم کا محتاج نہیں۔ اُنہوں نے مجھے یہ بھی سمجھایا تھا کہ پیار میں دی خیرات، رحم کھا کے دی خیرات سے کہیں زیادہ عظیم ہوتی ہے۔ وقت اور حالات کی مجبوری سے پیدا ہوا پیار کیچڑ کے پانی جیسا ہوتا ہے۔

میری زندگی کا آغاز تو اُسی روز ہو گیا تھا جس دن ہماری ملاقات ہوئی۔ مجھے یقین ہے کہ میں ضرور

کامیاب ہو جاؤں گا کیونکہ مجھے تم پر پورا یقین ہے۔ میں جانتا ہوں تمہارے ساتھ سے ہی میری ذہانت اُسی طرح سبز ہو جائے گی جس طرح سورج کی زریں شعائیں پھولوں میں چُھپی خوشبو کو پورے گلستان کو مہکا دیتی ہے۔ تمہاری محبت میرے لئے اور آنے والی نسلوں کے لئے ایک شاندار وراثت ہے اس میں نہ کوئی خود غرضی ہے اور نہ ہوس......''

اوہ میری تم میرے لئے خوشی کا ذریعہ ہو۔ اِک دوسرے سے ملنے سے پہلے ہمارے وجود کے کیا معنی تھے؟ یا تو تم میری ماں ہوتی اور میں تمہارا بیٹا یا پھر ہم بہن بھائی ہوتے۔ اگر ہم محبت کی دیوی ''اسٹرا'' اور فن کی دیوی ''منروا'' کے پرستار ہوتے تو ہم خود کو اُن پر قربان کر دیتے۔

تمہاری قربت سے مجھے سکون حاصل ہوتا ہے اور میری روح میں اک ایسی روشنی پھیلنے لگتی ہے جو بہت ہی مختلف، بے مثال اور بے نظیر محسوس ہوتی ہے۔ تمہارا پیار رحم سے پیدا نہیں ہوا۔ مجھے یقین ہے کہ جو خرچ تم میری تعلیم پر کر رہی ہو اس سے تم مجھ پر اپنا حق نہیں جماؤ گی مگر اِس حقیقت کو فراموش بھی نہیں کیا جا سکتا کہ پیسے لینے والا پیسے دینے والے کا قرض دار ضرور ہو جاتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تمہارا دیا پیسہ صرف ایماندار نہیں ہے یہ تو ایک الٰہی انصاف ہے۔ میرے جیسے فن کار کے فن کو نکھارنے کے لئے دی گئی رقم ثواب کا کام ہے، انصاف کا کام ہے تا کہ میرا فن میرا ہنر لوگوں تک پہنچ سکے۔ تمہارا پیار میری روح کی خوشبو سے ساری دُنیا کو مہکا دے گا۔''

جبران پچیس برس کا ہو چُکا تھا اور لافانی ہونے کے خواب دیکھنے لگا تھا۔ مگر اس نے ابھی تک کچھ بھی ایسا تخلیق نہیں کیا تھا جو اُسے عظیم ادیبوں کی قطار میں کھڑا کر سکتا۔ اُس کی پینٹنگز ڈے کے اسٹوڈیوں میں جل کر راکھ ہو چکی تھیں۔ اُس کے بعد کسی نے اُس کی پینٹنگز دیکھی نہیں تھیں وہ جانتا تھا اُس کی منزل ابھی دور ہے اور منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے اُسے بڑی جدو جہد کرنی ہوگی۔ جبران نے اُس سال اپنا جنم دن ماضی، حال اور مُستقبل کا حساب کتاب لگاتے گزار دیا۔

جبران کے دل پر اِس بات کا بوجھ تھا کہ وہ میری سے چھُپ کر مشلین کے ساتھ جسموں کا کھیل کھیل رہا ہے۔ مشلین جب بھی اپنے مُلک فرانس آتی تو جبران سے ملاقات ضرور کرتی۔ اُن دونوں کے درمیان نزدیکی اس حد تک بڑھ چکی تھی کہ وہ جبران پر شادی کے لئے دباؤ ڈالنے لگی۔ مگر جبران شادی کے لئے راضی نہ تھا۔ مشلین کو یہ بات اتنی ناگوار گزری کہ وہ اُس کی زندگی سے رُخصت ہو گئی۔ جبران سوچتا تھا کہ اُن دونوں کے تعلق کے بارے میں میری کچھ نہیں جانتی مگر جبران کی یہ سوچ غلط تھی۔ میری کو اُن دونوں کے رشتے کا پورا علم تھا۔

پیرس کے تین سال کے قیام کے دوران جبران نے روم، برسلس اور لندن کے مشہور نمائش گھر دیکھے اور دُنیا کی شاہکار کتابوں کا گہرا مطالعہ کیا۔مصوری میں بھی کمال حاصل کیا۔

جب جبران پیرس سے امریکہ واپس لوٹنے کے لئے جہاز میں سوار ہوا تو وہ گہری سوچ میں تھا وہاں رہ کر اُسے کسی بات کی فکر نہ تھی۔ اُسے ڈر تھا کہ واپس پہنچتے ہی میری ہیسکل سے ہر ماہ ملنے والے 75 ڈالر بند ہو جائیں گے۔ وہ جانتا تھا میری ہیسکل اُس سے بے حد محبت کرتی ہے اور وہ بھی اُسے چاہتا ہے۔ میری ہیسکل بھی اُس کے جذبات اور خواہشات کے ساتھ ساتھ اُس کی خامیوں اور کمزوریوں سے بھی آشنا تھی۔ دِل کے کسی کونے میں گناہ کا احساس جبران کو پریشان کر رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کاش مشلین سے اُس کے جسمانی تعلقات قائم نہ ہوئے ہوتے تو وہ بھی میری ہیسکل کی پاکیزہ محبت کا صِلہ اُسی پاکیزگی سے دیتا۔ وہ تو چاہتا ہے کہ میری ہیسکل کے سائے تلے رہ کر اپنے فنی کارنامے اور تخلیق جو ہر میری ہیسکل کے نام کر دے۔ اس کو میری ہیسکل جیسی ہم سفر کی ہی ضرورت تھی جو اُس کی محبوبہ بھی ہو دوست بھی گائڈ بھی اور فلسفی بھی۔

بوسٹن پہنچتے ہی جبران میری ہیسکل سے ملنے پہنچا۔ اُس روز میری ہیسکل کا 37 واں جنم دن تھا۔ جبران نے پھولوں کا گلدستہ اُسے پیش کیا تو میری نے گرم جوشی سے اُسے کس کر اپنی بانہوں میں بھر کر پیار سے چوم لیا۔ میری کے پہلے بوسے پر جبران نے بعد میں ایک نظم لکھی ''ورجن میری کا بوسہ''۔

جبران نے میری کو پیرس کی باتیں تفصیل سے سنائیں۔فرانس کے مشہور فنکار، ادیب اور نمائش گھروں کے قصے سنائے۔ اُس کے ذہن میں مسلسل ایک لفظ ٹکرا رہا تھا جو اُس کے لبوں پر آنے کو بے قرار تھا۔ وہ کوشش کر رہا تھا کہ اُس لفظ کو لبوں تک ابھی نہیں آنا چاہیے کیونکہ شائد اُس کا ابھی صحیح وقت نہیں آیا تھا۔ وہ مناسب موقعہ تلاش کرتا رہا۔

گفتگو کے دوران ایسا لمحہ بھی آیا جب دونوں کے درمیان خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ میری ہیسکل کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ جبران نے اچانک میری کا ہاتھ تھام لیا اور اپنے لبوں سے چوم لیا۔ پھر اپنی آنکھیں موند کر میری سے ایسے باتیں کرنے لگا جیسے وہ کوئی پیغمبر ہو:۔

''میری کیا تم میرے ساتھ چلو گی؟''

''کہاں؟'' میری نے حیرت سے پوچھا۔

''جہاں بھی زندگی لے جائے۔''

''کیا تمہارا مطلب شادی سے ہے؟''

''ہاں۔ کیا تم اِس راہ کی آخری منزل تک میرا ساتھ دو گی؟''

''میری عمر میرے آڑے آتی ہے۔''

''میں نے تمہیں پیار کیا ہے اور عمر کا فاصلہ میرے آڑے نہیں آسکتا۔''

''مجھے اِس بارے میں سوچنے کے لئے کچھ وقت چاہیے۔''

اُس روز میری ہیسکل اور جبران کے درمیان جو کچھ بھی ہوا، اُس کے بارے میں میری نے اپنی ڈائری میں لکھا:۔

''جبران نے میرے ساتھ شام گزاری۔ اُس نے مجھے بتایا کہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے اور شادی کرنا چاہتا ہے۔ میں نے کہا کہ میری عمر بیچ میں آرہی ہے اور مجھے یہ ممکن نہیں لگتا۔ اُس نے کہا ''میں جب تمہارے قریب آنے کی کوشش کرتا ہوں تو تم کِسی پرندے کی طرح اُڑ جاتی ہو جدھر میں پہنچ نہیں سکتا۔''

میں نے کہا ''جبران فکر مت کرو میں بھی تمہیں اپنے ساتھ وہاں لے جاؤں گی۔'' پھر میں نے اُسے کہا ''میں چاہتی ہوں کہ ہماری دوستی ہمیشہ قائم رہے اور کوئی رُکاوٹ ہماری دوستی کے درمیان نہ آئے۔'' یہ سب میں نے اُسے اُس وقت کہا جب جبران نے اپنا حالِ دل کھول کر میرے سامنے رکھ دیا۔ ساری رات میں نے بے چینی میں گزاری۔ ایک لمحہ کے لئے بھی میری آنکھ نہیں لگی۔ اگلے روز بھی وہ میرے ساتھ تھا اور میں نے اُسے ہاں کہہ دی۔''

میری ہیسکل کی ہاں سُنتے ہی جبران کو نئی زندگی مل گئی۔ اُس کی خوشی کی انتہا نہ تھی۔ اُس وقت اُسے فلک قریب اور زمین دُور محسوس ہو رہی تھی۔ دوسری طرف میری بہت پریشان تھی۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اُس نے شادی کا فیصلہ اپنی خوشی کے لئے نہیں بلکہ جبران کا دِل رکھنے کے لئے کیا ہو۔ ایک عجیب سی بے چینی اُس کے دِل میں گھر کر گئی تھی۔ آخری فیصلے پر پہنچنے سے پہلے وہ اکیلے میں کہیں دُور جا کر ٹھنڈے دِل و دماغ سے سوچنا چاہتی تھی۔ ایک ہفتے کے لئے وہ کِسی انجان پہاڑی علاقے میں چلی گئی اور بڑے غور و فکر کے بعد اُس نے ڈائری میں لکھا:

''میں جانتی ہوں اب وقت آ گیا۔ جبران اور دُنیا کے درمیان بند دروازے کے کھلنے کا۔ پوری دُنیا اُسے چاہے گی اور وہ بھی اپنا پیار اُن پر قربان کرے گا۔ مجھے لگتا ہے اب سنہری مستقبل اُس کا منتظر ہے۔ میں نے

وہی راستہ چُنا ہے جس کی جانب اللہ کا اشارہ ہے۔ میں سچ کہہ رہی ہوں اُس کی بیوی بننے کے امکانات کو پوری ایمانداری سے تلاش کیا ہے۔ میری جاگتی آنکھوں نے نہ جانے کتنے آنسو اپنے اندر بہائے ہیں۔ یہ آنسو درد کے نہیں اُس خوشی کے ہیں جو میں اُس کے مستقبل کو دیکھ کر بہا رہی ہوں۔ میری عمر ہم دونوں کے درمیان بہت بڑی رُکاوٹ ہے۔ ہماری شادی بہت بڑی غلطی ہوگی۔ پھر میں سوچتی ہوں سوال میری عمر کا بھی نہیں مگر اُس حقیقت کا ہے کہ ایک الگ طرح کا پیار جبران کا منتظر ہے وہ ہے روحانی پیار۔ یہ ہی میرا اُس سے اصل میں محبت کا رشتہ ہوگا۔ اس روحانی رشتے سے ہی اس کی شاہکار تخلیق جنم لے گی جو اسے بھرپور خوشی عطا کرے گی۔ زندگی اُسے مکمل ہونے کا احساس بخشے گی۔ اِس کی تکمیل میں اب دیر نہیں۔ اس کو ایسا پیار دینے میں میں تو صرف ایک ذریعہ ہوں، ایک سڑھی۔ بے شک میری آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے ہیں مگر میں بڑی محبت سے اُس کے بارے میں سوچتی ہوں اُسے چاہتی ہوں مگر اُسے حاصل نہیں کرنا چاہتی۔''

میری اپنی ڈائری میں اپنے احساسات لکھتے ہوئے مسلسل روتی رہی۔ جب میری واپس بوسٹن پہنچی تو اُس نے جبران کو بُلا کر کہا۔

''میرا دِل مجھے ہاں کہنے کو مجبور کرتا ہے مگر میں جانتی ہوں وہ مجھے منانے میں کامیاب نہیں ہو سکے گا۔''

میری کا جواب سُننے کے بعد جبران کے دِل پر جو گزری اُس کا بیان بھی میری کی ڈائری میں درج ہے:۔

''میرا جواب سُن کر وہ رو پڑا۔ میں نے اُسے آنسو پونچھنے کو اپنا رومال دیا۔ وہ کچھ بھی بول نہ سکا۔ جب میں سنبھل سنبھل کر اپنی بات کہہ رہی تھی تو اُس نے روتے ہوئے کہا۔''

''میری تم جانتی ہو میں کچھ بھی کہنے کی حالت میں نہیں ہوں۔'' اِس کے بعد شاید ہی وہ کچھ بولا ہو۔ اُس نے مشرق کے کسی پیغمبر کی طرح ہوا میں اپنا ہاتھ پھیلا کر کہا:۔

''میری مجھے حوصلہ دو۔''

اُس کو اپنی بانہوں کے حصار میں لینے کے لئے میں نے اپنی دونوں بانہیں پھیلا دیں۔ اُسے اپنی بانہوں میں بھر لیا۔ دِل کو سکون نہ ملا تو اُس نے میرے ہاتھوں کو چوما۔ میری آنکھیں بھی برسنے لگیں۔ ان آنسوؤں نے مجھے اُس کے اور قریب کر دیا۔ میں نے اُس کے فنکارانہ ذہین ہاتھوں کو چوما یہ میری دیرینہ خواہش تھی۔ اس سے پہلے میں نے کبھی اُس کو اس طرح چوما نہ تھا۔ میں جانتی تھی کہ میرے ہلکے سے لمس سے وہ بکھر سکتا ہے۔ دروازے تک آتے آتے میں بکھر گئی مگر وہ اب پُر سکون تھا۔ اُس نے اپنے ہاتھوں سے میری آنکھیں پونچھیں اور کہا:

''میری''۔باہر نکلتے صرف یہ الفاظ میرے کانوں میں پڑے۔
''میری آج تم نے مجھے اِک نیا دِل پیش کیا ہے۔''
آنسوؤں سے نم آنکھوں کے ساتھ جب میں بستر پر گئی تو خود کو پُر سکون محسوس کیا۔کمرہ اچانک پُر نور ہو گیا میں اور وہ ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے کھڑے تھے۔خُدا کے آگے سرخم کر کے میں نے کہا:۔
''میرے خُدا تیرا لاکھ لاکھ شُکر یہ۔'' میں یہ ہی لفظ بار بار دوہرا رہی تھی۔میں خوش تھی۔بے شک میں اُسے قربان کر چکی ہوں پھر بھی ہم جُدا نہیں ہوئے ہیں۔حقیقت تو یہ ہے کہ ہم دونوں اِک دوسرے میں سما چکے تھے۔میں نے جو چاہا مجھے مِل گیا۔دو جسم اِک جان ہونے کا احساس۔جسمانی قربت کچھ لمحوں کا ملن ہے مگر روحانی ملن کا رس بے پناہ اور لا محدود ہے۔ہر لمحہ ہم ساتھ ساتھ ہیں۔جو سُنا ہے اُسے سچ بنانے کو دِل کرتا ہے۔محبت کا پاکیزہ جذبہ پیار کرنے والوں کو روحانی بلندیوں تک پہنچا دیتا ہے۔میں جانتی ہوں کہ خُدا کی عبادت میں ڈوبا عبادت گزار ایسے مقام پر آسانی سے نہیں پہنچ سکتا۔
اگلے روز جب جبران مجھے ملا وہ بڑا پُر سکون نظر آرہا تھا۔اُس نے میرے ہاتھوں پر ہاتھ رکھ کر کہا:۔
''میری روحانی سطح کا اٹوٹ بندھن مراقبہ کا سر فہرست ہے۔''
جبران اب بوسٹن میں نہیں رہنا چاہتا تھا۔یہاں سے کہیں دُور چلے جانا تھا۔اُس کی خواہش تھی نیو یورک جانے کی جو اُس وقت فن،ادب اور ثقافت کا مرکز تھا۔اُس نے اپنی خواہش کا اظہار جب میری ہیسکل سے کیا تو اُس نے بھی اپنی رضا مندی دے دی۔جبران کی مناسب رہائش اور اسٹوڈیو کے انتظام کے لئے اس نے 5000 (پانچ ہزار) ڈالر بھی دے دیئے۔جو آج کے دور میں 120000 ڈالر کے برابر ہیں۔
ایک سال بعد جبران نیو یارک کے لئے نکل رہا تھا۔اُس کے کانوں میں میریانہ کی سسکیاں گونج رہیں تھیں،اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور دِل میں میری کی محبت۔جیب میں مختصر سی رقم تھی اور پانچ ہزار ڈالر کا ڈرافٹ۔اُس کے بیگ میں عربی میں لکھے ناول ٹوٹے پنکھ کا مسودہ تھا اور اُس کے ہاتھوں میں تھی جرمن فلسفی نطشے کی کتاب ''دس سپیک جراتھوسترا''۔
ویسٹ ٹینتھ اسٹریٹ کا مکان نمبر 51 پُرانی اینٹوں کا بنا تین منزلہ مکان تھا۔نیو یارک شہر سے باہر ''گرین وچ'' گاؤں کی سرحد پر بنا تھا۔اِس مکان کے چھوٹے سے کمرے میں جبران نے اپنا اسٹوڈیو قائم کر لیا۔یہ کمرہ ہی اُس کا ڈرائنگ روم،بیڈ روم اور باورچی خانہ تھا۔دُنیا سے دُور نئی جگہ پر بیٹھ کر جبران اپنے فن کو تراشنے لگا۔

اُس کی تنہائی کا ایک ہی ساتھی تھا جو اُس کا رہنما بھی تھا وہ تھا نطشے ۔ نیو یارک پہنچتے ہی اُس نے میری ہیسکل کو خط لکھا:۔

''میں اِس بڑے سے شہر میں بالکل اجنبی ہوں ۔ ہر روز مختلف جگہوں پر گھومنے جانا چاہتا ہوں ۔مختلف ہوٹلوں میں کھانا کھانا چاہتا ہوں ۔اس شہر کی انجان گلیوں میں مسافر کی طرح گھومنا چاہتا ہوں ۔''

ایک اور خط میں اُس نے میری کو لکھا:۔

''تمہارا پچھلا خط دیئے کی لو کی طرح تھا،موسیقی کے ذخیرے سے آتے شیریں سُر و کی طرح۔ کیا تم جانتی ہو کہ جلنا کیا ہوتا ہے؟ جل کر آدمی آزاد ہو جاتا ہے۔اپنی پوری طاقت سے تمہیں کہنا چاہتا ہوں کہ میں تمہیں پیار کرتا ہوں ۔ میں تمہیں چومتا ہوں اور پھر تمہیں شب بخیر کہتا ہوں ۔ دروازہ کھول کر گلی میں اپنی تشنہ روح کے ساتھ کہیں کھو جانا چاہتا ہوں ۔مگر میں بار بار لوٹوں گا تمہیں شب بخیر کہنے کے لئے دروازہ کھولنے کے لئے اور باہر جانے کے لئے ۔''

جون 1912 میں جبران بیمار پڑ گیا۔ اُس نے میری کو ایک خط لکھا مگر اُن دنوں میری ہیسکل کسی پہاڑی علاقے میں تفریح کے لئے گئی ہوئی تھی ۔

''میری پیاری میری۔ میں بیمار نہیں ہوں صرف آرام کرنا چاہتا ہوں ۔ میں آنکھیں موند کر اور دیوار کی طرف مُنہ کر کے صرف تمہارے بارے ہی میں سوچوں گا تم جو اِس وقت پہاڑوں کی چوٹیوں کی جانب جاری ہو۔تم سچ میں زندگی کی عاشق ہو۔''

جبران کے اِس خط کے جواب میں میری نے لکھا:۔

''آخر کار میں یہ کہنے کو مجبور ہوں جبران کہ تم میری روح، میرے دِل میں بستے ہو۔ خُدا نے تمہارا دِل مجھے سنبھال کر رکھنے کو دیا ہے۔ محبت کرنے کو دیا ہے میں نے خُدا سے تمہارا دِل اِس لئے مانگا کہ میرا خود کا دِل بہت چھوٹا تھا جس میں تم سما نہیں سکتے تھے نہ ہی شادماں ہو سکتے تھے۔''

موسمِ بہار کی آمد پر میری نے جبران کو ایک خط لکھا:۔

''تم میرے خوابوں میں کب آؤ گے؟ رات کو رات سے بھی زیادہ دلکش بنانے کے لئے ۔ مجھے بتانا آج کل تم کیا لکھ رہے ہو؟'' اِس کا جواب جبران نے دیا:۔

''سب سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے میری کہ بہار ہو یا خزاں، ہم ہمیشہ ہی ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے گھومتے

ہیں۔ اِس خوبصورت دُنیا کے آگے ہم ہاتھ پھیلاتے ہیں خیرات مانگنے کے لئے اور دیکھو زندگی ہے بھی بہت مہربان۔ میری کیا تم جانتی ہو کہ میرے لئے زندگی کے معنی ہی تم ہو۔''

جبران اور میری کے درمیان خط و کتابت کے سلسلے سے یہ واضح ہے کہ دونوں کے بیچ باہمی روحانی حصہ داری تھی۔ دونوں کے دلوں کے تار آپس میں جُڑے ہوئے تھے۔ ایک دوسرے سے دور رہتے ہوئے اُن کو شدت سے اِس بات کا احساس ہوا کہ وہ اِک دوسرے کے لئے کتنے اہم ہیں۔ کسی نے درست فرمایا ہے کہ ''جو دلوں کے پاس ہوتے ہیں وہ کب کوسوں دور ہوتے ہیں۔''

جبران بہت محنت سے اپنے فن پاروں کو نکھارنے میں لگا تھا۔ ۱۹۱۱ء میں اُس کی کتاب ٹوٹے پنکھ منظرِ عام پر آ چکی تھی۔ عربی زبان بولنے والوں میں یہ کافی مقبول ہوئی۔ رات دن محنت کرتے رہنے سے اُس کی صحت بگڑنے لگی تھی۔ جب میری ہیسکل کو اِس کی خبر ہوئی تو وہ پریشان ہو اُٹھی۔ اُس نے جبران کو جو خط لکھا اُس سے ماں کی فکرمندی محسوس کی جا سکتی ہے:-

''تمہاری تخلیق صرف تمہاری کتابوں اور فن پاروں تک ہی محدود نہیں ہے۔ یہ تو تمہاری تخلیقی شخصیت کے کچھ حصے ہیں۔ اصل فن پارہ تو تم خود ہو۔ تم سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں۔ ان دنوں جب تم کچھ بھی تخلیق نہیں کر رہے تو تم بالکل مختلف نہیں ہو جب تم تخلیقی کام کر رہے ہوتے ہو۔ ایسے بانٹنے والی کوئی لکیر نہیں۔ تمہاری طرزِ زندگی تو بس ''پیس آف آرٹ'' ہے۔ میں جانتی ہوں وہ دن ضرور آئے گا جب تمہاری خاموشی سے بھی لوگ تمہاری تحریر پڑھ لیں گے۔ تمہاری زندگی میں آئی تاریکی بھی دوسروں کی راہ روشن کرے گی۔''

میری ہیسکل اور جبران دو جسم ضرور تھے مگر اُن کی جان اِک دوسرے میں بستی تھی۔ وہ اک دوسرے کے بنا ادھورے تھے۔ جبران کی زندگی میں میری ہیسکل کے خطوط کی کیا اہمیت ہے، اس کا اندازہ جبران کے اِس خط سے لگایا جا سکتا ہے:-

''کاش۔ میری میں تمہیں بتا سکتا کہ تمہارے خط کی میری زندگی میں کیا اہمیت ہے؟ وہ میری روح کو روشن کرتے ہیں۔ میں ان کو زندگی کے پیغام سمجھتا ہوں۔ اکثر تمہارے خط اس وقت موصول ہوتے ہیں جب ان کی بے پناہ ضرورت ہوتی ہے۔ میرے دل کے اندر کچھ دن اور جینے کی خواہش بیدار کر دیتے ہیں۔ میرا دِل جب ویران ہوتا ہے تو میں چاہتا ہوں کہ کوئی میرے کانوں میں چپکے سے کہے کہ اِس بے رنگ دِن کے بعد خوش نما مُستقبل تمہارا منتظر ہے۔ یہ یقین تو تم ہی مجھے دلا سکتی ہو۔''

اِس میں کوئی شک نہیں کہ میری ہیسکل کے پاس ذہانت کی حیرت انگیز قوت تھی جس نے جبران کو کبھی پست نہیں ہونے دیا۔ اُمید کی لو ہمیشہ جبران کے دِل و دماغ میں روشن کرتی رہی۔ اِس حقیقت کو جبران نے قبول کرتے ہوئے میری ہیسکل کو خط میں لکھا:۔

''میری تم میرے لیے زندگی کی سب سے بڑی رحمت ہو۔ تم نے ہی مجھے یہ زندگی بخشی ہے۔ اسے قدرت کا معجزہ ہی کہا جاسکتا ہے۔''

میری ہیسکل نے نہ صرف اُس کی زندگی کی باگ ڈور سنبھالی بلکہ اُس کی انگریزی میں چھپی کتابوں کی ادارت بھی کی۔

''بروکن ونگز'' (1912)، ''آ ٹیر اینڈ آ سمائل (1914)، دا میڈ مین'' (1918)، دا پروسیشنز (1918)، ''دا فورنر (1920)، ایسی یادگار کتابیں لکھنے کے بعد جبران کو محسوس ہونے لگا کہ وہ جو کچھ کہنا چاہتا ہے وہ اب تک کہہ نہیں سکا۔ آخر کار، اُس نے 1923 میں شاہکار کتاب پیغمبر تخلیق کی۔ یہ کتاب جبران اور میری ہیسکل کی روحانی محبت کی لافانی اولاد ہے۔ پیغمبر کا المصطفیٰ کوئی اور نہیں جبران خود ہے۔ وہ پیار کو ایسا عنصر مانتا ہے جو انسان کو انسان سے جوڑتا ہے۔ اُسے کائنات سے جوڑتا ہے۔ پیار ہی خُدا ہے۔ پیار ہی واحد حقیقت ہے اور پیار میں کوئی امتیاز نہیں۔ المصطفیٰ کے قول ہیں:۔

— جب تم خدا سے محبت کرتے ہو تو یہ مت کہو کہ خُدا میرے دِل میں ہے بلکہ یہ کہو کہ میں خُدا کے دِل میں ہوں۔
— جو شخص خُدا کے دِل میں رہتا ہے وہ بھلا کس سے دُشمنی کرے گا؟
— محبت کا اشارہ ملتے ہی اُس کا پیچھا کرو، بے شک راستہ کتنا ہی دُشوار کیوں نہ ہو۔
— جب محبت تمہیں اپنے پروں میں لپیٹے تو اُس سے لپٹ جاؤ۔
— محبت خود کے علاوہ اور کچھ نہیں دیتی۔ اگر وہ کچھ لیتی ہے تو خود سے لیتی ہے۔

پیغمبر کے محبت کے لئے جو جذبات اور احساسات ہیں وہ خود جبران کے ہیں جس کو اُس نے میری ہیسکل کی بے لوث اور بے انتہا محبت پانے کے بعد محسوس کیا۔

''پیغمبر'' کتاب کے چھپنے کے بعد میری ہیسکل بوسٹن سے چلی گئی اور سوانا ہ جارجیا میں رہائش پذیر ہوئی۔ وہاں اُس کی ملاقات کرنل جیکب فلورنس سے ہوئی۔ اُس کی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا اور میری ہیسکل سے عمر

میں پانچ برس بڑا تھا۔ دونوں ہی ادھیڑ عمر کی دہلیز پر کھڑے تھے۔ اُس وقت میری کی عمر پچاس سال تھی دونوں نے ایک ساتھ زندگی گزارنے کا فیصلہ کرلیا۔ کرنل سے شادی کرنے سے پہلے میری ہیسکل نے جبران سے اجازت ضرور لی تھی اور اُس کی رضامندی کے بعد ہی میری نے کرنل سے 1926 میں شادی کر لی۔

میری ہیسکل کو اس بات کا اندازہ نہیں تھا کہ کرنل جبران سے نفرت کرتا ہے اُسے بالکل پسند نہیں کرتا۔ اگر اُسے اِس بات کا ذرا سا بھی علم ہوتا تو وہ شادی کے لئے قطعی راضی نہ ہوتی۔ مگر قسمت کے لکھے کو کون ٹال سکتا ہے۔ خلیل جبران کی صحت تو 1921 کے بعد مسلسل بگڑ رہی تھی مگر اُس نے اپنی بیماری کو کبھی بھی سنجیدگی سے نہیں لیا۔ مریض کی طرح بستر پر پڑے رہنا اُسے کسی سزا سے کم نہیں لگتا تھا۔ خراب صحت کے باوجود وہ مسلسل لکھتا بھی رہا اور مصوّری بھی کرتا رہا۔ اُس کی تین کتابیں ''سینڈ اینڈ فوم'' (1927-1926) جیجس داس آف مین (1928) اور ارتھ گوڈز (1931) میں شائع ہوئیں۔ ان کتابوں کی ادارت بھی میری ہیسکل نے ہی کی۔ وہ یہ کام کرنل سے چھپا کر کرتی تھی۔ رات کو جب اُس کا شوہر گہری نیند سو جاتا تھا تو وہ اُٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی جاتی اور جبران کے مسوّدے کو دیکھتی۔ 1931 کے شروع میں جبران نے اپنی کتاب ''واڈرر'' کا مسودہ میری کو بھیجا۔ اِس کتاب کے بعد وہ اپنی اگلی کتاب ''دا گارڈن آف دا پروفیٹ'' پر کام شروع کر دیا۔ یہ اُس کی آخری کتاب تھی جو اُس کے انتقال کے بعد شائع ہوئی۔ جبران کا انتقال 10/اپریل 1931 میں نیویارک کے سینٹ ویسٹ اسپتال میں ہوا۔ اُس کے آخری وقت میں اُس کا دوست میکائیل نعیمی وہاں موجود تھا۔ نعیمی نے اپنی کتاب ''خلیل جبران۔ سوانح'' میں لکھا ہے:۔

''جبران جب اپنی زندگی کی آخری سانسیں لے رہا تھا تو اُس وقت میرے ذہن میں المصطفیٰ کے وہ الفاظ گونج رہے تھے جو اُس نے وسیع سمندر میں گُم ہوتی بوند کو کہتے سُنا تھا۔

''بس۔ ندی اب ایک اور موڑ لے گی بس۔ ایک لہر اور اُٹھے گی اور میں ایک بوند اُس وسیع سمندر سے مل کر سمندر بن جاؤں گی۔''

اِس کے علاوہ ارفلیز کے باشندوں کے سامنے المصطفیٰ کے آخری الفاظ تھے:۔

''کچھ پل ہوا کے دوش پر آرام کرنے کے بعد میں پھر کسی ماں کی کوکھ میں جنم لوں گا۔''

میرینہ اپنے عزیز بھائی کے مردہ جسم کو بوسٹن لے گئی۔ میری ہیسکل لمبا سفر طے کرکے بوسٹن پہنچی اپنے محبوب کو الوداع کہنے کے لئے۔ وہ بہت خاموش پُرسکون اور سنجیدہ نظر آ رہی تھی۔ وہ جبران کے دوست میکائیل نعیمی سے

ایسے باتیں کر رہی تھی جیسے جبران زندہ ہو۔ جبران میری ہیسکل کے لئے ہمیشہ ''حال'' ہی بنا رہا۔ وہ ہمیشہ اُس کے ہمراہ رہا۔ اُن کا رشتہ قبر کی حدوں تک محدود نہیں تھا یہ رشتہ اُس سے کہیں دُور کا تھا۔

جبران نے اپنے اسٹوڈیو میں رکھی سبھی تصویریں، کتابیں، فن پارے، مسودے اور جو کچھ بھی وہاں موجود تھا سب میری ہیسکل کے نام اپنی وصیت میں لکھ دیے تھے۔ میری کو جبران کے اسٹوڈیوں میں کچھ فن پارے، کچھ مسوّدے اور اِس کے علاوہ خطوط کا ایک پلندہ بھی ملا۔ یہ وہ خط تھے جو پچھلے 25 سالوں میں اُن دونوں نے اِک دوسرے کو لکھے تھے۔ سارے سامان کو اُس نے دو صندوقوں میں بند کر کے اُنہیں تالا لگا دیا۔ اُس نے جبران کی سکریٹری بار برا ینگ کو اسٹوڈیو میں پڑے سامان کی نگرانی رکھنے کی ہدایت دی۔ بار برا ینگ جو جبران کے آخری دنوں میں اُس کے بہت قریب آ گئی تھی جب اُسے جبران کے انتقال کے بعد پتہ چلا کہ صرف میری ہی اُس کی محبوبہ تھی تو حسد سے وہ جل اُٹھی۔ اُس نے جبران اور میری کے خطوط کو بھی جلانے کی ناکام کوشش کی۔ یہ سبھی خطوط اور میری ہیسکل کی ڈائری ''بیلوڈ پروفیٹ'' نامی کتاب میں شامل ہیں۔ یہ کتاب 1972 میں منظرِ عام پر آئی۔ یہ کتاب جبران اور میری کے بیش قیمتی رشتے کی تاریخی دستاویز ہے۔

بار برا ینگ حسد کی وجہ سے ذلالت پر اُتر آئی اور اُس نے جبران کی کتاب ''دا وانڈرر'' جو میری ہیسکل نے ترمیم کی تھی اُسے جلا دیا اور بنا پروف ریڈنگ والا مسودہ شائع کروا دیا۔ میری نے جب جبران کے سامان کی تلاشی لی تو اُس میں ''وانڈرر'' اور ''دا گارڈن آف دا پروفیٹ'' کتابیں گُم تھیں۔

میری ہیسکل نے اپنے روح کے ساتھی سے بچھڑ کر 33 سال گذارے اور وہ 9 اکتوبر 1964 میں 93 سال کی عمر میں اِس دُنیا سے رُخصت ہوگئی۔ وہ سوانا جارجیا کے قبرستان اور جبران اپنے گاؤں بشریٰ کے مارساکینز کی پاک زمین میں ابدی نیند سوئے ہوئے ہیں۔ مگر وہ دونوں ''پیغمبر'' میں زندہ اور جاوید ہیں المصطفیٰ اور المترٰ کی صورت میں۔

خزانے کا نقشہ

مصری کہانی : ڈاکٹر حنان لاشین ________________ مترجم: سماح حسن حامد (مصر)

آخر کار گرمیوں کی چھٹیوں کا آغاز ہوگیا۔ یوسف بہت خوش تھا، اسی طرح اس کا بھائی عبدالرحمٰن بھی بہت خوش تھا۔ امتحانات کے دوران وہ دونوں بہت تھک چکے تھے؛ اور اب ان کو ایک طویل آرام کی ضرورت تھی۔

ان کی والدہ نے اس سال چھٹیوں کو نمایاں بنانے کا فیصلہ کیا۔ انھوں نے گرمی کی سرگرمیوں کا شیڈول یوں تیار کیا:

وہ کلب میں تیراکی کی مشق کرنے جائیں گے تاکہ مہارت سے تیر سکیں۔ وہ اپنے دفاع کے لئے کراٹے سیکھیں گے۔ اور دونوں میں سے ہر ایک روزانہ ایک نئی کہانی پڑھے گا۔ اور یقیناً وہ مسجد میں استاذ کے پاس قرآن کریم کی نئی آیات بھی حفظ کریں گے۔

اور انہوں نے گھر کے اندر بھی قسمت آزمائی کے کاموں سے پُر تفریحی ماحول پیدا کرنے کے لئے کچھ دوسری سرگرمیوں پر ان دونوں کے ساتھ اتفاق کیا۔

انھوں نے بچوں کو بتایا کہ وہ روزانہ اس کھوئے ہوئے خزانے کو تلاش کرنے کے لیے انھیں نقشہ بنا کر دیں گی، جو مزیدار مٹھائیوں، کھلونوں اور سرپرائز سے پر ایک صندوق ہوگا، بشرطیکہ وہ ہر روز خزانہ کی تلاش کے دوران اپنے کمرے، اپنے سامانوں اور کھلونوں کو قرینے سے رکھیں گے ورنہ وہ انہیں (جمعے کا وہ تحفہ) نہیں دیں گی؛ جو ان کے والد پورے ہفتے ان کے اچھے اخلاق کے صلے کے طور پر ہر ہفتے ان کے لیے لاتے ہیں۔

یوسف جلدی سے اٹھا۔ اور منہ دھونے، وضو کرنے اور نماز پڑھنے کے بعد وہ نماز کے اس درخت کے پاس گیا جسے اس کی والدہ نے اس کے لیے اس کی الماری پر لٹکا رکھا تھا۔ اور وہ ایک ایسے نئے درخت سے عبارت تھا جسے وہ ہر ہفتے اس کے لئے ڈرائنگ کرتی تھیں۔ ہفتے کے دنوں کے اعتبار اس کی سات شاخیں ہوتیں، اور ہر شاخ میں پانچ بڑے بڑے پتے ہوتے۔ اور جب یوسف نماز پڑھ لیتا تو ان میں سے ایک پتے کو سبز رنگ سے رنگ دیتا، اور جب ہفتہ ختم ہو جاتا اور سارے پتے سبز ہو جاتے تو وہ یا تو تحفہ لیتا یا اس کی والدہ اس کے لئے اچھی اور لمبی دعائیں کرتیں۔ لیکن اس بار اس نے زرد رنگ کو اس لیے لیا کہ وہ اپنے والدین کے ساتھ طلوع آفتاب سے پہلے نہیں اٹھ سکا تھا، اور افسوس کہ اس کی نماز فجر قضا ہو چکی تھی۔ اس لیے اس نے پتے کو زرد کر دیا۔ عبدالرحمٰن نے اسے دور

سے دیکھا اور محسوس کیا کہ وہ صبح کی نماز کے پتے کو پیلے رنگ سے رنگنے کی وجہ سے افسردہ ہے، چنانچہ اس نے یوسف سے کہا: " صبح بخیر یوسف، اداس نہ ہو، میرے پاس بھی ایک پیلا پتہ ہے کیوں کہ میں بھی کل صبح کی نماز کے لیے وقت پر نہیں اٹھ سکا تھا"۔

یوسف اپنے بھائی کے بستر سے قریب ہوا اور بولا: " چلو عبدالرحمٰن! اٹھو خزانہ تلاش کریں!"

" ٹھیک ہے یوسف۔ مجھے ایک منٹ دو! اور میرے آنے تک تم ایک گلاس دودھ پی لو! کیونکہ جیسا کہ ہم نے اتفاق کیا ہے ہم کبھی بھی اپنی ماں کو ناراض کرنا نہیں چاہیں گے!"۔

یوسف پُر جوش ہو کر بولا: جب تم سو رہے تھے اسی وقت میں نے دودھ پی لیا تھا۔ اور میں نے ان کا وہ پیغام بھی پڑھا جو باورچی خانے میں دودھ کی پیالی کے پاس ایک چھوٹے سے لفافے میں رکھا تھا۔ عبدالرحمان اپنے بستر پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ یوسف کی طرف دیکھا اور بڑی دلچسپی سے اس سے پوچھا: "اور اس میں کیا لکھا تھا؟"

یوسف نے سوچتے ہوئے جواب دیا: " کوئی چیز جو پورے دن چلتی رہتی ہے اور بالآخر اسی جگہ پر واپس آ جاتی ہے اور پھر دوبارہ چل پڑتی ہے اور کبھی تھکتی نہیں"۔

عبدالرحمان نے اپنے بستر سے چھلانگ لگائی اور بولا: " بس چند منٹ رکو! میں آتا ہوں پھر ہم ایک ساتھ اس کو تلاش کریں گے"

یوسف نے جوش میں چیخا: " چلووو"

چند منٹوں بعد، وہ دونوں گھر میں چکر لگا رہے تھے۔

یوسف نے ایک مُحدّب شیشہ لیا، اور سر پر ٹوپی پہنی گویا وہ خفیہ انسپکٹر ہو۔ اور عبدالرحمٰن نے اپنے ہاتھ اپنی پشت پر باندھے اور چل پڑا، وہ چلتے چلتے ہر چیز کا جائزہ لیتا، اسے حرکت دیتا اور اس کے نیچے جھانک کر دیکھتا، پھر تفتیش کاروں اور معائنہ کاروں کی طرح باوقار انداز میں اپنے ہاتھ پشت پر باندھ لیتا۔

بہت تلاش کے بعد بھی جب انھیں دوسرا پیغام نہیں ملا تو عبدالرحمان نے تلاش بند کر دی اور اپنے بھائی سے کہنے لگا: " تمہارا کیا خیال ہے، وہ جوتا تو نہیں ہے''؟

یوسف نے جواب دیا: " مجھے نہیں لگتا، جوتا اسی جگہ واپس نہیں آتا؛ بلکہ ہم جوتے کے ساتھ مختلف جگہوں پر حرکت کرتے ہیں، اسی طرح ہم پورے دن چلتے بھی نہیں، ہم ٹھہرتے بھی ہیں، بیٹھتے بھی ہیں اور سوتے بھی ہیں، اور ہم اسے سارے دن پہنے بھی نہیں رہتے،

نہیں، نہیں، وہ جوتا نہیں ہے"۔

عبدالرحمٰن نے کہا:" مجھے پتا چل گیا، یہ گھڑی کی سوئی ہے۔ تک۔۔۔۔ تک۔۔۔تک۔۔تک"

یوسف نے تالیاں بجائیں اور بولا:" شاباش عبدالرحمان، تم کتنے ذہین ہو"

وہ دیوار پر لٹکی گھڑی کی طرف متوجہ ہوئے اور اسے بہت احتیاط سے حرکت دی تو اس کے پیچھے سے ایک چھوٹا سا سفید لفافہ گرا۔ جو واقعی دوسرا پیغام تھا۔

عبدالرحمٰن نے بلند آواز سے پڑھا اور کہا: "وہ منہ کو صاف کرتی ہے، پروردگار کی خوشنودی کی باعث ہے، سنت نبوی ہے، اور اس کی خوشبو اچھی ہوتی ہے"

یوسف نے مسکرا کر پر اعتماد لہجے میں کہا:" یقیناً یہ مسواک ہے، اور یہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ آؤ چوبی ڈبہ کھولیں جس میں امّی جان مسواکیں رکھتی ہیں۔"

دونوں بھائی ڈبے کے قریب پہنچے، اسے کھولا، اور مسواک کی اچھی خوشبو سے لطف اندوز ہونے لگے۔ اور وہاں واقعتاً تیسرا پیغام موجود تھا۔

اب یوسف کی باری تھی، جس نے اسے کھولا اور پڑھا:" قرآن مجید کی نازل ہونے والی پہلی آیت"

عبدالرحمٰن چیخ اٹھا:" اِقرأ (پڑھو)، اِقرأباسم ربک (اپنے رب کے نام سے پڑھو)، یہ سورۃ العلق میں ہے۔"

یوسف نے کہا: آؤ اپنے کمرے کی دیوار پر لٹکی ہوئی اس تختی کے پیچھے تلاش کریں، جس پر "اقرا" لکھا ہوا ہے۔"

اور واقعی ان کے کمرے میں لٹکی ہوئی تصویر کے پیچھے چوتھا پیغام موجود تھا۔ جس پر خوبصورت عربی رسم الخط میں آیت اقراء (پڑھو) لکھا ہوا تھا.

عبدالرحمٰن نے اسے کھول کر پڑھا:" جو شخص ان میں سے سات سے ناشتہ کرے گا، اس دن اسے کوئی چیز نقصان نہیں پہنچائے گی"

یوسف نے اپنے بھائی کی طرف دیکھا اور اس سے پوچھا:"اس سے امی کا کیا مطلب ہے؟ کیا اس کا مطلب سات گلاس دودھ ہے؟"

عبدالرحمٰن نے جواب دیا:" نہیں، نہیں یوسف! اس کا مطلب کھجور ہے۔ میں نے ابا کو امی سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کے بارے میں بتاتے ہوئے سنا۔ جس میں آپ نے فرمایا: ’’جو شخص ہر دن صبح

سات عجوہ کھجور کھالے تو اس دن اس کو نہ تو کوئی زہر نقصان پہنچائے گا اور نہ جادو۔"

(اس حدیث کی روایت بخاری اور مسلم نے کی ہے)

تو آؤ باورچی خانے میں کھجوروں کی اس تھیلی میں تلاش کریں جسے کل ابا ہمارے لیے لیکر آئے تھے۔

دونوں بھائی باورچی خانے گئے۔اور کھجور کی تھیلی بہت احتیاط سے کھولی تاکہ کھجوریں دب کر خراب نہ ہو جائیں۔اور واقعی وہاں پانچواں پیغام تھا۔ جسے ماں نے ایک چھوٹی سی مربع شکل میں لپیٹ کر کھجور کے دانوں کے درمیان چھپا دیا تھا۔ دونوں بھائی خوش تھے کیونکہ دونوں کو ہی کھجوریں پسند تھیں۔اور انھوں نے سات مزیدار کھجوریں کھائیں کیونکہ وہ تلاش وجستجو کرتے کرتے تھک چکے تھے اور اب انھیں از سر نو توانائی کی ضرورت تھی۔ پیغام پڑھنے کے بعد جس میں لکھا تھا:" کھجور کھانے کے بعد میرے موبائل پر مجھے کال کرنا" انھوں نے تھیلی کو پہلے کی طرح دوبارہ مضبوطی سے بند کر دیا اور ہر چیز کو اس کی جگہ پر واپس رکھ دیا۔

وہ اس پیغام پر بہت ہنسے؛ کیونکہ ان کی والدہ جانتی تھیں کہ وہ کھجوریں ضرور کھائیں گے۔

عبدالرحمٰن نے فون اٹھایا اور اپنی والدہ کو فون لگا کر محبت اور ادب سے بولا:"السلام علیکم امی جان، آپ کیسی ہیں؟"

ماں نے خوش ہو کر جواب دیا:"وعلیکم السلام میرے پیارے بیٹے۔ اچھا تو تم کو پانچواں پیغام مل گیا؟"

عبدالرحمٰن نے کہا:"جی امی، ہمیں وہ مل گیا ہے اور ہم نے کھجوریں بھی کھالی ہیں۔"

ماں نے جوش میں کہا:" چلو! پانچویں پہیلی سنو: دو کلمے ایسے ہیں جو زبان پر ہلکے ہیں، میزان میں وزنی ہیں، رحمٰن کو محبوب ہیں، بتاؤ وہ کیا ہیں؟"

عبدالرحمٰن نے تھوڑا سوچا لیکن اس کو جواب نہیں ملا۔تو اس نے اپنی والدہ سے کہا؛ جو فون پر اس کے جواب کا انتظار کر رہی تھیں:"امی، کیا میں اپنے دوست سے پوچھ سکتا ہوں، پھر واپس آ کر تھوڑی دیر بعد آپ کو فون کرتا ہوں"؟

ماں نے کہا:" ٹھیک ہے پیارے"

عبدالرحمٰن نے ماں کو سلام کرنیکے بعد فون بند کر دیا۔اور اس نے پہلے اپنے سگے بھائی یوسف سے پوچھنے کا فیصلہ کیا، اس امید میں کہ شاید اسے جواب معلوم ہو۔

وہ اس کے بازو میں بیٹھا اور کہا:"دو کلمے ایسے ہیں جو زبان پر ہلکے ہیں، میزان میں وزنی ہیں، رحمٰن

کو محبوب ہیں، بتاؤ وہ کیا ہیں؟

یوسف نے کچھ دیر سوچا اور اپنے بھائی سے کہا:"مجھے معلوم تو نہیں ہے، لیکن ہوسکتا ہے کہ (احبک فی اللہ) میں تم سے اللہ کے لئے محبت کرتا ہوں، ہو، یا (جزاک اللہ خیرا) اللہ تم کو جزائے خیر دے، ہو، یہ سب اچھی باتیں ہیں، کیونکہ اللہ اچھا ہے اور ہر اچھی بات کو پسند کرتا ہے۔

عبدالرحمٰن نے اس کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے سر ہلایا، پھر بولا:"امی نے مجھے اپنے کسی دوست سے پوچھنے کی اجازت بھی دی ہے۔تمہارا کیا خیال ہے ہم اپنے چچا زاد بھائی محمود سے رابطہ کریں اور اس سے پوچھیں؟، کیونکہ وہ ہم سے بڑا ہے، وہ اس کا جواب ضرور جانتا ہوگا؟"

یوسف فورا راضی ہوگیا اور دونوں نے اسی وقت محمود کو فون کیا۔ اور اس نے انہیں فوراً جواب بتا دیا: پیارے بھائیو!"وہ دو کلمے سبحان اللہ وبحمدہ اور سبحان اللہ العظیم ہیں۔تم اسے رات دن زیادہ سے زیادہ پڑھا کرو۔ میرے والد نے مجھے اسی طرح سکھایا ہے۔

عبدالرحمٰن بہت خوش ہوا اور اس نے محمود کا شکریہ ادا کیا، کیوں کہ اس نے اسے یہ قیمتی خزانہ بتایا تھا، ڈھیر سا شکریہ ادا کرنے کے بعد اس نے رسیور رکھا اور اپنے بھائی کی طرف متوجہ ہوکر اسے جواب بتایا۔ پھر کہنے لگا: "اب ہمیں گھر میں کوئی ایسی چیز تلاش کرنا ہوگی جس کا ان دونوں کلمات سے ربط وتعلق ہو، یوسف! میرے ساتھ سوچو"

ان دونوں نے سوچنے والی ٹوپی پہنی، جسے وہ سوچتے وقت پہنا کرتے تھے، یوسف کی ٹوپی سرخ تھی، جبکہ عبدالرحمٰن کی ٹوپی نیلی تھی۔

یوسف اور عبدالرحمٰن دونوں سوچتے رہے۔ بالآخر انھیں یاد آیا کہ ان کے والد کے کمپیوٹر پر ایک تصویر ہے جس پر (سبحان اللہ وبحمدہ، سبحان اللہ العظیم) لکھا ہے۔

وہ تیزی سے والد کی میز کے پاس آئے، اور کمپیوٹر کا بٹن دبایا۔ کیونکہ ان کے والد نے انھیں اجازت دے رکھی تھی کہ جب وہ کام پر رہیں تو یہ ان کا کمپیوٹر استعمال کر سکتے ہیں کیونکہ انھیں معلوم تھا کہ یہ اس کی حفاظت کرتے ہیں اور ان کی فائلوں میں چھیڑ چھاڑ نہیں کرتے۔ اچانک انھیں چھوٹا پیغام کمپیوٹر اسکرین پر لکھا ہوا ملا۔ جسے ان کی والدہ نے کام پر جانے سے پہلے لکھا تھا۔ اور اس میں یہ تھا:"اب جاؤ، اپنے بستر ٹھیک کرو، اور اپنے کپڑے لٹکا دو، اور کھلونوں کو ڈبے میں جمع کر دو"

یوسف اور عبدالرحمٰن دونوں ہنس پڑے، وہ جلدی سے اپنے کمرے میں پہنچے اور اپنے بستر درست کرنے لگے۔ اور جب وہ اپنے بستر ٹھیک کر رہے تھے تو دونوں کو اپنے اپنے تکیے کے نیچے ایک ایک پیغام ملا۔ یہ ساتواں اور آٹھواں پیغام تھا۔

دونوں بھائی بہت خوش ہوئے۔ کیونکہ وہ خزانے کے قریب ہو رہے تھے۔ ان میں سے ہر ایک نے اپنا پیغام کھولنا شروع کیا۔

عبدالرحمٰن کا پیغام ساتواں تھا۔ اور اس میں لکھا تھا:

"تم میں سے کوئی اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا یہاں تک کہ" ...

اور یوسف کا پیغام آٹھواں تھا۔ اور اس میں لکھا تھا: "۔۔۔ وہ اپنے بھائی کے لیے وہی پسند کرے جسے وہ خود اپنے لئے پسند کرتا ہے"۔

دونوں بھائیوں نے دونوں پیغامات ایک دوسرے کے بازو میں رکھے، اور ان کو ایک ساتھ پڑھا، اور وہ اس وقت مسکرا اٹھے جب ان کو وہ حدیث نبوی یاد آئی، جو ان کے والد نے انہیں بتائی تھی۔ اور جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے: "تم میں سے کوئی اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا جب تک وہ اپنے بھائی کے لئے وہی پسند نہ کرے جو وہ خود اپنے لیے پسند کرتا ہے"۔

دونوں بھائی کمپیوٹر کی طرف واپس گئے اور حیران و پریشان کھڑے ہوئے۔

اے اللہ! نواں پیغام کہاں ہے؟، اور دسواں پیغام بھی کہاں چھپا ہوا ہے؟، ان کی والدہ نے انہیں بتایا تھا کہ وہ کل دس پیغامات ہیں۔

وہ اپنے کمرے کے بیچ میں حیرانی و پریشانی میں سوچتے رہے۔

یوسف نے کہا: "کیا امی نے ہمیں نہیں بتایا تھا کہ وہ نقشہ بنائیں گی! نقشہ کہاں ہے؟، ہوسکتا ہے کہ باقی دو پیغامات میں ایک وہی ہو"

عبدالرحمٰن نے کہا: "ایسا لگتا ہے کہ باقی حصہ دلچسپ ہوگا، یوسف۔ آؤ مل کر نقشہ تلاش کریں۔ اور لائبریری سے شروع کریں، امی نے نقشے کو کہانیوں کے درمیان ہی چھپایا ہوگا۔ وہ دونوں جوش و خروش کے ساتھ تیزی سے لائبریری پہنچے۔ اور عبدالرحمٰن یکے بعد دیگرے کہانیاں نکالتا رہا، اور ان کے صفحات کے درمیان تلاش کرتا رہا، اور پھر یوسف کو دیتا رہا تا کہ وہ اسی نظام کے ساتھ انھیں ان کی جگہوں پر واپس رکھ دے۔ اور

بالآخر باریک بینی سے تلاش کے بعد انہیں نقشہ مل گیا۔

نقشہ آسان بنایا گیا تھا۔ اور اس پر کچھ اشارے اور کٹے ہوئے حروف بھی بنائے گئے تھے۔ ماں نے چاروں کمروں، گھر کے ہال اور باورچی خانے کی طرف جانے والی گزرگاہ تک کا نقشہ بنایا تھا، اور ایک کمرے کے کونے میں ایک بڑا سا نشان بھی بنایا تھا۔

یوسف نے چیخا: "یہ میرا بستر ہے، خزانہ میرے بستر کے نیچے ہے"

دونوں بھائی کمرے کی طرف دوڑے، اور یوسف اترا اور بستر کے نیچے مہارت سے پیٹ کے بل رینگ گیا، اور اس کے نیچے سے لکڑی کا ایک خوبصورت ڈبہ کھینچا، اس نے اسے کھینچنے کی کوشش کی، لیکن یہ ڈبہ بھاری تھا، اس لئے اس نے عبدالرحمٰن کو بلایا تا کہ جب وہ ڈبے کو پکڑے تو وہ اس کا پیر پکڑ کر اسے کھینچے۔ عبدالرحمٰن نے اپنے بھائی کے پاؤں پکڑے اور پیچھے کی طرف لوٹتے ہوئے ان کو کھینچنے لگا۔ یوسف نے ڈبے کو اچھی طرح پکڑ رکھا تھا تا کہ وہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ نہ جائے۔

بالآخر دونوں بھائی بستر کے نیچے سے ڈبہ نکالنے میں کامیاب ہو گئے۔ اور فرط خوشی سے انہوں نے تالیاں بجاتے ہوئے متعدد بار ہوا میں چھلانگ لگائی۔

عبدالرحمٰن نے کہا: "بالآخر ہمیں خزانہ مل ہی گیا"

لیکن اچانک ان کا دماغ ایک اہم چیز کی طرف گیا۔

ڈبے کی چابی کہاں ہے؟

دونوں بھائیوں نے اسے ہر جگہ تلاش کیا، اور ان کی پریشانی اور حیرت بڑھتی گئی۔ فوراً یوسف کو کچھ یاد آیا اور اس نے اپنے بھائی سے کہا: "صرف ایک ہی پیغام بچا ہے۔ اس میں ہمیں یہ ضرور بتایا گیا ہوگا کہ چابی کہاں ہے، آؤ کسی دوسری جگہ تلاش کریں۔

عبدالرحمٰن نے کچھ دیر سوچا، پھر اپنے بھائی سے کہا: "پیغامات نہ تو دروازوں کے پیچھے ہیں، اور نہ ہی ہمارے کپڑوں کی درازوں میں ہیں، حتی کہ کوٹوں کی جیبوں اور اسکول کے تھیلوں میں بھی نہیں ہیں، اور ہم کہانیوں کے درمیان تو ڈھونڈ ہی چکے ہیں۔

چابی کہاں ہے؟ کہاں ہے!"

یوسف نے چیخا: "آؤ نامانوس جگہوں پر تلاش کریں۔ مثلاً صوفے کے نیچے، ریفریجریٹر کے اندر، یا ٹی وی کے اوپر"

عبدالرحمٰن نے اپنی شہادت کی انگلی اور انگوٹھے سے چٹکی بجائی، پھر خوش ہو کر کہا: "بہت اچھا خیال ہے، شاباش یوسف'

دونوں بھائیوں نے ان جگہوں پر تلاش کرنا شروع کیا۔، درازوں کے اندر، قالینوں کے کناروں کے نیچے اور کھلونوں کے درمیان، اور ...اور ...؛ اور کتنی غیر متوقع بات تھی کہ بالآخر انھیں دروازے کے پیچھے لٹکے ہوئے یوسف کے کوٹ کی جیب میں چابی ملی۔

یوسف اور عبدالرحمٰن بہت ہنسے، اور پھر دونوں ایک ساتھ اس کمرے کی طرف تیزی سے دوڑے جہاں لکڑی کا ڈبہ تھا، اور اس کی چابی کو لاک میں ڈال کر گھمایا تو با آسانی سے کھل گیا۔

اس کے اندر بہت سارے سرپرائز، کھلونے، کہانیاں، مٹھائیاں بسکٹ اور چاکلیٹ تھے، لیکن۔۔۔، انہوں نے یہاں ایک عجیب وغریب چیز دیکھی!

وہاں تمام لذیذ مٹھائیوں کے صرف ایک ایک ٹکڑے ہی تھے،

یہاں دونوں بھائیوں نے فوراً ہی اپنی والدہ کا دسواں اور آخری پیغام سمجھ لیا۔ جس کو انہوں نے لکھا نہیں تھا، اور پھر ڈبے میں موجود تمام چیزیں آپس میں تقسیم کیں۔ اور اندر سے نکالی جانے والی ہر چیز کو آدھا آدھا بانٹتے گئے۔

عبدالرحمٰن نے مزیدار چاکلیٹ کھاتے ہوئے اپنے بھائی کی طرف دیکھ کر کہا: "اپنے بھائی کے لیے وہی پسند کرو"..

یوسف مسکرایا، اور مزیدار مٹھائیاں کھاتے ہوئے اپنے بھائی کی طرف دیکھ کر کہا:

"جو تم اپنے لئے پسند کرتے ہو۔۔۔"

آخر دونوں بھائیوں نے خزانہ دریافت کر لیا۔

وہ دونوں ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے، اور اس کے لئے وہی پسند کرتے جو وہ اپنے لئے پسند۔ کرتے۔

اسی دوران انہوں نے گھر کے دروازے میں چابی گھومنے کی آواز سنی۔ یہ ان کی پیاری امی تھیں۔

دونوں بھائیوں نے ایک ہی آواز میں جوش کے ساتھ چیخ کر کہا: "امی۔۔۔امی آ گئیں"

وہ دو حصوں میں تقسیم شدہ مٹھائی اپنے ہاتھوں میں لئے خوشی خوشی ان کی طرف دوڑے۔ انھوں نے اپنا بیگ رکھا اور یہ کہتے ہوئے انھیں گلے لگا لیا لگتا ہے تم لوگوں کو میرا قیمتی خزانہ مل چکا ہے، اور وہ محبت ہے"

فارسی غزل : عبدالقادر بیدل عظیم آبادی ______ منظوم ترجمہ : اخلاق آہن

چو محوِ عشق شدی رهنما چه می جویی
به بهر غوطه زدی ناخدا چه می جویی

اگر ہو محوِ محبت تو رہنما مت ڈھونڈ
اگر ہو غوطہ زنِ بحر ناخدا مت ڈھونڈ

عصا ز دست تو انگشت رہنما دارد
تو گرنہ ؟ کوردلی از عصا چہ می ؟جویی

عصا تو کرتا گرفتار دست و بازو کو
اگر جو کور نہیں دل سے تو عصا مت ڈھونڈ

جز این ؟ کہ خرد کند حرص استخوان ترا
دگر ز سایہ ؟ بال ہما چہ می ؟جویی

سوائے اس کے کہ کر دے یہ حرص بے چارہ
اگر نہیں ہے ہوس جی میں تو ہما مت ڈھونڈ

سر نیاز ضعیفان غرور سامان نیست
بہ غیر سجدہ ز مشتی گیا چہ می ؟جویی

سرِ غرور ہی سرمایہ ہے فقیروں کا
اگر نہ سجدے میں سر پھر تو یہ قبا مت ڈھونڈ

صفای دل نپسندد غبار آرایش
بہ دست آینہ رنگ حنا چہ می ؟جویی

خلوصِ دل کو نہیں بھاتی کوئی آرائش
تو دستِ سادہ دلی میں کبھی حنا مت ڈھونڈ

بہ ذوقِ دل نفسی طوفِ خویش کن بیدل
تو کعبہ در بغلی جا بہ جا چہ می جوی

طوافِ خاطرِ خود کو بنا رہِ تسلیم
جو کعبہ ہے ترے دل میں تو جا بہ جا مت ڈھونڈ

ایشور/ اللہ۔۔۔۔۔!

بھیڑ ایشور کے نام کو نعرہ بنا کر
ہوا میں اچھالتی ہے
مذہب کے ٹھیکیدار نعرے کو دہراتے ہیں
نعرہ دہراتے وقت
ٹھیکیداروں کی آنکھیں ڈھونڈ رہی ہوتی ہیں
ہونٹوں کو
جن پر نعرہ نہیں ہے
بتا کر دہشت گرد اڑا دی جاتی ہیں ان کی گردنیں
جن کے ہونٹوں پر نعرہ نہیں ہے
دوسرے محلّہ میں بھیڑ
اللہ کے نام کا نعرہ بنا کر ہوا میں اچھالتی ہے
یہاں بھی مذہب کے ٹھیکیدار نعرہ کو دہراتے ہیں
نعرہ دہراتے وقت
ان ٹھیکیداروں کی آنکھیں بھی تلاش کر رہی ہوتی ہیں
ہونٹوں کو
جن پر نعرہ نہیں ہے
بتا کر کافر اڑا دی جاتی ہیں ان کی گردنیں
جن ہونٹوں پر نعرہ نہیں ہے
جس ملک میں ایشور اور اللہ نعرے بن جائیں
ایشور کا نام حب الوطنی ناپنے کا آلہ بن جائے
اس ملک میں ایشور اور اللہ نہیں رہتے
رہتے ہیں صرف مذہب کے ٹھیکیدار
جن کی آنکھیں تلاش کر رہی ہوتی ہیں
ہونٹوں کو
جن پر نعرہ نہیں ہے۔

ہم زندہ ہیں۔۔۔۔۔!

ہم نے آخری کش تک سگریٹ کو نچوڑا ہے
کتابوں میں کبھی دیمک نہیں لگنے دی
ٹافی کے ریپر ہمارے بیگ میں ہیں
نیند میں نظمیں بُنی ہیں
محبوباؤں کو انقلابی ترانے سنائے ہیں
محبوباؤں کی ضد پر بھی پھول نہیں توڑے
پہاڑوں پر جا کر محبوباؤں کا نام پکارا
ندی کنارے ریت پر محبوباؤں کا نام لکھا
بچوں کے آگے بچے رہے
بوڑھوں کے پیر چھوئے
ماسٹر صاحب کے سارے سبق یاد کیے
دوستوں کی سالگرہ بھول گئے
ہاتھوں سے سلینڈر اٹھائے
فسادات میں نہیں اٹھا پائے ایک بھی پتھر
فون میں نہیں آنکھوں میں تصویریں کھینچیں
ہمارے ایک کندھے پر محبوباؤں کے سر ہیں
اور دوسرے کندھے پر خدا بیٹھا ہے۔

ہندی نظمیں: منیش ـــــــــــ مترجم: ایس ایم حسینی (لکھنؤ)

سرحد کے پھول۔۔۔۔!

میں ایک گہرا گڑھا کھودنا چاہتا ہوں
اتنا گہرا جس میں دفن کرسکوں
سبھی ہتھیار، بم اور بارود
اسی زمین کے ایک
چھوٹے حصہ پر کروں کھیتی
ایک حصہ پر بناؤں کتاب گھر
زمین پر اُگاؤں طرح طرح کے پھول
کتاب گھر میں اکٹھا کروں
محبت بھری نظمیں
جنگ کا نقارہ بجنے پر
فوجیوں کو دوں حکم
دشمن کی زمین کو بھردو
پھولوں سے
سرحد پر ساتھ مل کر پڑھو
پیار بھری نظمیں
میں بھی دیکھوں
پھولوں کی خوشبو اور
محبت بھری نظموں کے آگے
کون سی فوج ٹِک پاتی ہے۔

حاصل۔۔۔۔۔!

میں نظم لکھتے وقت سوچتا ہوں
میری یہ آخری نظم ہوگی!
اِدھر نظم ختم کر کے
کرسی سے اٹھ ہی رہا ہوتا ہوں
اُدھر ملک کے کسی کونے میں
ایک معصوم عورت نوچ کھسوٹ لی جاتی ہے
کرپشن میں ڈوبے ایک نیتا کی قلعی کھل جاتی ہے
ایک اونچی ذات والا، دلت کا سایہ پڑنے پر اسے
پیٹ دیتا ہے
ہندو مسلم، مذہب کے نام پر
ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو جاتے ہیں
ملک کے بھلے لوگ کسی درخت سے لٹک جاتے ہیں
ملک کے مستقبل کو سلاخوں میں جکڑ دیا جاتا ہے
میں کرسی سے اٹھتے اٹھتے سوچنے لگتا ہوں
یہ ملک جوانوں کو نوکری دے یا نہ دے
ایک نوجوان شاعر کو نظمیں لکھنے کا موقع دیتا رہے گا۔

تبصرے

[تبصرے کے لئے کتاب کی دو جلدیں بھیجنا لازمی ہیں۔ منتخب تفصیلات پر ہی تبصرے شائع کئے جائیں گے۔ادارہ]

نام کتاب : **فن اور فنکار** (شخصیت نامے)

مصنف : علی احمد فاطمی مبصر : **ڈاکٹر ثروت خان**

صفحات : 400 سن اشاعت : 2021ء قیمت : 400روپئے

اردو ترقی پسند کے حوالے سے تنقید میں پروفیسر علی احمد فاطمی کا نام اور مقام بہت اہم ہے۔اسی لئے ان کی غیر افسانوی تخلیقات یعنی سفرنامے، رپورتاژ اور شخصیت نامے میں بھی تنقیدی نظریات کی کارآمد جھلکیاں، چٹکیاں ادبی لطائف، دلچسپ بیان کے ساتھ کوائف کی بہترین مثالیں نظر آتی ہیں۔

اس کی وجہ شاید یہ رہی ہے کہ اپنے طالب علمی کے زمانے سے ہی انجمن ترقی پسند مصنفین کی تنظیم سے منسلک رہ کر علمی احمد فاطمی کا تعلق، رابطہ اور رشتہ اردو ادب کی بڑی اور عظیم ہستیوں سے رہا۔اور کیوں رہا؟ اس لئے کہ اپنی نوجوانی سے لے کر آج تک فاطمی کی خود کی شخصیت میں لازوال اقدار کا وہ رچاؤ، وہ سلیقہ وہ عاجزی و انکساری، وہ محبت وعقیدت وہ شفقت وہ بانکپن۔ جو آج کی نسل میں ڈھونڈے نہیں ملتا، ایسا رچ بس گیا ہے کہ جن ادبی و علمی شخصیت پر ''فن اور فنکار'' لکھی گئی ہے ان شخصیات کے اوصاف کا تمام نچوڑ علی احمد فاطمی کی شخصیت میں نظر آتا ہے جو اس کتاب میں ابھرا ہے یہی وجہ ہے کہ قلم سے نکلا ایک ایک لفظ جملہ ہمیں تہذیب وشائستگی کے ادب و آداب سکھاتا ہے اور یہی اس کتاب کا حسن بھی ہے۔

سال اشاعت ۲۰۲۱ء مطبع بھارگو آفسیٹ، بائی کا باغ الہٰ آباد سے چھپ کر جب یہ کتاب اردو ادب کے روبرو آئی تو مطالعہ کے بعد اندازہ ہوا کہ مصنف کتنا خوش نصیب ہے کہ جسے اردو ادب کے ایک دو تین نہیں بلکہ پورے پچیس استادوں دانشوروں، ادیبوں، محقق اور علم دوستوں کی سرپرستی اور قربتیں حاصل رہیں۔

ان سب شخصیات پر مصنف نے اپنے ذاتی تعلقات کی بناء پر بہترین روشنی ڈالی ہے۔ادب کے میدان کے آداب سکھائی ہیں، جینے کا طریقہ، سوچنے کا طریقہ رشتوں کے استحکام کا طریقہ، قربانی اور وفاؤں کا طریقہ، محبت کا طریقہ، شفقت کا طریقہ استادی اور شاگردی کا طریقہ سکھائی ہیں۔بشرطے کہ طالب علم ہمیشہ طالب علم ہی بنا رہے۔ عاجزی وانکساری، خاکساری وایمانداری شخصیت کے وہ پھول ہیں جس کی مہک سے سارا عالم

معطر ہوتا ہے اور جس کا آج فقدان نظر آتا ہے۔ ایسے لوگ ڈھونڈے نہیں ملتے اور جو ہیں۔ان کی ہم پرواہ نہیں کرتے۔ ایسے ماحول میں اس کتاب کا آنا اس زوال پذیر معاشرہ کی مشعل راہ دکھانے کے مترادف ہے، کیونکہ یہ کتاب دو تہذیبوں کے درمیان ایک پُل کا کام کرتی ہے۔ ہمارے ادبی بزرگوں کی وہ صحبتیں، وہ باتیں، اور ان کے ساتھ گزارے ہوئے اوقات ان کی حرکات وسکنات۔ان کے قیمتی مشورے ان کی گھڑکیاں، جو علی احمد فاطمی نے ان کے قدموں میں بیٹھ کر سنیں، اپنے باطن میں جذب کیں اور اپنی خود کی بزرگی تک یاد رکھیں اور ان کو قلم بند کر کے ''فن اور فنکار'' میں محفوظ کر دیا۔ جو آج کے اردو معاشرہ آج کے تہذیب وکلچر کے لئے بہت مفید ثابت ہونگی۔

ان شخصیات میں فراقؔ گورکھپوری، امرت رائے، علی سردار جعفری، معین احسن جذبیؔ، غلام ربانی تاباںؔ ،میکش اکبرآبادی، جگن ناتھ آزاد، مجروح سلطانپوری، رشید حسن خاں، مشفق خواجہ، سید محمد عقیل، پروفیسر محمود الٰہی، قاضی عبدالستار، اقبال مجید، عابد سہیل، حسن عابد، نیر مسعود، ملک زادہ منظور احمد، یوسف سرمست، فضل امام، راجندر کمار، سید عاشور کاظمی، جیسے اردو کے نامور عالم، متجر بزرگوں اور دوستوں میں افغان اللہ غضنفر، طارق چھتاری اور آخر میں اردو کی ناول نگار، افسانہ نگار شائستہ فاخری، جنہیں فاطمی صاحب نے اپنی......................

کتاب کا پہلا اور دوسرا مضمون فراقؔ گورکھپوری پر ''فراقؔ گورکھپوری: کئی چہروں والی شخصیت'' اور فراق کے ساتھ ایک صبح کے نام سے ہیں یہ دونوں مضمون سن ۱۹۸۳ء اور ۱۹۷۴ء کے ہیں۔ان میں فراقؔ کی شخصیت کی تہ داری کو پہچاننے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔وہ بھی بہ حیثیت شاعر اور انسان کے طور پر لکھتے ہیں :

''فراقؔ صاحب کا علم، اظہار علم، گفتگو، انداز گفتگو، شعر اور اس کی پیش کش سب اس قدر جادوئی تھے کہ سامعین پر ایک کیف طاری ہو جاتا......ہم سب تخیل اور تصور کی نہ جانے کن وادیوں میں پہنچ جاتے ہیں۔ ہمارے کانوں میں رس گھلنے لگتا......۔ان کی گفتگو کی مخصوص ادائیں ان کی شاعرانہ فنکارانہ کیفیتیں، ان کی آنکھوں کا رقص، انگلیوں میں جھولتا ہوا سگریٹ، ہاتھوں میں کانپتا ہوا نارنجی گلاس، کولہے پر کھسکتی ہوئی لنگی اور پھر رفتہ رفتہ لحاف کے اندر جاتا ہوا جسم، جو اپنی قوت کھو چکا تھا......اور پھر ان کی لرزتی مگر گونجتی آواز......

ان تمام کیفیت کا بیان واظہار نفسیاتی، شخصی اعتبار سے انسان اور انسانیت کے پہلو، مشاعرانہ شخصیت کی تہہ داریاں وغیرہ سب کچھ مصنف نے ایسے دکھایا ہے کہ گویا فلم چل رہی ہو۔اسی کے ساتھ فراقؔ صاحب کی ذاتی الجھنوں سے قرار حاصل کرنے کے لئے ان کا سیاست میں جانا، جنگ اور جنگِ آزادی میں کودنا، ترقی پسند تحریک کے پرُ زور حامی اور کارکن کی حیثیت سے ان کی سرگرمیاں اور پھر ان کی فنکاری کی سرمئی فضاؤں میں پچھلے

پہر معشوق کی آہٹیں محسوس ہونے تک کے سلسلے ،اس انداز سے پُر اثر اسلوب میں پیش کیے ہیں کہ فراق کا مکمل سراپا، مکمل شخصیت اوران کے فن کے فنی رموز سے قاری دلچسپ انداز سے روبرو ہوتا ہے۔

چونکہ علی احمد فاطمی الہٰ آباد جیسی مردم خیز زمین کی پرورش ہیں اورایک سرگرم جوشیلے نوجوان کی حیثیت سے ہر بڑے ادیب، شاعر، چاہے وہ کسی بھی زبان وادب سے تعلق رکھنے والا ہو، فیضیاب ہونے کو اپنی خوش نصیبی مانتے ہیں۔اس لئے فراق کے بعد امرت رائے کا ذکراس طرح سے کرتے ہیں کہ اسلوب کی سحرانگیزی کے ساتھ ساتھ امرت رائے میں پریم چند نظر آنے لگتے ہیں :

اکثر گفتگو کا (امرت رائے اور فاطمی صاحب کی گفتگو کا) مرکزی موضوع ناول نگارہی ہوتے۔اچھی اردو بولنے، اچھے لب و لہجے میں بولتے ان کے منہ سے جب اردو کے خوبصورت الفاظ نکلتے تو ایسا لگتا کہ بیلے کے پھول مہک رہے ہوں۔فضا میں سوندھی سوندھی خوشبو تیر جاتی، وہ جو کہنا چاہتے پورے جسم کے ساتھ اس لب و لہجے میں ڈھل جاتے اور گفتگو آئینہ کی طرح آر پار تو ہو ہی جاتی لیکن اس میں فن اوررس پیدا ہو جاتا...... یہ اپنی اندازِ گفتگو کے ذریعے فنکاریت کا سکہ جما لیتے۔کم لوگ تھے جوان کے جادو کے اثر سے بچ رہے ہوں۔

ایک اگست ۲۰۰۰ء کوعلی سردار جعفری ہمارے درمیان سے رخصت ہوگئے۔اس غم کا اظہار علی سردار جعفری: ایک علمی، ایک طلسمی شخصیت میں کیا ہے۔اس تاثراتی مضمون میں سردار کی ادبی صحافی، ثقافتی اور سیاسی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے۔مصنف نے سردار کی بڑی شاعری کے متعلق ان خیالات کا اظہار کیا ہے :

''سچ بات یہ ہے کہ سردار کی بڑی شاعری وہیں سے جنم لیتی ہے۔جہاں وہ جوشِ خطابت اور انقلابی آہنگ میں ڈوب جاتے ہیں۔آزادی کے فوراً بعد جب پورے ہندوستان میں اتھل پتھل تھی۔ ۱۹۴۸ء میں حیدرآباد میں پولس ایکشن ہوااور ۱۹۴۹ء میں بھارت کا دستور بنا۔انہیں دنوں تلنگانہ تحریک شروع ہوگئی۔سینکڑوں جوان مارے گئے۔عین انہیں دنوں سردار جعفری کا ایک بے حداہم مجموعہ ''خون کی لکیر'' چھپ کرآیا جس کا نظم میں لکھا ہوا دیباچہ ہی دامنِ دل کھینچتا ہے۔

زندگانی کی اندھیری رات میں/ درد اور دکھ کی بھری برسات میں/ لے کے اک ماہِ تمام آیا ہوں/ میکشوں آتش بہ جام آیا ہوں/ حسن معنی ہورہا ہے بے نقاب/ اُبھر رہے ہیں استعاروں کے حجاب/ خون پیمانوں میں اب ڈھلتا نہیں/ اب امیروں کا فسوں چلتا نہیں/ زلزلہ ہے قصر استبدار میں/ حلقۂ زنجیر گلنے ہی کو ہے/ زندگی کروٹ بدلنے ہی کو ہے۔

ایک جگہ اردو شاعری میں انقلاب کے لفظ کے استعمال کے متعلق رقمطراز ہیں :

''سچ یہ ہے کہ اردو شاعری میں انقلاب کا لفظ بقول جعفری پہلی بار اقبآل نے استعمال کیا جوشؔ کی انقلابی شاعری میں گھن گرج ہے اور خلوص وسچائی بھی لیکن کوئی صاف ستھرا نظریہ یا راستہ نہیں۔ایجیٹیشنل شاعری کا یہ باقاعدہ راستہ مخدوم فیض اور سردار نے عام کیا۔سرداران سب میں دو قدم آگے تھے۔اس لئے ان پر سب سے زیادہ اعتراض بھی ہوئے لیکن انہوں نے ہی سب سے زیادہ اس نوع کی شاعری کو فکرو جمال کا حصہ بنایا۔''

مثال کے طور پر فاطمی سردار کا لکھا یہ اقتباس پیش کرتے ہیں۔

''ہمارا ہندوستانی جمالیاتی نظام تو بنیادی طور پر انسانی جذبات پر مبنی ہے، جنہیں رس کہا جاتا ہے۔ان رسوں میں غصہ اور نفرت کو بھی جمالیات کے زمرے میں رکھا گیا ہے۔غصہ یا نفرت کو آپ اچھا کہیں یا برا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ یہ انسانی جذبات ہیں اور اس حیثیت سے شاعری میں ان کی جگہ ہے۔ میں شاعری میں اس کے استعمال کو جائز سمجھتا ہوں......نفرت کا یہ سلسلہ مہابھارت، فردوسی کے شاہنامے کے صفحات میں بلند ہوتا ہے۔''

غرض یہ کہ فراقؔ ہوں، امرت رائے ہوں یا سردار...... یا اس کتاب میں درج باقی شخصیت کے فکروفن، سوانحی حالات، عادات واطوار، نوک جھونک ،نظریاتی تضادات، مباحثہ ہو یا شاعری یا ناول افسانے اور تحقیق وتنقید کی جمالیات کا معاملہ...... پروفیسر علی احمد فاطمی نے ان ہستیوں کی گہری صحبتوں سے جو فیض اُٹھایا وہ قارئین تک پہنچادیا۔

دراصل فاطمی کو انجمن ترقی پسند مصنفین کی سرگرمیوں میں گرمجوشی سے حصہ لینے کے دوران یہ صحبتیں میسر ہوئیں۔فاطمی صاحب کے جوش وجذبے فکروعمل سے متاثر ہوکر ان بزرگوں نے ہمیشہ ہی انہیں گلے سے لگایا، گویا انہیں علی احمد فاطمی کے روپ میں اپنا جانشیں مل گیا تھا......اور فاطمی صاحب نے بھی لفظ بہ لفظ ان کے علمی وادبی ،تہذیب وثقافتی نصیحتوں ، اصلاحوں ، تاکیدگیوں کو خندہ پیشانی سے مانا بھی اور ان پر عمل بھی کیا۔اور ایک طویل عرصہ (تقریباً چالیس برس) گزر جانے کے بعد بھی اپنے شعورولاشعور کے اس خزانے کو من وعن کتابی شکل دے کر آنے والی نسلوں کے لئے وہ چھوڑا ہے جواب بتانے والا ابھی کوئی نہیں ہے۔''فن اور فنکار'' علم وادب، فکروفن کے باہم ایک تہذیبی کتاب بھی ہے کیونکہ اس کتاب میں درج مضامین کو تاثراتی وتخلیقی نوعیت کے ہیں لیکن اردو کی عظیم اور نایاب ہستیوں پر رقم کئے گئے ہیں۔

یہ تمام ہستیاں مصنف کو عزیز رکھتی تھیں۔کوئی شاگرد مانتا تھا کوئی بیٹا، کوئی دوست تو کوئی جوشیلا نوجوان

۔کوئی ترقی پسندی کا مستقبل سمجھتا تھا تو کوئی اپنا جانشین۔ پوری کتاب پڑھ جائیے۔علی احمد فاطمی نے خود کو ''خرد'' کہا، ناچیز کہا، لاعلم کہا، چھوٹا کہا، احقر ٹھہرایا۔غرض یہ کہ کچھ بھی نہیں مانا کچھ بھی نہیں جانا۔اور یہی وہ اقدار ہیں جو آج کے زمانے میں نایاب ہیں اور یہی اقدار، یہی پاس ولحاظ کے معاملات ہیں۔ جو اس کتاب کے مصنف کو بھی ایک اہم شخصیت کا روپ دے دیتے ہیں۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ گویا کتاب ''فن اور فنکار'' کے بطن سے پروفیسر علی احمد فاطمی کی معتبر شخصیت اور ان کا خود کا فن جھانکتا ہوا نظر آتا ہے۔اور یہی تخلیق کا حسن بھی ہے۔

حیرت ہوتی ہے کہ ایک ایک اہم شخصیت سے مصنف کے اس قدر گہرے مراسم رہے۔ نہ عمر کی تفریق رہی نہ عہدے کا رعب درمیان میں حائل ہوا۔ نہ علم کی علامانہ فوقیت کا شائبہ نظر آیا نہ عمل کا جوش وجنون کا ذرہ برابر امتیاز دکھا۔ نہ استادی کا بھرم کسی مکالمے یا گفتگو سے چھلکا نہ شاگردی کی احمقانہ حرکت نظر آئی، گویا سب ثمر دار درخت۔ جھکے جھکے سے، پکے پکے سے،اور سب کو ایک ہی نوجوان عزیز۔اس کو کیسے سنوارا جائے،سکھایا جائے، تیار کیا جائے۔اس کا جتن کرتے ہوئے۔کبھی پیار سے کبھی ڈانٹ سے،کبھی بے رخی سے،کبھی خلوص سے۔اور مصنف بھی ایسا کہ کسی کا بھی دامن چھوڑنے کو تیار نہیں۔ پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں۔ جو کہا گیا۔وہ مان لیا۔پہلی نوکری کالج میں تقرری کے روپ میں ہوئی۔استاد محترم سید محمد عقیل رضوی نے منع کر دیا۔''جوائن نہیں کرنا ہے، پہلے پی۔ایچ۔ ڈی مکمل کرو'' تو کہا مانا۔ولیمہ کے دن دوسری مرتبہ جب نوکری کے انٹرویوں کی تاریخ پڑی تو استادِ محترم نے حکم دیا۔''

''فوراً آگرہ کے لئے روانہ ہو جایئے۔''

ہو گئے......دلہن کو چھوڑ......مہمانوں کو چھوڑ......چل دیئے آگرہ......انٹرویو دینے کے لئے۔تقرر ہوا تو،ان کی محنت تو کچھ نہیں...... یہ کہا گیا کہ،''بیوی بختاور ہے جو نوکری ملی''

غرض نہ ایسا شاگرد دیکھا نہ ایسے استاد...... نہ ایسی فرمانبرداری دیکھی، نہ اتنا حق جتانے والے دیکھے ......اسی لئے مصنف نے ہر شخصیت کے عنوان کو شعر و ادب کے مصرعوں اور مقولوں سے اور کہیں اسمِ با مسمّیٰ لفظ سے سجایا ہے، جس کی وجہ سے اُس ادبی محنت کا پرتو ایک جملہ سے جھلکنے لگتا ہے۔مثلاً معین احسن جذبی کو ''ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے'' غلام ربانی تاباں کے لئے ''تاباں جبیں پہ کج ہی رہا بانکپن کے ساتھ'' جگن ناتھ آزاد: قندیل محبت کی ضیاء چھوڑ گئے ہم، مجروح سلطان پوری: سب دیئے روشن تمہارے نام کے، رشید حسن خاں: شجر سایہ دار، الوداع اے فکرِ جمیل، الوداع سید محمد عقیل، قاضی عبدالستار: پالا ہوا ہے وہ بھی نسیم بہار کا، عابد سہیل: تم پر ہے ختم شامِ غریباں

لکھنو، حسن عابد: ہم تو کیا، سب اُسی کے گھایل ہیں، نیر مسعود: پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ، ملک زادہ منظور احمد: مدتوں رویا کریں گے جام، پیمانہ مجھے، راجندر کمار: حلقہ کیے بیٹھے رہو اک شمع کو یارو اور دوستوں کے شخصیت نامہ میں افغان اللہ خاں :تم جیسے گئے ویسے تو جاتا نہیں کوئی، غضنفر : دیدۂ دل تمام آئینہ، طارق چھتاری: ایک ماڈرن صوفی کی کہانی، اور آخر میں شائستہ فاخری کے لئے اقبالؔ کا یہ نصیحت آمیز مصرعہ کہ ''ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں'' جیسے عنوانات قائم کیے ہیں۔

اصل میں کتاب کا حسن و جمال تو یہ ہے کہ اردو کے نامور اور معتبر شخصیات کے ذاتی پہلوؤں کو بڑے دلچسپ انداز میں واقعات کے تسلسل کے باہم مصنف نے پیش کیا ہے، جس میں اہم ادبی معلومات کا خزانہ بھرا پڑا ہے۔ ان ہستیون کے متعلق فاطمی صاحب اس قدر مزے لے لے کر لکھتے جاتے ہیں کہ قارئین بھی محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہتا اور بقوم مصنف :

''یہ وہ لوگ تھے جو سماج کے نام نہاد رسم و رواج سے بیگانہ تھے۔ ہر طرح کے قید و بند سے آزاد ان کی اپنی ایک دنیا تھی، اپنا ایک ماحول اور اپنی ایک سوچ اور فلسفہ یہ سر سے پیر تک فنکار تھے جو تصوف، عشق، سیاست اور معاشرے سے لے کر سبزی بھاجی کی ابتوں کو بھی، نوکر چاکر کے مسائل کو بھی فنکارانہ و مصورانہ انداز میں لیتے اور بات سے بات پیدا کرتے ہوئے خیال کی ایک ایسی دنیا میں پہنچ جاتے، جہاں عام آدمی کا گزر نہیں ہوسکتا تھا'' (صفحہ ۳۴)

غرض، قارئین کو فکری و فنی سطح پر اپنا رفیق بنا لینا ایک ادب پارہ کی بہترین خصوصیت ہے اور یہ خصوصیت اس کتاب میں بحسن خوبی نظر آتی ہے۔ پروف ریڈ ینگ کی اہم ترین ذمہ داری کو مکمل طور پر نہیں نبھانے کے باوجود یہ کتاب مقتضائے حال مناسبت سے اپنے قارئین پر وہ نقش کرے گی جس کی معاشرہ کو از حد ضرورت ہے۔

نام کتاب : **نھایت** (شاعری)

شاعر : خالد عبادی مبصر : **اظھار خضر**

سنہ اشاعت: ۲۰۱۶ء قیمت : ۱۵۰/روپے

دستیاب : بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ۔۴

نہایت (۲۰۱۶ء) جناب خالد عبادیؔ کی چالیس (۴۰) غزلوں اور دس (۱۰) نثری نظموں کا مجموعہ ہے۔ یہ ان کا تیسرا مجموعہ کلام ہے۔ اس سے قبل ان کے دو مجموعۂ کلام زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آ چکے ہیں۔

اور شاعری کے سنجیدہ اور تربیت یافتہ قارئین سے خراج تحسین وصول کر چکے ہیں۔ان کے نام ہیں۔(۱) نہروں کا جال (۱۹۹۷ء) (۲) خوش اجار (۲۰۰۶ء) مزید یہ کہ ''نہایت'' کی چالیس غزلیں دوسو اٹھاون (۲۵۸) اشعار پر مشتمل ہیں۔

زیر تبصرہ مجموعۂ کلام کا یک لفظی عنوان شاعر کے ذہنی ایجاز و اختصار کا غماز ہے۔ کیوں نہ ہو کہ شاعری بالخصوص غزل تو فن ایجاز نویسی سے ہی عبارت ہے۔بس یوں سمجھئے کہ غزل کے ایک شعر میں معنی کی ایک دنیا آباد ہوتی ہے۔ چنانچہ چھوٹی بحروں میں کہی گئیں مجموعہ کلام کی بیشتر غزلیں فکر و معنی کی جامعیت سے مملو نظر آتی ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ غزلوں کے بیشتر اشعار کے راستے میں ترسیل فکر و معنی کی پیچیدگیاں قاری کی فہم کے لئے سدّ راہ بنتی محسوس ہوتی ہیں۔فکر و فن کے اس پہلو پر گفتگو آگے کی سطور میں کی جائے گی۔

اس تبصراتی گفتگو کا آغاز غزلوں کے حوالے سے کرنا چاہتا ہوں۔ جس میں شاعر کی بنیادی ذہنی و فکری ترجیحات ور جحانات کو نشان زد کرنے کی کوشش کی جائیگی!

سب سے پہلے عنوان ''نہایت'' کے حوالے سے دو شعر ملاحظہ فرمایئے!

(۱) اس دل کی آ کے دیکھ نہایت گزاریاں
ہنسنے لگی ہیں دیکھ کر سب بے قراریاں

○

(۲) بہت پیار آنے پہ چپ کی نہایت
صنم گر صنم ہی بنا چاہتا ہے

شعر نمبر ا کے حوالے سے عرض یہ کرنا ہے کہ گر چہ یہ شعر سہل ممتنع کے ذیل میں ہی ہے۔لیکن پھر بھی اس کا مبہم پسند شعری بیانیہ کم از کم میرے تفہیمی شعور کے لئے ایک امتحان گاہ کی حیثیت تو رکھتا ہی ہے۔ حالانکہ ابہام شعر کا حُسن ہوتا ہے لیکن اپنے حد اعتدال میں اتنا ہی نہیں فنون لطیفہ بشمول شاعری بالواسطہ بیانہ (Indirect Narration) کے فن کی متقاضی ہوتی ہے یہ سب کچھ صحیح لیکن اچھی اور اعلیٰ درجے کی تخلیقی فن کاری ترسیل فکر و معنی کی ناکامی کی چغلی کھاتی نظر نہیں آتی ۔سر دست اس بحث کو یہیں پر موقوف کرتا ہوں اور آپ کی توجہ زیر بحث شعر کی جانب مبذول کرانا چاہتا ہوں!

ذرا غور فرمایئے کہ ''دل کی نہایت گزاریاں'' چہ معنی دارد! گفتگو کے اس مقام پر فکر و فہم کی کچھ گر ہیں

کھولنے میں آپ کو بھی شریک کرنا چاہتا ہوں۔

ہاں تو ''دل کی نہایت گزاریاں'' دل میں ہلچل مچی ہوئی نا معلوم محسوسہ کیفیتوں کی وہ انتہائی منزل ہے جس کو شاعر بیان کرنا چاہتا ہے۔لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مصرع اولیٰ میں '' آ کے دیکھ'' سے کیا مراد ہے۔شاعر واحد متکلم کی صورت میں کس سے مخاطب ہے۔ظاہر ہے کہ محبوب سے مخاطب ہے۔ مطلب یہ کہ دل کی اعلیٰ ترین نشاطیہ کیفیتوں کی وجہ سے بے قراریوں کی نشاطیہ کلبلاہٹ کی لطف اندوزیوں سے تنہا عاشق ہی نہیں، محبوب بھی سر شار ہو۔ بے قراریوں کی جتنی بھی غیر مرئی (Invisible) صورت و کیفیات انگڑائیاں لے رہی ہیں وہ سب ہنس رہی ہیں۔سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ آرزومندی شاعری کی ہے یا عاشق کی!

میرا خیال ہے کہ دونوں ہی صورتوں میں محبوب کے ساتھ سرشاری وسپردگی کی یہ آرزومندی مذکورہ شعر کی نشاطیہ لے کو تیز کرتی نظر آتی ہے۔

لہٰذا ''نہایت گزاریاں'' کی تخلیقی صورت حال اپنی مختلف فکری جہتوں کے ساتھ اس مجموعہ کلام کا شناخت نامہ بنتی نظر آتی ہے۔اس میں محبوب کے ساتھ محض چھیڑ چھاڑ اور شوق فرمائیاں ہی نہیں ہے بلکہ فرد، زندگی اور سماج کے دیگر تلخ و شیریں مسائل و موضوعات کو بھی احاطۂ فن میں لانے کی کوشش کی گئی ہے۔لیکن بہر صورت آپ کو اس مجموعۂ کلام میں شاعر کی نشاطیہ طرب انگیزیوں کا تخلیقی منظر نامہ دیکھنے کو ملے گا۔ حالانکہ اچھی اور اعلیٰ درجے کی تخلیقی فنکاری المیہ نگاری کی مرہون ہوتی ہے۔ کہ اسی راستے سے فن پارے میں جمالیاتی قدریں وضع ہوتی چلی جاتی ہیں۔

تخلیق کا المیاتی حسن ہی صحیح معنی میں اس کی جمالیات ہے۔لیکن اس کے لئے فنکار کا ذکی الحس (Sensitive) ہونا بیحد ضروری ہے۔

شاعر نے انتساب ''دنیائے دنی'' کے نام کیا ہے۔ظاہر ہے کہ جب یہ دنیا، دنیائے دنی ہی ٹھہری تو اس سے بیزاری فطری ہے۔لہٰذا شاعر بھی اس دنیائے آب و گل سے اپنی بیزاری کا تخلیقی اظہار کرتا نظر آتا ہے۔ اس وقت پاکستان کے ایک مشہور و معروف شاعر جون ایلیا کا ایک شعر یاد آ رہا ہے!

حاصلِ 'کن' ہے یہ جہانِ خراب
یہی ممکن تھا اتنی عجلت میں

تخلیق کائنات کے فکر و فلسفہ پر یہاں بحث کرنا مقصود نہیں۔عرض یہ کرنا ہے کہ جون ایلیا اور اردو کے

دیگر شعراء نے اس جہان کو جہان خراب ہی کہا ہے۔ کیوں کہا اس پر بھی بحث کرنے کا یہاں موقع نہیں۔ کیونکہ اس کے لئے ایک الگ دفتر چاہئے۔ اس سے قطع نظر کہنا یہ ہے کہ زیر گفتگو مجموعہ کی غزلوں کے بیشتر اشعار میں شاعر کی بیزاری کی جھلکیاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ چنانچہ انتساب کے حوالے سے مجموعہ کے تین شعروں میں شاعر نے اپنی بیزاری کا براہ راست تخلیقی اظہار کیا ہے!

(۱) پتھر سے میں آئینہ ہوا ٹوٹ کے بکھرا
دنیائے دنی نے دی بدھائی نہیں اب تک

○

(۲) مجھے اچھی نہیں لگتی تو اچھی بھی نہیں ہوگی
یہ دنیا کب مری نظروں میں توقیر رکھتی ہے

○

(۳) پنڈ دنیائے دنی سے بہ سہولت چھوٹا
اپنے انداز کے جینے میں خسارہ کیا ہے

جیسا کہ گزشتہ سطور میں عرض کیا گیا ہے کہ ان تینوں شعروں میں دنیائے دنی کے حوالے سے شاعر کی بیزاریوں کا براہ راست تخلیقی اظہار ہوا ہے۔ یہ بھی نشان خاطر رہے کہ شاعر دنیا سے بیزار ہے، متنفر نہیں۔ متنفر ہونا تلازمۂ خیال (Association of thoughts) کا سب سے ادنیٰ درجہ ہے۔ جبکہ بیزاری ایک قسم کا Associative attitude ہے۔ جینا، مرنا تو دنیا ہی میں ہے لیکن دیگر شعراء کی طرح شاعر کے بھی اپنے کچھ مطالبے اور تقاضے ہیں۔ شاعر کی ذہنی و فکری رجحانات و ترجیحات محیر العقول ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ''نہایت'' کی غزلوں کے بیشتر اشعار ایک قسم کی عجوبۂ خیال تخلیقی فضابندی کرتے نظر آتے ہیں۔

شعر نمبر ا کو پیش نظر رکھئے اور غور فرمائیے کہ شاعر سنگدل تھا۔ پتھر تھا۔ لیکن تھا تو بشر ہی۔ چنانچہ تغیر و تبدّل کی بشری فطرت کے پیش نظر اس کی سنگدلی آئینہ کا روپ اختیار کر لیتی ہے۔ مطلب یہ کہ پتھر اب نزاکت کی فطرت اختیار کر لیتا ہے۔ اور نزاکت بھی ایسی کہ بے ثباتی اس کا مقدر بن جاتی ہے۔ لیکن ایسی بھی ماہیت قلب کیا کہ آئینہ تو بن گیا لیکن ٹوٹ کر بکھر گیا۔

لہٰذا بقائے دوام کا کوئی سوال ہی نہیں۔ وجود کی بے ثباتی اور بے ثباتی عالم کے اس فکر و فلسفہ کو پیش نظر

رکھئے تو آپ پر دنیائے دنی سے بیزاری کے راز منکشف ہو جائیں گے! یہی نا کہ جب بے ثباتی ہی مقدر ٹھہری تو پھر ٹوٹنے اور بکھرنے کے کوئی معنیٰ ہیں نہیں۔

ایسے میں مصرع ثانی میں اس بات کا متقاضی ہونا کہ دنیائے دنی نے اب تک اس ٹوٹ پھوٹ کے لئے کوئی بدھائی نہیں دی۔ کوئی Response ہی نہیں لیا۔ شاعر دنیائے دنی سے کسی قسم کے Response کی امید نہیں کرتا ہے۔ اس کی فطرت تو Non-Responsive ہے ہی۔ لیکن ایسی بھی کیا لاتعلقی کہ بے ثباتی عالم کے فکر وفلسفہ کو نظر انداز کردے۔ اور یہی دنیائے دنی سے شاعر کی بیزاری کا سبب ہے۔ زیر گفتگو مجموعۂ کلام کے شاعر ہی پر کیا موقوف! اردو اور دیگر زبانوں کے بیشتر شعرا نے بھی اس دنیا کو دنیائے دنی ہی سے تعبیر کیا ہے! دنیا کی اس ماڈی توجیہ پسندی کا فکر وفلسفہ اس کی بے ثباتی ہی ہے کہ مادّہ تو فنا پذیر ہے ہی! شعر نمبر ۲ اور ۳ میں بھی اسی قسم کی توجیہ پسندی کا تخلیقی رویہ دیکھنے کو ملتا ہے!

''نہایت'' کا شاعر مشکل پسند بھی ہے اور سہل پسند بھی۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اس مجموعہ میں شاعر کی مشکل پسندی کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ حالانکہ مشکل پسندی کوئی بُری چیز نہیں ہے۔ یہ تو تخلیقی فنکاری کا ایک فطری عمل ہے جس میں بالواسطہ طریقۂ اظہار کو مرکزیت حاصل ہوتی ہے۔ فنکار کا فن لفظوں کے جدلیاتی نظام کے تابع ہوتا ہے اور ہونا بھی چاہئے!

اگر ایسا نہ ہوا تو تشبیہ، استعارہ، اشارہ، کنایہ اور رمز وایما جیسے فنّی لوازم کو تخلیق کی سطح پر برتنے کا کوئی جواز ہی نہیں۔ البتہ فکر وفن کے اس مطالبے کو تو ملحوظ رکھنا ہی پڑے گا کہ وہ ترسیل فکر ومعنی کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہوا یا نہیں۔ مطلب یہ کہ مشکل پسند ہوتے ہوئے بھی فن پارے میں بیان کردہ فکر وفلسفہ کا سریع الفہم اور قریب الفہم ہونا بہر صورت از حد ضروری ہے۔ یہ بھی نشانِ خاطر رہے کہ اچھی اور اعلیٰ درجے کی شاعری، سہل ممتنع کی ہی شاعری ہوتی ہے۔ سامنے کی بات ہے کہ غالب سہل ممتنع کے سب سے بڑے شاعر ہیں اور مشکل پسند ایسے کہ خدا کی پناہ! پھر بھی غالبؔ کی عظمت فن پر کوئی آنچ نہیں آئی۔ خیر اس بحث کو یہیں پر ختم کرتا ہوں اور عرض یہ کرنا ہے کہ جناب خالد عبادیؔ کی اس قبیل کی شاعری جس میں وہ مشکل پسند واقع ہوئے ہیں کم از کم خاکسار کے لئے ایک امتحان گاہ کی حیثیت تو رکھتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاعر اپنے قاری کی ذہانت کا امتحان لینا چاہتا ہے۔ حالانکہ شاعر کی فکری اور فنّی ریاضت اپنی جگہ پر۔ لیکن اپنے قاری کے تفہیمی شعور سے ریاضت اور ذہنی ورزش کا متقاضی ہونا کہاں تک جائز ہے! کہیں ایسا تو نہیں کہ زیر گفتگو مجموعۂ کلام کی غزلیہ شاعری Classified شاعری تو نہیں!

خیر اس گفتگو سے قطع نظر غور فرمائیے کہ ۲۵۸ شعروں پر مشتمل چالیس (۴۰) غزلوں کے کم از کم سو (۱۰۰) اشعار تو ایسے ضرور ہیں جو حد درجہ مشکل پسند ہیں۔ بہ خوف طوالت یہاں چند ہی اشعار پیش کیے جا رہے ہیں!

(۱) میں کہ شب چہاراں تھی میری چہار گرد
جتنی تھی مجھ میں آہ میں اس سے بھی تھا عجول

○

(۲) اچھا یہی ہے تیرا ارادہ تو خیر خیر
ورنہ میرے مزاجِ تراضی میں تھا عدول

○

(۳) میں معرکۂ حرص و تملّق میں تھا شامل
وہ جھوٹ کیا طور جو تمغہ سے رہا تھا

○

(۴) تقدیر کیا مشہد تو جامِ شہادت دے
کر ایسی بھلائی تو جس سے ہو بھلا تیرا

○

(۵) نجوم و ماہ کیا خورشید تک ہو گا تسجّد میں
کوئی جھگڑا نہیں نقشِ قدم پہچان ہونے دے

○

(۶) یہ کون ہے جو مرے خواب و خوں میں سورج ہے
مرے سوا تو مرا سب سے انفصالہ ہوا

○

(۷) ابھی بیٹھا ہوا نکلوں ابھی مصروف ہو جاؤں
میں جب چاہوں جہاں اس کی وہیں تو رید ہوتی ہے

○

(۸) شمشیرِ خم انداز نے تعلیم کی سوچی
تو سر جو تسجد میں تھے اٹھے وہ رسن بست

○

(۹) تو کچھ نہیں بجائے عبادت چھلی ولی
تو تہہ یہ کس نماج کو رکھا کیا سدا

○

(۱۰) پاس ہے تمغۂ سیاہت تو
دن دہاڑے سرِ رہ لوٹو

○

(۱۱) سر مدی بارِ تمدّ دسے جھکی جاتی ہے
سایۂ تیغِ عنایت میں گزارہ کرلوں

○

(۱۲) شورِ گریہ ہی میں دب جاتی ہے دستک تیری
ورنہ دروازہ دل باب اجابت ہو جائے

مندرجہ بالا اشعار کے خطِ کشیدہ الفاظ کی مشکل پسندی کو پیش نظر رکھئے اور غور فرمایئے کہ ان الفاظ کی تخلیقی صورت گری کے نتیجے میں شعر کی قرأت وسماعت آپ پر گراں باری کا سبب بن رہے ہیں یا نہیں! ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاعر نے اپنی نا قابل فہم اور نامانوس Vocabulary کا تخلیقی مظاہرہ کر کے آپ کے تفہیمی شعور کو آزمائش میں مبتلا کر دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں لغت سے رجوع کرنے کی ضرورت پڑے گی۔ گویا شعر کی سمجھ اور صاحب ذوق قاری سے لغت بینی کا متقاضی ہونا بھی ایک لازمی شرط ٹھہری۔ آپ جانتے ہیں کہ شاعر تو خود رَو ہوتا ہی ہے اس کا صاحب ذوق قاری بھی فکر وفہم کی سطح پر خود رَو ہی ہوتا ہے۔ لہٰذا قرأت شعر کے دوران تعطّل اور سکتہ پیدا ہونے سے اس کی شعریت مجروح ہوتی ہے۔

پیش کردہ آخری شعر نمبر۱۲ میں دروازۂ دل کے باب اجابت ہونے کی بات کہی گئی ہے۔ مطلب یہ کہ

اگر شورِ گریہ نہ ہوتا تو محبوب کی دستک پر دروازۂ دل کو باب اجابت تو ہونا ہی تھا۔ یہاں اجابت بہ معنی جواب دینا، Response کرنا! آپ جانتے ہیں کہ لفظ 'اجابت' عام طور پر کس معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ 'اجابت' کا معنوی چلن فضلات کے اخراج سے تعلق رکھتا ہے اور اس لفظ کو اسی معنی میں لیا جاتا ہے! مطلب یہ کہ بہ لحاظ استعمال اور چلن کے الفاظ اپنی معنوی توجیہات وضع کرتے ہیں اور وہ اسی معنی و مفہوم میں لئے جاتے ہیں۔ حالانکہ اجابت کے اور بھی معنی ہیں جو لغت کی زینت ہیں۔ رواج عام سے ان معنیٰ کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ لہٰذا اس قسم کی مہملیت سے اجتناب کرنا چاہئے!

حالانکہ احمد رضا خاں بریلوی علیہ الرحمہ نے نعت کے ایک شعر میں لفظ اجابت کا استعمال کیا ہے اور بہ معنی قبولیت دعا ہے۔

اجابت نے بڑھ کر گلے سے لگایا
بڑھی ناز سے جب دعائے محمدؐ

اصحاب علم وفن اس شعر میں اجابت کے استعمال سے ناک بھوں چڑھاتے نظر آتے ہیں۔ ان کا اعتراض ہے کہ اس کے استعمال سے شعر کا معنوی اور صوری حسن مجروح ہوتا نظر آتا ہے۔ پھر بھی لغوی اور لسانی اعتبار سے اس کے استعمال میں کوئی نقص نہیں ہے۔ لیکن مضمون آفرینی کے پیش نظر اگر ادب ولحاظ کا خیال رکھا جاتا تو بہتر تھا۔ لیکن کیا کیجئے کہ کبھی کبھی بزرگانِ علم وفن سے بھی سہو سرزد ہو جایا کرتے ہیں۔ پھر بھی یہ صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے! کیونکہ اس پر مزید خامہ فرسائی کی گنجائش ہے!

اب سہل ممتنع کی شاعری کے پیش نظر شاعر کی ذہنی وفکری ترجیحات نیز اس کے انا پسند تخلیقی ذہن پر چند باتیں ذیل کے ان اشعار کی روشنی میں سن لیجئے!

(۱) ایسی غزل کہو گے تو مر جائیں گے کئی
فی الفور یہ تو ہوگا ہی ڈر جائیں گے کئی

(۲) زمین شعر کو بخشی بلندی آسمانوں کی
زمانہ میں کسی سے کب مری تقلید ہوتی ہے

○

(۳) لکھی ہی نہیں میں نے کبھی بات پرانی

مطبوع کیا ہی نہیں اس نے کبھی ایضاً

○

(۴) رنگ اعجاز ہو عبادی خون
تیرے اشعار کو اگر گھولوں

○

(۵) تم عبادؔی کو سمجھتے ہو سخن سازوں میں
خیر دنیا بھی سمجھتی ہے خراباتی ہے

○

(۶) کیا شان میں گردن کی کہوں اپنی عبادؔی
ممکن ہے جھکی ہو گی جھکائی نہیں اب تک

○

(۷) سوچ سمجھ کر مجھ سے باتیں کر بھائی
میں بھی کسی کا لگتا ہوں گا ہرجائی

○

(۸) یا تو نہ مرے پاس سے نکلے گی کوئی شئے
یا نکلے گی تو ہو گی غرورِ سرِ گردن

○

(۹) دشتِ پُر ہول ہو، زنداں ہو، نگارستاں ہو
اپنا انداز وہی رنگ جمانے والا
میں جہاں تھوک دوں اک چشمۂ ہاں سے پھوٹے
اور پی کے کوئی سرمست بتانے والا

(۱۰) میں اپنے طرز کے جینے کا آمادہ سدا کا
نہ خوفِ والی و قاضی نہ ڈر کوئی خدا کا

مذکورہ سبھی اشعار مضمون آفرینی اور فکروسوچ کے انا پسند اور تعلّی پسندانہ تخلیقی ذہن کے حوالے سے ایک ہی قبیل کے ہیں۔ خواہ وہ اپنی شعر گوئی کے حوالے سے ہو یا پھر طبیعت کی انا پسندی کے حوالے سے۔

ان سبھی اشعار میں جذبۂ خودشناسی اور خودستائی دونوں ہی ہے۔ بالفرض محال اگر یہ مان لیا جائے کہ یہ اشعار خودستائی سے مملو اور شاعر کے تعلّی پسندانہ تخلیقی ذہن کے غمّاز ہیں تو فکر وفن کے حوالے سے کوئی مضائقہ نہیں۔ میرے نزدیک خودستائی فنکار کی انانیت پسندی ہے۔ اور فنکار کا انانیت پسند ہونا کوئی بُری چیز نہیں ہے۔ البتہ دیکھنا یہ ہے کہ اس کی انانیت پسندی، خوداعتمادی کے راستے اس کی عظمتِ فن کی ضامن بنتی ہے یا نہیں۔

اب یہ دیکھئے کہ شعر نمبر۳ میں شاعر کا یہ دعویٰ کہ اس نے کوئی پرانی بات لکھی ہی نہیں اور ایسی کوئی چیز شائع ہی نہیں کرائی جس کی تخلیق کا خام مواد، فکروسوچ کی ایک ہی عقبی زمین سے فراہم کی گئی ہو۔ ایضاً کے معنی ہی ہوتے ہیں صرف ایک ہی Source Material پر اکتفا کرنا۔ چنانچہ یہ صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے!

پیش کردہ تمام اشعار پر گفتگو ممکن نہیں۔ پھر بھی شاعر کا یہ دعویٰ کہ اس کے تخلیقی ذہن نے تقلید سے حد درجہ اجتناب کیا ہے، کچھ حد تک حق بجانب ہے۔ کیونکہ زیر گفتگو مجموعۂ کلام اپنے ڈکشن اور لفظیات کی سطح پر تیز وتندلب و لہجے کا حامل تو ہے ہی اور اس پر طرّہ یہ کہ لفظیات کا ایسا انتخاب کہ خدا کی پناہ۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس مجموعۂ کلام میں لفظوں کی کرافٹنگ کی گئی ہے۔!

پھر بھی بعض شعروں کی ترکیب دامن کش دل نظر آتی ہے۔ مثلاً ذیل کے اس شعر میں ''سینۂ پا'' کی جدّت پسند ترکیب سے صاحب ذوق قاری کی ضیافتِ طبع تو ہوتی ہی ہے!

چلنے کی تڑپ سینۂ پا میں ہوئی برپا
سَو گرد سی اڑنے لگی جس جا میں کھڑا تھا

ذیل کے اس شعر کے حوالے سے بھی دو چار باتیں مختصراً سن لیجئے!

ابھی وہ رات آئے گی ستارے ہم سناں ہوں گے
میں وہ خوش خواب ہوں سوتے میں بھی بیدار رہتا ہوں

مصرع اولیٰ میں ستاروں کا ہم سناں ہونا محلِ نظر ہے!

آپ جانتے ہیں کہ نظام کہکشاں میں چاند، تارے جمال کے مظہر ہیں۔ نرم رَو اور خنک ولطیف۔ جلال اور غیظ وغضب سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اُردو شعرا نے چاند، تاروں کی جمالیات سے ایک نئے شعری افق

کی تشکیل کی ہے۔ایسے میں ستاروں کا ہم سناں ہونا ایک خلاف فطرت شعری منظر نامہ ہے۔اس قسم کی لامحالہ جدّت پسند شعری ترکیب سے اجتناب کرنا چاہئے۔

جناب خالد عبادیؔ کی غزلیہ شاعری پر کی گئی تبصراتی گفتگو کے اس آخری مرحلے پر اس شعر کے ساتھ اپنی بات ختم کیا چاہتا ہوں جس میں انہوں نے اپنی ایذا طلب طبیعت اور شخصیت کے مزاج و تیور کی عکاسی کی ہے!

پریشانی ہی اپنی مملکت ٹھہری تو وحشت کیا
تصرف جب دلِ وحشی پہ حاصل ہو، شکایت کیا

مجموعہ کلام کے آخری حصّہ میں دس (۱۰) نثری نظمیں شامل کی گئی ہیں۔آپ جانتے ہیں کہ نظموں میں فکر و خیال کے تخلیقی اظہار میں ترتیب و تنظیم کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔شاعر ارتقائے خیال کو ایک کڑی میں سجانے، سنوارنے اور پرونے کی کوشش کرتا ہے۔بے ربطی اور منتشر الخیالی نظم گوئی کے لئے سمِ قاتل کا درجہ رکھتی ہے۔

مشمولہ نظموں کے مطالعہ سے ایسا محسوس ہوا کہ دوران تخلیق شاعر نے اپنی منتشر الخیالی کو ہی مرکز میں رکھا ہے۔لہٰذا ان نظموں کا مبہم اور منتشر الخیال شعری بیانیہ ترسیل فکر و معنی کے راستے میں حائل نظر آتا ہے۔نظم گوئی کے اس جدّت پسند فنی اور تکنیکی طریقۂ کار سے بچنے کی ضرورت تھی۔اگر ایسا ہوتا تو فکر و فن کی سطح پر مشمولہ نظمیں اور بھی کامیاب ہوتی نظر آتیں۔

خیال رہے کہ آزاد نظم، ہو یا نثری نظم دونوں ہی صورتوں میں یہ شعر گوئی کا ایک تخلیقی اظہار یہ ہے جس میں فنکار کا تخلیقی اور فکری مطمح نظر اپنی مبہم پسندی کے باوجود ترسیل کی ذمّہ داری سے عہدہ برآ تو ہونا ہی چاہئے! اردو کے بڑے آزاد نظم گو شعرا نے فکر و فن کے اس بنیادی نکتہ کو ملحوظ رکھا ہے۔خواہ وہ راشدؔ ہوں یا میراؔجی ہوں یا پھر قاضی سلیم، محمد علوی، اختر الایمان، ڈاکٹر سلیم الرحمٰن اور پروینؔ شیر وغیر ہم ہوں۔ان سبھوں نے اپنے تخلیقی فکر و فلسفہ کو مبہم شعری بیانیہ سے بچانے کی حتی الامکان کوشش کی ہے۔

خیر اس گفتگو کو اس معذرت پر ختم کرتا ہوں کہ جناب خالد عبادیؔ نے یہ مجموعۂ کلام ۷رمارچ ۲۰۱۷ء کو عنایت کیا تھا اور آج ۱۰رستمبر ۲۰۲۱ء کو یہ مضمون ختم کر رہا ہوں۔لہٰذا ایک بار پھر میں اپنی اس تساہلی اور عدیم الفرصتی کے لئے معذرت طلب ہوں۔

کتاب کا نام : **اکبر الہ آبادی اپنی شکست کی آواز**

مصنف : اسیم کاویانی مبصر : **ڈاکٹر سرور حسین**

ناشر : کتاب دار، 110/108 جلال منزل، ٹمکر اسٹریٹ، ممبئی۔ 009 400

صفحات : 256 سنہ اشاعت: 2021 قیمت: -/200 روپئے

اکبرالہ آبادی طنز و مزاح کے ایک معروف شاعر تھے۔ اپنی شاعری کے ساٹھ سال کی طویل مدّت کے دوران انھوں نے طنزیہ و مزاحیہ کلام کے علاوہ غزلیں بھی کہیں اور تصوّف کے اشعار بھی۔ لیکن ان کی شاعری کا بڑا حصہ اُن کے عہد کی سماجی، معاشی و سیاسی ناہمواریوں کے خلاف اُن کے اس ردِّعمل پر مبنی رہا ہے جو ان کی مخصوص فکر کی نمائندگی کرتا ہے۔ اُن کی فکری روش جو اُن کے زمانے میں بھی متنازعہ رہی تھی اور عصر حاضر میں بھی اپنی افادیت و معنویت سے محروم نظر آتی ہے قارئین ادب کے باشعور حلقے کے درمیان کبھی قابلِ اعتبار نہیں رہی ۔اُن کی فکری روش جو قدامت پرستی پر سختی سے قائم تھی اور انگریزی کی تعلیم، سائنس، حکمت اور صنعت و حرفت کی نئی پیش قدمیوں کی مخالفت پر ہمیشہ آمادہ رہی ہمارے قومی و جمہوری مفاد کی تکمیل سے قاصر تھی۔ اکبر کی شاعری پر اگر چہ بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن اسیم کاویانی کا زیرِ نظر مقالہ ان معنوں میں قابلِ ذکر کہا جائے گا کہ بعض معروف اہل قلم کی جانب سے اکبر کو حریت پسند، روشن خیال اور قوم پرست ثابت کرنے کی جو ناکام کوششیں منصۂ شہود پر آئیں وہ اکبر کے قد کو تو بلند نہ کر سکیں لیکن خود ان فاضل مصنفین کے قد کو متنازعہ ضرور بنا دیا۔ زیرِ نظر کتاب میں اسیم کاویانی نے شمس الرحمٰن فاروقی، فضیل جعفری، اور اصغر عباس جیسے قلم کاروں کے ذریعہ اکبر کو نیشنلسٹ ثابت کرنے کی سعی ناکام کی سخت گرفت کی ہے۔ فاروقی کے مقالہ ’اکبرالہ آبادی، نوآبادیاتی نظام اور عہدِ حاضر‘ کے حوالے سے جو سہ ماہی ’فکر و تحقیق‘ کے اکبرالہ آبادی نمبر، جنوری تا مارچ 2009 میں شائع ہوا تھا کاویانی لکھتے ہیں کہ:

”فاروقی صاحب کا زورِ قلم اکبر کی کچھ اس طرح کی توضیحات میں صرف ہوا ہے کہ اکبر ایک حریت پسند، تعلیمِ نسواں کے خواہاں اور مغربی استعمار پسندی کے پیش بین ثابت ہو جائیں ۔ان پر لگے مغربی تعلیم، صنعت و حرفت اور سائنس سے نفرت کے الزامات بھی رد ہو جائیں اور ان کا کلام آج بھی گراں قدر کہلائے۔“

اکبر کے دفاع میں فاروقی نے اپنے مذکورہ مضمون میں گاندھی جی اور اقبال کا بھی حوالہ دیتے ہوئے انہیں اکبر کے اس خیال سے متفق بتایا کہ ہندوستان میں ریل، تار اور تجارت وغیرہ انگریز راج کے ہتھکنڈے تھے۔ یہ دراصل نوآبادیاتی حاکم کی قوت کو مستحکم کرنے کی غرض سے ہی حکومت کی جانب سے متعارف کرائے گئے تھے اور

جس کی مخالفت اکبر کے اشعار میں ملتی ہے۔تاہم یہاں گاندھی جی، اکبراور اقبال کا انگریزوں کے اس جدید صنعتی و مشینی نظام کو ان کے نوآبادیاتی نظام کی قوت اور استحکام کے حق میں بتانا ایک حد تک تو درست ہو سکتا ہے تاہم یہ تصویر کا محض ایک رُخ ہے۔تصویر کا دوسرا رُخ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ صنعت وحرفت کا یہ جدید نظام صدیوں سے زمیندارانہ نظام میں جکڑی ہوئی ہندوستانی معیشت کو ترقی کی نئی راہ سے متعارف کرانے کا کام بھی کر رہی تھی۔انگریزی زبان کے توسط سے فکروشعور اور علم وحکمت کے شعبے میں نئے انکشافات وایجادات سے ہم روشناس ہورہے تھے اور نئے صنعتی نظام کی اہمیت ومعنویت ہم پر روشن ہورہی تھی اور درحقیقت یہی فکرونظر ہمارے قومی نظریے کی تشکیل وفروغ کے عمل کا باعث بھی بنی۔لیکن اکبر ہی کیا ہمارے معروف قومی رہنماؤں کی بھی اس حقیقت سے بیگانگی آج آزادی کے پونے ایک صدی کے بعد بھی ہمارے قومی تشخص کی واضح تفہیم کی عدم موجودگی اور عملی سطح پر اس کے ادھورے پن کی ایک بڑی وجہ کہی جاسکتی ہے۔

فاروقی کی طرح فضیل جعفری بھی 'اکبرنوازی' کی اس مہم میں شامل تھے۔انھوں نے بھی اپنے ایک مضمون ''اکبر کا قومی کردار'' میں فاروقی سے بھی آگے بڑھ کر اکبر کو ایک حریت پسند ہی نہیں 'ٹھیٹ قومی شاعر' کا پیش رو قرار دے ڈالا۔اسی طرح اصغرعباس اپنے مقالہ ''سرسید اور اکبرالہ آبادی'' میں اکبر کو سرسید کی فکری روش کا حامی وناصر اور ان کی تحریک کا مضبوط سپاہی ثابت کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھتے۔یہاں وہ سرسید کے حق میں کہے گئے اکبر کے چند توصیفی کلمات کو اپنی دلیل کی بنیاد بنا کر پیش کرتے ہیں جب کہ واقعہ یہ ہے کہ اکبر نے ابتداء میں سرسید کی تحریک کے محض مذہبی پہلو کو نظر میں رکھ کر ہی اُن کی توصیف میں چند جملے کہے تھے۔لیکن جب سرسید کی تحریک کے اصل مقاصد کی مرکزیت روشن ہوئی تو وہ ان کی مخالفت پر اُتر آئے۔اسیم کاویانی ایک باشعور قاری ہیں۔وہ اپنے مطالعے کی بنیاد جدلیاتی طریقۂ استدلال پر رکھتے ہیں۔انھوں نے تجزیوں، دلیلوں اور حوالوں کے ذریعہ اکبر کے قومی نظریے کے حق میں پیش کیے گئے فاروقی، جعفری اور اصغرعباس کی ان دلیلوں کی غیر منطقیت اور مضحکہ خیزی کو اپنے مقالے میں سامنے لانے کی کامیاب سعی کی ہے۔کاویانی اپنے مطالعے کے نتائج کی پیشکش میں کوئی پس وپیش سے کام نہیں لیتے اور دوٹوک الفاظ میں اپنی باتیں کہہ دینا ضروری سمجھتے ہیں۔اُن کے ذیل کے اقتباس پر نظر ڈالیں تو مذکورہ بالا ناقدین ادب کے مطالعے کی سہل پسندی کھل کر سامنے آجاتی ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''اردو کے بیشتر نقادوں کے ذریعہ اکبر کے نظریات کو گزشتہ نو دہائیوں سے مسترد ومردود قرار دیا جاتا رہا ہے۔اس لیے اکبر کی عظمت کا علم بلند کرنے اور اس ہاری ہوئی جنگ کو جیتنے کے لیے فاروقی صاحب کی مجموعی کوششوں کو

دیکھیں تو ایسا لگتا ہے کہ انھوں نے اپنی قابلیت اور علمیت کو سان پر رکھ دیا ہے۔''

کسی منفی رجحانات و روّیے پر مبنی تحریر کے نقصانات کیا ہو سکتے ہیں اسے بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔لیکن ایسی تحریروں کے حق میں اُٹھنے والی آوازیں غلط رجحانات کو بڑھاوا دے کر نقصانات کو جس قدر گہرا اور وسیع کر سکتی ہیں اسیم کاویانی کو اس کا شدید احساس ہے۔اس سلسلے میں وہ پروفیسر مشیر الحق کے ذیل کے خیالات سے مکمل اتفاق ظاہر کرتے ہیں اور جسے وہ اپنی کتاب کے ابتدائیہ میں درج کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ:

''پروفیسر مشیر الحق نے کہیں لکھا ہے کہ ہم عصری بہت بڑا حجاب ہوتی ہے اور یہ تو ہمارا آپ کا روزمرّہ کا مشاہدہ ہے کہ کسی کے خدوخال اس وقت تک پوری طرح ابھر کر سامنے نہیں آتے جب تک اُسے ذرا فاصلے سے نہ دیکھا جائے۔پر ستم ظریفی تو دیکھیے کہ اکبر کی شاعری کے تعلق سے ایک صدی کے بُعد زمانوی کے بعد بھی اور ان کے خیالات اور نظریات کی از کار رفتگی اور پامالی کے بدیہی نتائج سامنے آنے کے باوجود کچھ نقاد اور دانشور ہماری توجہ ان کی فرسودگی سے پھیرنے، نئے حجابات قائم کرنے اور پُرانے بتوں کے نقش و نگار چمکانے یعنی اکبر کے زنگ خوردہ افکار و نظریات کو صیقل کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔اس کی ایک وجہ تو بظاہر یہی نظر آتی ہے کہ اگرچہ پُرانے سکّے اپنی کوئی قیمتِ خرید نہیں رکھتے لیکن ان کی قیمت اچھی وصول کی جا سکتی ہے۔''

زیرِ نظر کتاب کئی عنوانات پر مشتمل ہے جن میں اصغر عباس، شمس الرحمٰن فاروقی اور یونس اگاسکر کے دعووں اور فضیل جعفری کے اکبر کے حوالے سے مضمون کا مدلل جواب پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔اس کے علاوہ قوم پرستی اور اسے دیکھنے کا اکبر کا انداز، مغربی تعلیم، اس کے فوائد اور اس حوالے سے اکبر کا روّیہ، کلامِ اکبر اور اس کے تضادات وغیرہ موضوعات پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔کتاب کے آخر میں جو ضمیمے شامل ہیں اُن میں اصغر عباس، شمس الرحمٰن فاروقی اور فضیل جعفری کے متذکرہ بالا مضامین بطورِ حوالہ پیش کیے گئے ہیں۔

اکبر کی شاعری کے تعلق سے مذکورہ بالا نقادوں کے سوالات کی روشنی میں پیش کی گئی مدلل بحث زیرِ نظر کتاب کی اہمیت پر دال ہے۔اکبر کے کلام پر تحقیقاتی کام کرنے والے محققین کے لیے بھی یہ کتاب انتہائی کار آمد نظر آتی ہے۔مجھے یقین ہے کہ سنجیدہ اور باشعور قارئین ادب اس کی پذیرائی کریں گے۔

کتاب کا نام : **وحشی سعید اور فنِ افسانہ نگاری**

مصنف : شارق عدیل مبصر : **آفاق عالم صدیقی**

سن اشاعت : ۲۰۲۱ء صفحات : ۱۴۴ قیمت : ۳۰۰روپئے

وحشی سعید سینیر ادبی صحافی، شاعر، ناول نگار اور افسانہ نگار ہیں، ان کی خدمات کا دائرہ کافی وسیع ہے۔ اس وقت میرے پیشِ نظر شارق عدیل کی کتاب ''وحشی سعید اور فن افسانہ نگاری'' ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ کتاب کا نام ''وحشی سعید بہ حیثیت فکشن نگار'' ہوتا تو زیادہ موزوں ہوتا۔ شارق عدیل سے میرا ایسا مخلصانہ رشتہ ہے کہ میں بلا تکلف ان کے بارے میں کوئی بھی گفتگو کر سکتا ہوں، وہ بھی اس اعتماد کے ساتھ کہ وہ برا نہیں مانیں گے۔

شارق عدیل ایک تجربہ پسند فنکار اور صاف گو ناقد ہیں۔ ان کے اندر کسی قسم کا دکھاوا نہیں پایا جاتا ہے۔ ان کے دل میں جو بات ہوتی ہے اس کا نہایت بے باکی اور پاک طینتی کے ساتھ اظہار کر دیتے ہیں۔ اگر میں کہوں کہ ان کی شخصیت کا خلوص ہی ان کی تحریر کی پہچان ہے تو غلط نہیں ہوگا۔

شارق عدیل صاحب کی کتاب ''وحشی سعید اور فن افسانہ نگاری'' کی ہر سطر سے وحشی سعید صاحب سے ان کے دلی لگاؤ کی خوشبو پھوٹتی محسوس ہوتی ہے۔ اس کتاب میں شارق عدیل نے وحشی سعید صاحب کے افسانوں، ناولوں، اور ان کے اداریوں کا نہایت اپنائیت کے ساتھ مطالعہ پیش کیا ہے۔ شارق عدیل کے تجزیے اور وحشی سعید صاحب کی فنکارانہ ہنرمندی کی تعریف و توصیف اور ان کی اختصار نویسی کی تعریف و توضیح سے صاف پتہ چلتا ہے کہ وہ وحشی سعید صاحب کے عاشق صادق ہیں۔ اور ہم جانتے ہیں کہ عشق میں وہ طاقت ہوتی ہے جو تمام عیوب پر پردے ڈال دیتی ہے جبکہ خوشامد اور چاپلوسی خوبیوں کو بھی معیوب بنا دیتی ہے۔ یہ بڑی بات ہے کہ شارق عدیل نے نہایت دل جمعی کے ساتھ وحشی سعید صاحب کے افسانوں کا اس طرح تجزیہ کیا ہے کہ افسانوں کی تفہیم بھی آسان ہوگئی ہے اور افسانہ نگار کا مدعا بھی واضح ہوگیا ہے۔

''کنوارے الفاظ کا جزیرہ'' وحشی سعید صاحب کا ایسا افسانوی مجموعہ ہے جس میں ان کے بیس افسانے شامل ہیں۔ اور سبھی افسانے اپنے موضوعات و مواد کے اعتبار سے قاری کو متوجہ کرتے ہیں۔ وحشی سعید صاحب نے اپنے افسانوی مجموعے کا نام بھی بڑا معنی خیز رکھا ہے۔ ''کنوارے الفاظ کا جزیرہ'' ذرا غور فرمائیں کہ آج کل لوگ لفظوں کی حرمت کو جس طرح پامال کر رہے ہیں۔ اور اس کی عصمت کو تار تار کر کے نجی مفادات کے حصول میں لگے ہوئے ہیں۔ اس تناظر میں تو کتاب کا نام ہی ایک گہرے طنز میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ لیکن وحشی سعید صاحب کو

معلوم ہے کہ کنوارے الفاظ کی کائنات معدوم ہو چکی ہے۔ الفاظ اپنے کنوارے پن سے محروم ہو کر بے حیائی کے سمندر میں غرق ہو چکے ہیں۔ اور جو چند الفاظ اپنا کنوارا پن بچانے میں کامیاب ہوئے ہیں وہ ایک جزیرے میں قید ہو کر رہ گئے ہیں۔ یہ وہ جزیرہ ہے جس کے چاروں طرف بے حیائی، بے غیرتی اور بے ضمیری کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ ایسے میں کنوارے الفاظ کے جزیرے کی حفاظت ہر حساس فنکار کی ذمہ داری ہے۔ اس مجموعے میں شامل افسانہ کشکول ہو کہ ''آب حیات''، ''مٹھی، اڑان، آسمان'' ہو کہ ''آتش بیاں''، ''طلسم کلام'' ہو کہ ''پہچان''، ''خودسری'' ہو کہ ''گمراہی''، ''نیا حکمران'' ہو کہ ''منفی کا قاعدہ''، ''اندراج'' ہو کہ ''ارتقاء کا سانحہ''، ''آدھے ادھورے'' ہو کہ ''کرچیوں کا سفر''، ''کہانی کا آسیب'' ہو کہ ''بڑا دروازہ'' یا کوئی دوسرا افسانہ، ہر افسانہ لفظوں اور جذبوں کی پامال ہوتی پاکیزگی کا احساس دلاتا ہے۔ اور زندگی کے کینوس پر بکھرے زندگی کے متضاد رنگوں میں انسانیت کے رنگ کے گم ہونے کے ملال کو افشاں کرتا ہے۔ افسانوں کے پلاٹ میں کساؤ اور بیان میں چستی ہو یا نہ ہو مگر جملوں کی ساخت میں معنویت کی تہہ داری بہرحال پائی جاتی ہے۔ اور افسانے میں ایسے جملوں کی بہتات ہے کہ اگر ایک ایک جملے کی تشریح و تفہیم کی جائے اور اس کے سیاق وسباق کے تناظر میں اس کے انسلاک کی وضاحت کی جائے تو ایک دفتر تیار ہو جائے گا۔ اکثر افسانوں میں کچھ جملے اتنے معنیٰ خیز ہیں کہ ان جملوں میں ہی پوری کہانی سمٹ آئی ہے، ملاحظہ فرمائیے؛

آٹھ سال کی نیلوفر نے سلمٰی سے پوچھا؛

باجی! امی کہاں گئی ہیں؟

بوڑھی آپا نے سلمٰی کے آنسوؤں کو پونچھ کر نیلوفر سے کہا

نیلوفر! اب یہ تمہاری باجی نہیں، امی ہیں۔

(بڑا دروازہ)

گاڑی رک گئی

آپ کا مکان آ گیا ہے: لڑکے نے کہا

آیئے اندر آیئے: لڑکی نے دعوت دی

لگتا ہے اب کے ساون کی بارشوں میں مکان بہہ جائے گا۔ یہ لو تین ہزار روپے اور چھت کی مرمت کروالو۔ (کہانی کا آسیب)

رات کے اندھیرے میں قبرستان کے کنارے ایک تنہا جھونپڑی سے اٹھتی ہوئی دھوئیں کی لکیر زندگی کی واحد علامت تھی۔

(سو گئے داستاں کہتے کہتے)

یہ افسانوں سے اٹھائے گئے جملے ہیں۔مگر توجہ سے دیکھیں تو یہ جملے اتنے مکمل نظر آئیں گے جن میں زندگی کی پوری داستان سما گئی ہے۔یا یوں سمجھیے کہ افسانے کی روح حلول کر گئی ہے۔اسی طرح کے معنی خیز جملوں نے وحشی سعید صاحب کے افسانوں میں جاذبیت پیدا کی ہے۔اور ان کی اختصار نویسی کو تقویت پہونچائی ہے، ایک بار شیفتہ کے سامنے کسی نے میر انیس کا یہ مصرعہ پڑھا۔

آج شبیر پر کیا عالم تنہائی ہے

تو شیفتہ تڑپ اٹھے، اور کہا کہ میر انیس کا سارا مرثیہ تو اس ایک مصرعے میں سمٹ آیا ہے۔ کہنے کا مطلب یہ کہ تخلیقی جملے لکھنا تب تک ممکن نہیں ہو پاتا ہے جب تک فنکار تخلیقی کرب کی لذت سے سرشار نہ ہو۔اور یہ بات تو ہم سبھی لوگ جانتے ہیں کہ تخلیقی کرب کی لذت کا ادراک و احساس صرف انہیں لوگوں کو ہوتا ہے جو ذہنی اور فکری طور پر بانجھ نہیں ہوتے ہیں۔ میں نے جان بوجھ کر وحشی سعید صاحب کے افسانوں کے تجزیے سے گریز کیا ہے اور شارق عدیل کے تجزیاتی مطالعے کی تفہیم میں بخالت سے کام لیا ہے۔ اگر میں ایسا نہیں کرتا تو گفتگو بہت طویل ہو جاتی جسے سمیٹنا آسان نہیں ہوتا۔

جس طرح وحشی سعید صاحب نے اپنے مختصر افسانوں اور افسانوں کے مختصر جملوں میں زندگی کی پوری داستان سمو دی ہے، اسی طرح شارق عدیل نے اپنے مختصر اور جامع تجزیے میں افسانوں کی روح سے معانقہ کرنے اور کرانے میں ہنرمندی کا ثبوت پیش کیا ہے۔شارق عدیل نے نہ صرف یہ کہ وحشی سعید صاحب کے افسانوں کے تجزیے میں اختصار سے کام لیا ہے بلکہ ان کے ناولوں کے تجزیے اور تفہیم میں بھی بہت اختصار سے کام لیا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ شارق عدیل بنیادی طور پر شاعر ہیں۔اور ہم جانتے ہیں کہ شاعری ایجاز و اختصار کا فن ہے۔ کم سے کم لفظوں میں معنیٰ کی نئی کائنات پیدا کر دینے کا آرٹ ہے۔شاعری میں لفظوں کو بہت احتیاط سے استعمال کیا جاتا ہے۔شاعر کی کوشش ہوتی ہے کہ ایک لفظ بھی ایسا استعمال نہ ہو جو شعر کے معنیٰ میں اضافہ نہ کرے۔شارق عدیل اپنی طویل ریاضت کے دوران، ان چیزوں کے عادی ہو چکے ہیں اس لیے وہ اپنے تجزیاتی مطالعے میں بھی اختصار سے کام لیتے ہیں۔ یہاں یہ بات یاد رہے کہ کفایت لفظی صرف شاعری ہی کے خواص کا جزو نہیں ہے یہ

افسانہ نگاری اور تنقید نگاری کا بھی لازمی جزو ہے۔ اس لیے کسی مختصر اور جامع تنقیدی اور تجزیاتی مضمون کے بارے میں عجلت میں کبھی کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہیے۔

''پتھر پتھر آئینہ'' وحشی سعید صاحب کا لکھا ہوا ایک رومانی ناول ہے۔ یہ ناول انسانی محبت اور انانیت کے تاروں سے گندھا ایسا ناول ہے جس میں سماج کے کئی کردار اپنی شخصیت کی باطنی طہارت وخباثت اور فطری معصومیت کے ساتھ زندگی کے کینوس پر رنگوں کے چھینٹے اڑاتے نظر آتے ہیں۔ ان رنگوں میں امیری، غریبی، اونچ نیچ، بے لوث محبت، انانیت کی زہرناکی اور ایمانداری کے رنگ گھلے ملے ہیں۔ مگر جب ناول اپنے اختتام کو پہو نچتا ہے تو صرف ایک رنگ سب پر حاوی نظر آتا ہے، وہ رنگ ہے محبت کا لازوال رنگ۔ محبت کا یہ لازوال اور لافانی رنگ اپنی شدّت تاثیر سے پتھر کو اتنا مجلی بنا دیتا ہے کہ وہ آئینہ بن جاتا ہے، ایسا آئینہ جس پر نہ تو شکوک وشبہات کے غبار نظر آتے ہیں اور نہ اس پر کوئی بال پڑتا دکھتا ہے مگر پتھر کو آئینہ بننے کے اس سفر میں ایسی ایسی آزمائشوں سے گذرنا پڑتا ہے کہ اس کے سارے داغ دھل جاتے ہیں۔ اور اس کی شفافیت کی تازگی اور روشنی روح کے ظلمات کو منور کر دیتی ہے۔ وحشی سعید صاحب نے اپنے اس ناول میں یہ بات واضح کر دی ہے کہ اگر محبت سچی ہو تو، سینے میں پتھر بن کر دھڑکنے والا دل بھی موم بن جاتا ہے۔ محبت کی اس معمولی کہانی کو ہندوستان اور کشمیر کے تناظر میں بھی دیکھا اور سمجھا جا سکتا ہے۔ اس ناول کا تجزیہ کرتے ہوئے شارق عدیل نے اس کی ہر پرت اور کہانی کے ہر موڑ سے قاری کو خوب صورتی سے آگاہ کیا ہے۔ اور حتی المقدور انسانی فطرت پر بھی روشنی ڈالی ہے جس سے ناول کے تاروپود اور اس کے بیانیہ کو سمجھنے میں آسانی پیدا ہو گئی ہے۔

شارق عدیل نے اپنی اس کتاب میں وحشی سعید صاحب کے افسانوی مجموعے ''قصہ دراصل یہ ہے'' کے دس افسانوں کا بھی دل جمعی کے ساتھ مطالعہ کیا ہے اور اس کے اسلوب، اور انداز کے ساتھ ساتھ اس کے بیانیہ کی خوبیوں کو بھی اجاگر کیا ہے۔

شارق عدیل نے سیفی سرونجی کی کتاب ''وحشی سعید... ایک منفرد فکشن نگار'' پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اور اس اپنائیت سے ڈالی ہے کہ سعید پسندوں کی دلچسپی اس کتاب میں بڑھ جاتی ہے۔ شارق عدیل چاہتے تو اپنے اس مضمون کو کتاب کے اخیر میں شامل کر سکتے تھے۔ اس طرح وحشی سعید کے فن کے مطالعے کا تسلسل مجروح نہیں ہوتا اور قاری مطالعاتی آہنگ کے سرور میں پوری کتاب کا مطالعہ ایک سر میں کرتے چلے جاتے۔

شارق عدیل نے وحشی سعید صاحب کے اداریوں کا بھی مطالعہ پیش کیا ہے اور ان کے کچھ منتخب

افسانوں کا تفصیلی تجزیہ بھی پیش کیا ہے۔ جس سے وحشی سعید صاحب کے افسانوں کی تفہیم آسان ہوگئی ہے۔ کتاب کے اخیر میں وحشی سعید صاحب سے لیا گیا انور آفاقی کا انٹرویو شامل ہے جس سے وحشی سعید صاحب کی زندگی اور ادبی خدمات کو سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے۔ مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ شارق عدیل کی یہ کتاب مطالعہ وحشی سعید کے باب میں ایک اضافہ ہے۔ جس کی بہر حال پذیرائی ہونی چاہیے۔

کتاب کا نام : **شگفتِ آگہی**

مصنف : سلیم انصاری مبصر : **خورشید اقبال**

سن اشاعت : 2020 صفحات : 160 قیمت : -/250 روپئے

دنیائے شعر و ادب میں سلیم انصاری صاحب کا نام محتاجِ تعارف نہیں ۔ وہ ایک اچھے نثر نگار کے ساتھ ساتھ شاعر بھی ہیں بلکہ بنیادی طور پر شاعر ہی ہیں ۔ اس بات کا اعتراف انہوں نے اپنے مجموعۂ کلام ''شگفتِ آگہی'' میں '' کچھ اپنی شاعری کے بارے میں'' عنوان کے تحت کیا ہے، شاعری ان کا ادبی ذوق ہے اور اسے اپنی عزت یا شہرت کے حصول کا ذریعہ کبھی نہیں بنایا۔ ان کے ادبی سفر کی ابتدا شاعری سے ہوئی اور ان کا پہلا شعری مجموعہ ''فصلِ آگہی'' کے نام سے ۱۹۹۶ میں منظرِ عام پر آیا جب کہ دوسرا شعری مجموعہ ''شگفتِ آگہی'' کے نام سے ۲۰۲۰ میں شائع ہوا۔ دونوں مجموعوں کے درمیان اتنے طویل یعنی ۲۴ برسوں کے وقفے کا جواز بھی انہوں نے پیش کیا ہے کہ ان کی شاعری کی رفتار بے حد سست رہی ہے۔ سلیم صاحب اپنی شاعری کے متعلق کسی طرح کی خوش فہمی کا شکار کبھی نہیں رہے بلکہ عدم اطمینان اور ملازمت کے دوران غیر ادبی علاقوں میں ہونے والے تبادلوں نے ان کی شاعری کی رفتار کو متاثر کیا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ انہوں نے مقدار سے زیادہ معیار کو اہمیت دی ہے۔

شگفتِ آگہی کی ابتدا حمد ''حرفِ دعا'' سے ہوتی ہے اس کے بعد دو نعت اور چار نعتیہ ماہئے شامل ہیں ۸۰ غزلیں، ۳۶ نظموں کے علاوہ ۱۴ دوہے، تقریباً دو درجن ماہئے / ہائیکو کے علاوہ آزاد غزلیں بھی شامل ہیں ۔ آخر میں ان کے پہلے مجموعۂ کلام فصلِ آگہی کے حوالے سے متعدد ناقدینِ شعر و ادب کی آرا بھی شامل ہیں ۔ نظم و غزل کے علاوہ جو بھی دیگر شعری اصناف اس مجموعہ میں شامل ہیں، ان کے متعلق خود صاحبِ کتاب کی رائے یہ ہے کہ یہ صرف انہوں نے اپنا شعری اور تخلیقی ذائقہ تبدیل کرنے یا احباب کی فرمائش پر ان کی دل جوئی کے لئے کہی ہیں ۔ لہٰذا ان اصناف کو میزان بنا کر ان کی شاعری کے متعلق کوئی حتمی رائے قائم نہ کی جائے بلکہ ان کی شاعری کو پرکھنے کے لئے نظموں اور غزلوں کو ہی معیار بنایا جائے ۔ چونکہ اس مجموعۂ کلام کا بیشتر حصہ غزلوں پر مشتمل ہے لہٰذا

ان کی شاعری پر غزل کے حوالے سے ہی گفتگو کرنا چاہوں گا۔

دنیا میں فنونِ لطیفہ کی سب سے زیادہ مہذب، تربیت یافتہ اور سب سے زیادہ لطیف و دلنشیں صورت ادب ہے۔ادب کی سب سے زیادہ پرانی اور فطری شکل شاعری ہے اور شاعری میں سب سے زیادہ بے ساختہ اور فطری صنف وہ ہے جسے ہم اردو والے غزل کے نام سے پہچانتے ہیں۔غزل جسے پروفیسر رشید احمد صدیقی نے اردو شاعری کی آبرو کہا ہے، بڑی کٹھور صنفِ سخن ہے اس کی بلندی انتہائی مشق اور بڑے ریاض کے بعد ہاتھ آتی ہے۔ بقول آل احمد سرور، غزل آڑے چاول کے دانے پر قل ھواللہ احد لکھنے کا آرٹ ہے، غزل کہنا بہت آسان ہے مگر غزل میں کچھ کہنا، غزل کو غزل بنانا لوہے کے چنے چبانے سے کسی طرح کم نہیں۔غزل کو کٹھور صنفِ سخن اس لئے بھی سمجھا جاتا ہے کہ غزل سب سے زیادہ ہدفِ ملامت بنی مگر وقت نے ثابت کر دیا کہ بات وہی درست ہے جو رشید احمد صدیقی نے کہی تھی کہ ہماری تہذیب غزل میں اور غزل ہماری تہذیب میں ڈھلی ہے۔

جہاں تک سلیم صاحب کی شاعری کا تعلق ہے تو بقول ان کے وہ شاعری کے تئیں ایماندار رہے ہیں۔ انہوں نے جو محسوس کیا وہی لکھا ہے۔اپنے عہد کی صداقتوں سے کبھی صرفِ نظر نہیں کیا۔بقول کالی داس گپتا رضا سلیم صاحب جدید لب و لہجے کے شاعر ہیں مگر وہ محض شاعر نہیں بلکہ جدید مسائل پر پوری نظر ڈال سکنے اور انہیں نظموں اور غزلوں میں سمو سکنے پر قادر ہیں۔نامی انصاری مرحوم نے بھی یہی کہا ہے کہ سلیم انصاری کی غزلوں پر جدید رنگ غالب ہے جس میں تجربے کی آنچ اور مشاہدے کا پرتو نمایاں ہے۔میں اس خیال سے اس حد تک متفق ہوں کہ شعرا تحریکات سے متاثر ہوتے ہیں لیکن شاعری بنیادی طور پر تحریکات کا پرتو نہیں بلکہ شعریت اور کیفیت سے عبارت ہے۔اس لئے شاعر پر گفتگو تحریکات کی روشنی میں نہ کرتے ہوئے ان کے افکار کی روشنی میں کی جائے تو شاعری کا حق ادا ہوتا ہے ورنہ گفتگو جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے پٹارے میں الجھ کر کئی سوالات کو جنم دے دیتی ہے اور شاعری پسِ پردہ چلی جاتی ہے۔میری اس بات کی تائید خود سلیم صاحب کرتے نظر آتے ہیں۔

ہم تو جدیدیت کو بھی مابعد کر چکے
لیکن ادب میں پھر بھی روایت کا دور ہے

سلیم انصاری صاحب ایک پختہ کار شاعر ہیں انہوں نے جذبات و احساسات، مشاہدات اور تجربات کو جدیدیت کے ساتھ بیان کرنے کی کوشش کی ہے اور بہت حد تک کامیاب بھی ہیں۔انہوں نے اپنے تخلیقی عمل سے کبھی منافقت نہیں کی۔اس کا خوبصورت اظہار ''حمد'' کے اس خوبصورت مطلع سے ہوتا ہے۔

جنہیں طلب ہے انہیں مال و زر عطا کر دے
مجھے سلیقۂ عرضِ ہنر عطا کر دے

شمس الرحمٰن فاروقی کی مانیں تو عرضِ ہنر کی ترکیب سب سے پہلے غالب نے استعمال کی۔ غالب کا یہ شعر

ہمارے شعر بہت دل لگی کے ہیں اب اسد
کھلا کہ فائدہ عرضِ ہنر میں خاک نہیں

اس شعر میں یہ المیہ بیان ہوا ہے کہ شاعر نے تو شعر کمال کہے مگر دنیا کے سامنے سستی دل لگی سے زیادہ کچھ نہ ٹھہر سکے، آگے یہی ترکیب عرفان صدیقی نے بھی استعمال کی ہے۔

تم بتاتے تو سمجھتی اسے دنیا عرفان
فائدہ عرضِ ہنر میں تھا ہنر میں کیا تھا

یعنی شعر کہہ کر ایک طرف ڈالتے رہنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ شعر کو سنانا، پیش کرنا اور دنیا کے سامنے شعوری طور پر بے نقاب کرنا بھی ضروری ہے لہٰذا سلیقۂ عرضِ ہنر کا ہونا بھی ضروری ہے۔ سلیم صاحب سلیقۂ عرضِ ہنر سے واقف بھی ہیں اور فن کے تئیں ایمان دار بھی ہیں ستائش اور صلے کی پروا کئے بغیر غزل کی آبیاری کرتے رہے اور حرمتِ فن کی پاسداری کو بھی مقدم رکھا۔

ہمیں ملے ہیں وراثت میں لفظ اور خیال
سو ہم متاعِ سخن کو عزیز رکھتے ہیں
انہیں ہی ملتا نہیں ہے خراجِ علم و ادب
جو لوگ حرمتِ فن کو عزیز رکھتے ہیں

سلیم صاحب نے اپنی غزلوں میں تقریباً وہی لفظیات اور علائم کا استعمال کیا ہے جو ان کے ہم عصروں نے کیا ہے۔ وہ عصری صداقتوں پر یقین رکھتے ہیں لہٰذا غزلوں میں تازہ اور نئے موضوعات کو نئے لب و لہجہ دینے کی کوشش کی ہے اور کامیاب بھی ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

اب عطا کون کرے گا مرا پیکر مجھ کو
کوزہ گر بھول گیا چاک پہ رکھ کر مجھ کو

مجھے بھی کر لیا تقسیم گھر کے ساتھ بچوں نے
ستم یہ ہے کہ میں خود اپنے حصے میں نہیں آیا

ہو لاکھ سبز مگر بانجھ ہی ٹھہرتی ہے
وہ شاخ جس پہ پرندہ نہیں اترتا ہے

سونپ دیتے ہیں ادھورے خواب بچوں کو سلیم
اور اس کے بعد آسانی سے مر جاتے ہیں ہم

غنیم ِ شہر مرا کس قدر مہذب ہے
وہ گردنیں بھی بصد احترام کاٹتا ہے

لہو کی روشنی میں جب اندھیرے کھلنے لگتے ہیں
تو کتنے بند جسموں کے لفافے کھلنے لگتے ہیں

کہانی ہو رہی ہے ختم شاید
کوئی کردار مجھ میں مر رہا ہے

شگفتِ آگہی میں موضوعی وسعت کے بیچ یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ وہ غزل کے خالص روایتی موضوعات یعنی حسن وعشق کا بیان کم کم ہے لیکن وہ زاہدِ خشک بھی نہیں ہیں۔اس کی وجہ شاید یہ رہی ہے کہ شاعر کے جس آتشکدے میں صرف راکھ بچی ہے۔شرارۂ دل بجھ کر رہ گیا ہے یا پھر شاعر ادب میں تماشہ دکھانا پسند نہیں کرتا۔

اپنے زخموں کا غزل میں بھی دکھاوا کرنا
کیا ضروری ہے ادب میں یہ تماشہ کرنا

میں سلیم انصاری صاحب کے انتخاب اور جرأت کو داد اس بنیاد پر دوں گا کہ انہوں نے تخلیقی سطح پر اپنی انا کا مظاہرہ بھی کیا ہے اور اسے تازہ کاری اور خوشگوار حیرتوں سے بھی آشنا کیا ہے۔یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں

جسم کے شوکیس میں محفوظ رکھوں گا اسے
زندگی واپس تو کر ٹوٹا ہوا چہرہ مرا

شور تھا لاٹھیوں کا سڑکوں پر
سانپ گھر کی درار سے نکلا

ساری گلی خاموش ہے لیکن
ایک دریچہ بول رہا ہے

شجر تو کب کا کٹ کر گر چکا ہے
پرندہ شاخ سے لپٹا ہوا ہے

زمیں پر پھل تو آ ٹپکا ہے لیکن
گھنی شاخوں میں پتھر رہ گیا ہے

ان اشعار سے ثابت ہوتا ہے کہ سلیم انصاری منفرد لب و لہجے کے شاعر ہیں لیکن یہ لہجہ چونکا تا ہی نہیں یقین بھی دلاتا ہے کہ شاعر شعوری طور پر خود آ گاہ ہے وہ لہجے کی جدت کے پردے میں اپنی انفرادیت مسلم کرتا دکھائی دیتا ہے اور باور کراتا ہے کہ شاعری تجربات سے زیادہ کیف و انبساط فراہم کرنے کا نام ہے۔ مسرت سے بصیرت تک کے سفر پر آمادہ کرنے کا نام ہے اور اس امتیازی سوچ کی بنیاد پر وہ اپنے ہم عصروں میں منفرد اور ممتاز نظر آتا ہے۔ بقول شمس الرحمٰن فاروقی ایک اچھے شاعر کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ آپ سے تقاضا کرے کہ آپ اسے بھر پور پڑھیں۔ اس کی گہرائیوں میں اتریں پھر دیکھیں کہ اس دریا میں کتنے اور کئی طرح کے موتی ہیں۔ میرے خیال میں سلیم انصاری ایسے شاعر ہیں جن کی خوبیوں کو چند جملوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ گزرتے وقت کے ساتھ ان کی شاعری کا قد اتنا تناور تو ضرور ہو جائے گا جہاں موضوعاتی اور اسلوبیاتی سطح پر لوگ انہیں موضوعِ سخن بنائیں گے۔

کتاب کا نام : **ٹکسال**

شاعر : تفضیل احمد مبصر : **معراج احمد معراج**

سنِ اشاعت: ۲۰۱۶ء صفحات : ۲۳۲ قیمت : ۲۰۰، روپئے

راہی فدائی نے تفضیل احمد کی شاعری کے تعلق سے جو کہا ہے اس سے اتفاق کیا جا سکتا ہے، وہ کہتے ہیں کہ ''نئی لفظیات اور نئے خیالات کے ذریعہ انہوں نے خود اپنا لہجہ تراشا ہے''

تفضیل احمد دنیائے شعر و ادب میں تیزی سے اپنی ایک مستحکم شناخت بنانے میں منہمک ہیں۔ حال ہی میں ان کا شعری مجموعہ ''ٹکسال'' کے نام سے منصۂ شہود پر آیا ہے۔ اس کی اشاعت محکمۂ راج بھاشا کے مالی تعاون سے ہوئی ہے۔ اس کتاب کو انہوں نے اپنے اساتذہ زیب غوری، لطف الرحمٰن اور شعیب شمس سے منسوب کیا

ہے۔اس کا مقدمہ خود تفضیل احمد نے لکھا ہے۔مقدمہ بہت شاندار لکھا گیا ہے۔ تفضیل احمد کی شاعری سے متعلق مصحف اقبال توصیفی، آفاق عالم صدیقی اور فاروق راہب کے مضامین مختصر مگر جامع ہیں، اس سے تفضیل احمد کی علمیت ولیاقت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ہر غزل ہی کافی متاثر کن ہے۔ان کے اشعار میں مضمون آفرینی کے ساتھ ساتھ معنی آفرینی بھی ہے۔

’ٹکسال‘ میں تفضیل احمد نے جو شاعری کی ہے وہ سرسری طور پر ورق گردانی کی جانے والی شاعری نہیں ہے۔جگہ جگہ قاری کو رکنا پڑے گا کیوں کہ بعض اشعار چونکا دیتے ہیں اور بعض فکر کی جھیل میں غوطہ زنی کرنے پر مجبور کرردیتے ہیں۔انہوں نے جو بھی شعر کہے ہیں اس میں معنویت کی لہر دوڑ رہی ہے۔ان کی غزلوں میں ان کی اپنی ذات ہی کی نہیں بلکہ تمام کائنات کی ترجمانی ہوتی ہے۔ان کے شعروں میں آفاقی موضوعات زیادہ پائے جاتے ہیں۔انہوں نے بہت حد تک روایت پسندی سے اپنا دامن بچانے کی کوشش کی ہے،یعنی ان کے شعروں میں جدید خیالات کی عکاسی زیادہ ہے۔مزید برآں زندگی کے انہی سب مسائل کی ترجمانی ان کے کلام سے ہوتی ہے جن سے ایک عام آدمی گزرتا ہے۔ان کے شعروں میں تشبیہات،واستعارات و کنایات سب کچھ موجود ہیں۔بس اتنا کہنا بہتر ہوگا کہ انہوں نے اپنے ضمیر کی آواز کو اشعار کا پیرہن عطا کردیا ہے۔چند اشعار پیش ہیں؛

چراغِ ریختہ ناہید کرنے آیا ہوں
نئے زبر نئی تشدید کرنے آیا ہوں

جانے کیسے آناً فاناً ہو جاتا ہے
پورا گردوں خالی برتن ہو جاتا ہے

کر دے فلک کو پردۂ سیمیں مرے لیے
جو خلق ہو چکا ہے مجھے بھی دکھائی دے

جب ہوائیں بھنور بناتی ہیں
خواہشیں جانور بناتی ہیں

ہم سے کی زندگی نے محبت مگر
رن میں جیتی ہوئی عورتوں کی طرح

مجموعۂ کلام ''ٹکسال'' کی طباعت اور کاغذات عمدہ ہیں۔اس کتاب کی اشاعت پر انہیں دلی مبارکباد پیش ہے۔

کتاب کا نام : **منتخب نظمیں**

شاعر : ڈاکٹر علی عباس امید مبصر : **معراج احمد معراج**

صفحات : ۱۳۶ قیمت : ۳۰۰ روپے

ڈاکٹر علی عباس امید کو پہلی بار پڑھنے کا شرف حاصل ہوا۔یقین جانئے کہ ان کے کلام نے بہت متاثر کیا۔بھوپال سے تعلق رکھنے والے شاعر ڈاکٹر علی عباس امید،یقیناً اپنی شاعری خصوصاً نظموں کے حوالے سے ہمیشہ یاد کیے جائیں گے۔ان کا مجموعۂ منظومات ''منتخب نظمیں'' معنی خیز نظموں سے بھرا ہوا ہے۔کئی عنوانات کے تحت انہوں نے نظمیں لکھی ہیں۔موضوعاتی نظمیں لکھنا کوئی آسان کام نہیں،لیکن جس خوبصورتی اور برجستگی سے انہوں نے نظمیں کہی ہیں،اور جس طرح سے انہوں نے اپنے موضوعات کے ساتھ انصاف کیا ہے وہ انہیں کا خاصہ ہے۔ان کی نظمیں جن میں زندگی کے کیف و کرب پنہاں ہیں،بہت متاثر کن ہیں۔اپنے جذبات مشاہدات کو نظم کے پیکر میں ڈھالنے کا ہنر انہیں خوب آتا ہے۔غزل کہنے سے زیادہ مشکل کام نظم نگاری ہے،اور اس صنف کو برتنے میں انہوں نے اپنا کمالِ فن دکھایا ہے۔

اس مجموعے میں ۶۸ نظمیں ہیں۔کچھ پابند ہیں تو کچھ آزاد اور دو ایک نثری نظمیں بھی ہیں۔تمام نظمیں اپنے مواد و موضوعات کے اعتبار سے متاثر کن ہیں۔نظم میں جو وحدتِ خیال ہونی چاہئے وہ ان کی ہر نظم میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ان کی رومانی نظم ''میری محبوب ٹھہر'' نے ذہن پر گہرے نقوش مرتسم کیے لیکن ''محبوب'' کو تانیث کے صیغے میں رکھ کر انہوں نے ایک نئی روش کا آغاز کیا ہے۔

وہ چند نظمیں جن میں مفاہیم و مطالب کا ایک سمندر موجزن ہے وہ یہ ہیں؛آبلہ پائی،نوکِ خار،نوحہ گر،برگد،خواب خواب آرزو،آنسوؤں کے درمیان،مداوا،زرد گلاب کا نوحہ وغیرہ۔امید ہے کہ ڈاکٹر علی عباس امید اسی طرح اپنی بارشِ فکر و نظر سے زمین و شعر و ادب کی آبیاری کرتے رہیں گے۔کتاب کی اشاعت بڑی خوبصورت ہوئی ہے۔

مکتوبات

محترم

تسلیمات

عالمی فلک کا شمارہ جولائی تا ستمبر موصول ہوا۔اس عنایت کا شکریہ۔

مشمولات پسند نہیں آئے۔سرور حسین کے مضمون کے علاوہ کچھ بھی قابل مطالعہ نہیں ہے۔سب سے گھٹیا مضمون ابولمجاہد زاہد پر احمد سجاد کا ہے۔یہ صاحب کہاں کے شاعر ہو گئے۔کبھی انہیں دیکھا نہیں۔معیاری چیزیں نہیں ملتی ہیں۔تو تراجم شائع کیجئے۔اردو قاری کو معلوم تو ہو دوسری زبانوں میں کیا لکھا جارہا ہے۔

خاکسار

شموئل احمد

عالمی فلک کا تازہ شمارہ (جولائی تا ستمبر) کچھ تاخیر سے مجھ تک پہنچا۔حالانکہ رسالہ بہت قبل میرے آبائی گھر پہنچ گیا تھا۔قصور میرا ہے کہ میں ہی تاخیر سے وہاں پہنچا۔اصل میں، میں ان دنوں ذاتی مکان میں منتقل ہو گیا ہوں۔جس کی وجہ سے کچھ رسالے میرے پرانے پتے پر پہنچتے ہیں اور پھر جب میں دس پندرہ دنوں میں وہاں جاتا ہوں تو ڈاک کی ساری چیزیں سمیٹ لاتا ہوں۔دو تین روز قبل جب میں گھر گیا تو عالمی فلک کو اپنا منتظر پا کر بے حد مسرور ہوا اور پھر قریب تین چار دنوں سے یہ ہمہ وقت میرے ساتھ ہے۔

نثار بھائی میں آپ کی ہمت اور حوصلے کی داد دیتا ہوں کہ آپ نے ناسازگار ماحول میں بھی جھارکھنڈ جیسی جگہ سے عالمی فلک کو تواتر کے ساتھ شائع کیا۔یہ آپ کی محنت کا آئینہ ہے کہ آپ نے کم مدت میں ادبی فلک کے کئی اہم ستاروں کو اپنے صفحات میں اتارا ہے۔معیار شمارہ در شمارہ بہتر ہوتا جارہا ہے۔بس ایک بات پر دھیان دینے کی ضرورت ہے وہ ہے پروف ریڈنگ۔کئی جگہ پڑھتے وقت یہ بات کھٹکتی ہے۔امید ہے آئندہ شمارے میں یہ کمیاں بھی دور ہو جائیں گی۔افسانوں میں سلام بن رزاق، مشتاق احمد نوری، نورالحسنین، اسلم جمشید پوری، ناصر راہی، رخشندہ روحی نے متاثر کیا۔ویسے دوسری کہانیاں بھی اچھی ہیں۔مراٹھی کہانی بغاوت بھی بے حد پسند آئی۔یہ آپ کی طرف سے اچھی کوشش ہے کہ اردو کے ساتھ دیگر زبانوں کے تراجم بھی آپ پیش کر رہے ہیں۔اس سے دوسری زبان کے ادب سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔مضامین میں بطور خاص میں قدوس جاوید کا مضمون ''مشرف عالم

ذوقی: دوانہ مرگیا آخرو یرانے پر کیا گزری'' کا ذکر کرنا چاہوں گا کہ انہوں نے مشرف عالم ذوقی پر مضمون لکھ کر انہیں ایک طرح سے خراج عقیدت پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ واقعی مشرف عالم ذوقی ادب کا ایک ایسا دیوانہ تھا جنہوں نے لکھنے کے معاملے میں جہاں اپنی دیوانگی دکھائی وہیں، جادوئی تحریر اور مقناطیسی کشش کے باعث قاری کو اپنا گرویدہ بھی بنایا۔

تبصرے میں کئی کتابیں شامل ہیں۔ میری تنقیدی کتاب ''تنویر اختر رونی: شخص اور افسانہ نگار'' پر جناب محمد غالب نشتر کا تبصرہ شامل کر کے آپ نے مجھ پر ایک طرح کا احسان کیا ہے۔

مجھے امید ہے کہ عالمی فلک کا جو ادبی فلک ہے وہ مستقبل قریب میں اور بھی اہم ستاروں سے جگمگاتا ہوا دکھائی دے گا۔

ڈاکٹر اختر آزاد

محترمی احمد نثار صاحب

سلام مسنون

عالمی فلک کتابی سلسلہ نمبر ۴ موصول ہوا اس عنایت کے لئے ممنون ہوں۔ عالمی فلک کا یہ شمارہ بھی اپنی تمام تر سابقہ روایات اور مشمولات کے ساتھ ایوانِ ادب میں ایک نئے منشور کی بنیاد رکھنے میں کامیاب ہے، جس کے لئے یقینی طور پر آپ کی کوششیں اور جذبۂ خدمت اردو قابلِ تحسین ہیں۔ میں اداریے میں آپ کی اس تشویشناک تحریر سے متفق ہوں کہ کرونا کال میں ہم کو کئی اہم ادبی شخصیات داغِ مفارقت دے گئیں جن سے ادب کے سنجیدہ قارئین کو بہت امیدیں تھیں۔ یقیناً ادب کا یہ نقصان نا قابلِ تلافی ہے۔

عصری مکالمے کے تحت ڈاکٹر سرور حسین نے اپنے مختصر سے مضمون میں ایک کارآمد ادبی اور تنقیدی مکالمہ قائم کیا ہے۔ ان کا یہ مکالمہ نئی نسل کے نقادوں اور سنجیدہ قارئین کے لئے لمحۂ فکریہ ہے کہ معاصر تنقید فلسفے کی اہمیت سے نہ صرف انکار کرتی ہے بلکہ اس کے خاتمے پر بھی زور دیتی ہے۔ پروفیسر قدوس جاوید کا تفصیلی مضمون ''دوانہ مرگیا آخر کو دیوانے پہ کیا گزری'' سچ مچ مشرف عال ذوقی کو ایک بہترین خراج ہے اور نہایت عمدگی سے لکھا گیا ہے۔ نہ جانے کیوں مجھے مضمون نگار کی اس بات سے اتفاق نہ کرنے کو جی چاہتا ہے کہ مشرف عام ذوقی کے ساتھ ناقدین نے انصاف نہیں کیا۔ مجھے تو لگتا ہے کہ مشرف عالم ذوقی کو کبھی کسی ناقد کی ضرورت ہی نہیں رہی، کیونکہ ان کی بے باک عصری تحریریں براہِ راست قارئین کے ایک بڑے حلقے تک پہنچ جاتی تھیں۔ میں سمجھتا ہوں

کہ موجودہ عہد میں ذوقی ہی ایک ایسے ادیب اور قلم کار تھے جن کے حصے میں اردو قارئین کی ایک بہت بڑی تعداد آئی۔اس اعتبار سے دیکھیں تو ذوقی کی ریڈرشپ بہت زیادہ ہے۔بہر حال ذوقی پر ابھی بہت کچھ لکھا جانا باقی ہے۔پروفیسر احمد سجاد نے ابوالمجاہد زاہد کی شاعری کو رنگ و نور اور صحت مند انسانی اور معاشرتی اقدار کے حوالے سے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔

عالمی فلک کے زیرِ نظر شمارے میں ڈاکٹر صفدر امام قادری کا ایک اہم مضمون شامل ہے جس میں انہوں نے سلطان اختر کی شاعری کو نئے ابعاد اور نئی دشاؤں میں روشن کرنے کی کوشش کی ہے۔سلطان اختر ہماری جدید شاعری کے بنیاد گزاروں میں ہیں،اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ روایتی شاعری کی توڑ پھوڑ کے ساتھ جدید شاعری کی تشکیل و تعمیر کے بھی چشم دید گواہ رہے ہیں۔کرونا کال میں ان کی رحلت نے اردو ادب خصوصاً اردو شاعری کا بڑا نقصان کیا ہے،یعنی ہوائے وقت نے غزل کے قصر میں اس آخری آواز کو بھی خاموش کر دیا۔ڈاکٹر فخر الکریم کا مضمون پریم چند شناسی قابلِ مطالعہ ہے اور زمانہ کانپور سے پریم چند کے روابط کو روشن کرتا ہے۔پی پی شریواستو رند کا مضمون اگر چہ مختصر ہے مگر زار علامی جیسے مستند رباعی گو کی تخلیقی اور تنقیدی صلاحیتوں سے روشناس ہونے کا موقع دیتا ہے۔جون ایلیا کے یہاں ذات و حیات کے کرب کے حوالے سے ڈاکٹر معصوم شرقی نے عمدہ مضمون لکھا ہے،ان کے مطابق مہاجر شعراء کے یہاں ہجرت کا کرب اولین حیثیت رکھتا ہے لیکن جون کے یہاں اس کے اثرات کچھ زیادہ ہی دامن گیر ہیں اگر چہ مضمون نگار نے یہ بھی لکھا ہے کہ ہجرت کے بعد ہی سے جون ایلیا نفسیاتی بحران کا شکار ہو گئے تھے۔بہر حال میرے نزدیک جون ایلیا کی شاعری کا کینوس بہت وسیع ہے،خصوصاً ان کی زبان اور کاٹ دار لہجے میں زندگی کے کرب کو بیان کرنے کا اسلوب منفرد ہے۔یہی وجہ ہے کہ موجود عہد کے وہ سارے نوجوان ہندی شعراء جو اردو شاعری سے عشق کرتے ہیں مگر رسم الخط سے ناواقف ہیں جون کو اپنا آئیڈیل بنائے ہوئے ہیں۔ظہیر غازیپوری کی شاعری پر ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی کا مضمون پڑھ کر مجھے اس لئے بھی اچھا لگا کیونکہ ظہیر غازیپوری جیسے قابلِ قدر شاعر پر بہت کم لکھا گیا ہے۔خورشید حیات نے تنقید کی کشتی پر سوار دو سند باد یعنی شہاب ظفر اعظمی اور حقانی القاسمی کی تنقیدی بصیرتوں کا تعارف اپنے مخصوص لب و لہجے اور زبان میں کرایا ہے۔

افسانوں کے باب میں سب سے پہلا افسانہ سلام بن رزاق کا کھرونچ ہے جس کا تانا بانا ریلوے اسٹیشن پر بھیک مانگنے والوں کے ہنر کے ارد گرد بنا گیا ہے۔ہوتا یوں ہے کہ ایک اندھی بھکارن ہے جو لنگڑے کے بچے گپو کی پیٹھ میں چمیٹے سے کاٹ کر اسے رلاتی ہے تا کہ زیادہ بھیک مل سکے،مگر ایک دن چمیٹے سے

کاٹنے کے باوجود گپو نہیں روتا اور اس طرح اندھی بھکارن کو بھیک بھی زیادہ نہیں ملتی اور جھونپڑی پہنچتے ہی جب غصے میں لات مار کر لنگڑا گپو سے نہ رونے کی وجہ دریافت کرتا ہے تو گپو بڑی سادگی سے جواب دیتا ہے کہ اب اسے رونا نہیں آتا۔افسانے کی زبان بمبئی کے بھکاریوں کی خالص زبان ہے۔مشتاق احمد نوری کا افسانہ چھت پہ ٹھہری دھوپ دراصل ایک رومانی افسانہ ہے جس کے دونوں مرکزی کردار شادی شدہ زندگی جی رہے ہیں، مگر وہ اپنے عشق کی کھٹی میٹھی یادوں، جذبوں اور لمحوں میں ایک دوسرے کو محسوس کرنے کی نفسیات سے باہر نہیں نکل سکے ہیں اور عمر کی چھت پہ ٹھہری ہوئی دھوپ میں اپنے گمشدہ جذبوں کو شدت سے محسوس کر رہے ہیں۔نور الحسنین کا افسانہ یہ عشق نہیں آساں بھی ایک رومانی افسانہ ہے جس میں نواب زادے فضل محمد اور رخسانہ اتفاقیہ طور پر میلے میں ملتے ہیں اور ان کے درمیان عشق ہو جاتا ہے بعد میں دونوں کو ایک ساتھ نواب صاحب دیکھ کر غصے میں لال ہو جاتے ہیں اور فضل محمد کو بے تحاشہ مارنے لگتے ہیں۔اس کے بعد فضل محمد گھر سے نکل جاتا ہے اور جو پہلی ٹرین اسے ملتی ہے اس میں بیٹھ کر چلا جاتا ہے۔اس طرح وہ ایک ایسے شخص کے رابطے میں آتا ہے جو پلمبنگ کے ٹھیکے لیتا ہے، فضل محمد پلمبنگ کا کام سیکھ کے اس ٹھیکے دار کا کام سنبھال لیتا ہے ۔ اس طرح کہانی آگے بڑھتی رہتی ہے۔فضل محمد واپس آتا ہے اپنے والد نواب رحیم یار خاں کی دیوڑھی کی میں وہاں اس کی ملاقات رخسانہ سے ہوتی ہے، فضل محمد رخسانہ کو شادی کی پیش کش بھی کرتا ہے مگر رخسانہ انکار کر دیتی ،فضل محمد خستہ حال دیوڑھی کی مرمت کی بھی پیش کش کرتا ہے اس میں بھی اسے انکار کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔اس طرح فضل محمد اور رخسانہ دونوں ایک دوسرے کے نہیں ہو سکے۔

عالمی فلک کے اسی شمارے میں پروفیسر اسلم جمشید پوری کا ایک افسانہ اپنی آگ میں جلتے لوگ بھی شامل ہے۔جس کا کینوس وسیع ہے، اس افسانے میں کسانوں کے مسائل و مصائب اور ان کی زبوں حالی کے علاوہ گاؤں کے سیاسی ،سماجی اور معاشی مسائل پر گفتگو کی گئی ہے۔یہی نہیں گنا کسانوں کے حالات اور سرکاری وعدوں کے کھوکھلے پن کو اسلم جمشید پوری نے نہایت فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے جس کے لئے وہ قابل مبارک باد ہیں۔اسی شمارے میں خاور چودھری پاکستان کا ایک افسانہ پگ بھی شامل ہے جو قابل مطالعہ ہے۔منیرہ سورتی کا افسانہ نانو کا انتقال پر ملال، جنریشن گیپ کی عمدہ مثال اور زندگی سے بھرپور افسانہ ہے، جس میں انسان کی خودغرضی اور جبلت کو نہایت خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے۔اس کے علاوہ عالمی فلک میں شامل افسانوں میں مہر افروز کا سایوں کا تعاقب ،ملکیت سنگھ مچھانا کا جوتا اور ذاکر فیضی کا زندہ آتما شمارے کے وقار میں اضافے کا سبب ہیں۔

منظوم حصے میں ستیہ پال آنند، طاہر حنفی، اور حفیظ تبسم کی نظمیں عصری شاعری کا معیاری انتخاب ہیں،

اس کے علاوہ اس خاکسار کی بھی تین نظمیں اسی شمارے میں شامل ہیں، جو یقینی طور پر پڑھے جانے کی مستحق ہیں۔ غزلوں کے باب میں کرشن کمار طور، شعیب نظام، جینت پرمار، عطا عابدی اور رسول ساقی وغیرہ کی غزلیں عالمی فلک کے معیار و مزاج میں اضافہ کرتی ہیں۔ دیگر زبانوں کے ادب کی تحت رینو بہل کا ان کہی داستان کا اردو ترجمہ بہت عمدہ اور اپنے اصل متن کے قریب معلوم ہوتا ہے۔ ان کے ترجمے میں خلیل جبران اور ان کی زندگی کے کئی اہم پہلو ذہن کے پردے پر روشن ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ اسلم مرزا کی ترجمہ شدہ مراٹھی نظمیں اور احمد کمال حشمی کی ترجمہ شدہ بنگلہ نظم کی شمولیت زبانوں کے مابین نہ صرف خیال بلکہ اسلوب اور لہجے کو بھی ساجھا کرنے کے مترادف ہے۔

عالمی فلک نے اپنی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے اس بار بھی سات کتابوں پر تبصرے شامل کئے ہیں، جس کے لئے میں محترم احمد نثار کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ اس لئے بھی کہ اس دورِ گرانی میں انہوں نے عالمی فلک جیسا ضخیم اردو رسالہ نہ صرف جاری کیا بلکہ یکے بعد دیگرے چار شمارے بھی شائع کر دیے اور وہ بھی اپنے ذاتی صرفے سے میں اللہ سے دعا گو ہوں کہ ان کے حوصلوں کو مزید استحکام بخشے آمین۔

سلیم انصاری (جبل پور)

محبِ مکرم

عالمی فلک ۳ میں شائع محترم رؤف خیر صاحب کے مضمون کے مطابق، رشید حسن خان نے مثنوی سحرالبیان کے ایک مخطوطے کی نقل کے لیے کالی داس گپتا رضا سے کہا تھا، جس کو کالی داس گپتا رضا نے محترم رؤف خیر صاحب سے منگوا کر رشید حسن خان صاحب کو خود پہنچا دیا۔ محترم رؤف خیر صاحب نے یعقوب میراں مجتہدی کی بچی کی شادی میں رشید حسن خان کو سلام کرتے ہوئے خود کو متعارف کرایا تو رشید حسن خان صاحب نے عصا کے سہارے فوری اُٹھ کر اُن کو گلے لگایا اور فرمایا: ''میں اپنی کتاب میں آپ کا شکریہ ادا کر رہا ہوں۔''

آگے محترم رؤف خیر صاحب لکھتے ہیں: ''حیدرآبادی ادیب شاعر پریشان تھے کہ رؤف خیر صاحب سے ملنے کے لیے خان صاحب سیٹ سے اُٹھتے ہیں اور کچھ شکریہ ادا کرنے کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ آخر ماجرا کیا ہے؟'' اس حیرت کا جب محترم رؤف خیر صاحب کو اندازہ ہو گیا تو رشید حسن خان کا بھی اس حیرت سے دوچار ہو جانا لازمی تھا۔ کیوں کہ رشید حسن خان کے پاس دوسروں کے قد ناپنے کے بے شمار دراز فیتے تھے۔

اور پھر یہ بھی کہ رشید حسن خان نے مخطوطے کے لیے کالی داس گپتا رضا سے کہا تھا، جس کو کالی داس

گیتارضا نے کسی طرح رشید حسن خان کو مہیا کروادیا۔جس کے عوض میں رشید حسن خان نے کالی داس گیتارضا کا شکریہ ادا کردیا۔بات ختم ہوگئی۔ہاں محترم رؤف خیر صاحب کا شکریہ ادا کرتے تو کالی داس گیتارضا کرتے۔جب رشید حسن خان نے محترم رؤف خیر صاحب کا شکریہ ادا نہ کیا تو محترم رؤف خیر صاحب کے تن بدن میں ایسی آگ لگی کہ اُنھوں نے ڈاکٹر ٹی۔آر۔رینا کے خطوط اور خان صاحب کے وطن شاہ جہاں پور کے ذمہ دار شاعروں ادیبوں سے رابطہ کر کے رشید حسن خان کے نماز نہ پڑھنے اور خدا کو نہ ماننے کو اپنے مضمون میں بار بار دہرانے کی حد کردی۔اس مد میں یہ:''کوئی کیا کرتا ہے.؟محترم رؤف خیر صاحب کو اس سے کیا؟وہ تو خود کو دیکھیں۔''

مجھے لگتا ہے محترم رؤف خیر صاحب نے رشید حسن خاں کے خطوط ٹھیک سے پڑھے نہیں۔کیوں کہ ڈاکٹر ٹی۔آر۔رینا کے ذریعے 1827 خطوط میں تقریباً 60% خطوط میں رشید حسن خان نے لوگوں کے لیے دعائیں کی ہیں۔ڈاکٹر نیر مسعود رضوی کی بچی کے لیے لکھا ہے:''خدائے پاک (اگر وہ کہیں ہے) اس بچی کو جلد تر شفا دے۔''اس جملے میں عقیدت کی بازگشت ساتوں آسمان پار کرتی ہوئی محسوس ہو رہی ہے۔کوئی سمجھے تو سہی۔

رشید حسن خان کا ایک خط جو ڈاکٹر ٹی۔آر۔رینا نے رشید حسن خان کے خطوط جلد دوئم میں صفحہ ۵۹۵ر پر میکش اکبرآبادی کے نام شائع کیا ملاحظہ فرمائیں۔

بنام میکش اکبرآبادی

F/4, Jublilee Hall

Mall Road, Delhi-7

۱۲رمئی ۱۹۷۲ء

مخدومِ بندہ۔نیازمندانہ آداب بجالاتا ہوں۔

گرامی نامے نے سرفراز کیا۔اپنی بے توفیقی کیا عرض کروں ۵۹ء دہلی آیا تھا،خیال یہ تھا کہ اوّلین فرصت میں تاج محل کو دیکھوں گا۔اب تک وہ ساعتِ سعید نہیں آئی ہے۔ہر سال پروگرام بناتا ہوں اور رہ جاتا ہوں۔اِس جنگ کے دوران بار ہا یہ خیال آیا کہ خدانکردہ اس عمارت کو کوئی نقصان پہنچ گیا تو کیا ہوگا۔آنکھیں محروم ہی رہیں گی۔

اس بار پھر یہ ارادہ کیا ہے کہ اکتوبر کے شروع میں سفر کیا جائے۔ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس طرح آپ کی خدمت میں حاضری دے کر سعادت اندوزی کی جا سکے گی۔اور یہ واقعی بڑے شرف کی بات ہوگی۔دعا فرمایئے

کہ اس بار اس سعادت سے محروم نہ رہوں۔ میں تو خدا کو مانتا ہوں، پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ فتح العزائم کے پھیر میں کیوں مبتلا کر دیا گیا ہوں۔

چوں کہ اس بار اِس سفر کے لیے آپ سے توجّہ کا طلب گار رہوا ہوں، اس لیے اس کی امید ہے کہ اب یہ سفر ضرور انجام کو پہنچے گا۔ میں یونی ورسٹی کے ہوسٹل میں رہتا ہوں اور وہاں کا پتا اوپر درج ہے۔ ملتمس ہوں کہ کبھی کبھی گرامی ناموں سے سرفراز کیا جاتا رہوں۔ آپ کا یہ شعر اکثر دہراتا رہتا ہوں۔ کیا بے مثال، بلیغ اور پر کیف شعر ہے:

بوئے گل، رنگِ چمن اور یہ عمرِ گزراں
سب ٹھہر جائیں گے ،کوئی اُسے روکے تو سہی

مندرجہ ذیل جملے رشید حسن خان نے خط کے حاشیے میں لکھے ہیں جن کو ڈاکٹر ٹی۔آر۔رینا شائع کرنے سے بھول گئے۔اس لیے رشید حسن خان کے دستی خط کی زیراکس ثبوتاً ارسال کر رہا ہوں:

وہ جملے اس طرح ہیں:(اگر ممنون صاحب کو آپ کے طفیل میں سر چھپانے کی جگہ مل گئی تو خواہ آپ کی بزرگی کے لیے یہ کوئی بات نہ ہو۔لیکن میری نیاز مندی کے لیے یہ بہت بڑی بات ہوگی۔ایسی ہی باتوں پر سجدۂ شکر واجب ہو جاتا ہے۔)

خادم رشید حسن

مندجہ بالا خط کو غور سے دیکھیں۔رشید حسن خان نے جس میں خود کو(مخدومِ بندہ۔میں تو خدا کو مانتا ہوں۔میری نیاز مندی کے لیے یہ بہت بڑی بات ہوگی۔ایسی ہی باتوں پر سجدۂ شکر واجب ہو جاتا ہے)اور آخر میں رشید حسن خاں نے خود کو خادم اور خادم کے بعد رشید حسن خان کے بجائے صرف رشید حسن لکھا یعنی کہ اپنی خان صاحبی خود اُڑا لی۔دیکھا محترم رؤف خیر صاحب وہ خدا کو بھی مانتے تھے اور خانوادوں کو بھی۔محترم رؤف خیر صاحب نے رشید حسن خان کے خطوط پڑھے ہی نہیں۔محترم رؤف خیر صاحب نے تو شکریہ ادا نہ کرنے کا انتقام لیا ہے۔

محترم رؤف خیر صاحب کے مضمون کے مطابق اگر کوئی شخص کہے:''میں خدا کو نہیں مانتا'' تو یہ اُس کا ذاتی عمل ہے اس کا کسی اور سے کیا لینا دینا۔کسی بندے کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ کسی کے دین وایماں کے اقرار وانکار کے مسئلے پر اپنا حکم جتائے۔

رشید حسن خان کے بارے میں یہ کہ اُن کے متن کی قرأت ،کلاسکی ادب کی تفہیم ،صحتِ اِملا،اصولِ

اِملا، اصولِ تدوین، اصولِ تحقیق، اخلاقیاتِ تحقیق، تصوّف اور تحقیق، متنی تنقید، مشرقی شعریات، علومِ بلاغت اور اصولِ اِملا، قواعدِ زبان اور مشرقی شعریات، شاعر اور علومِ بلاغت، وغیرہ ہیں، اُنھوں نے مختلف موضوعات پر ہندو پاک کی یونی ورسٹیوں، سیمیناروں اور اِملائی ورکشاپوں میں ۳۰۵ رلکچر دیے۔ اِس کے ساتھ ہی اُنھیں اُن کے کام پر دہلی ساہتیہ کلا پریشد ایوارڈ، یو۔ پی اردو اکاڈمی ایوارڈ، غالب ایوارڈ، میر ایوارڈ، اکاڈمی لکھنؤ سے اِمتیازِ میر اِعزاز، کراچی سے نیاز فتح پوری ایوارڈ، مہاراشٹر اردو اکاڈمی سے نیشنل ایوارڈ، لاہور سے محمد طفیل ادبی ایوارڈ، دہلی اردو اکاڈمی سے کل ہند بہادر شاہ ظفر ایوارڈ، ہریانہ اردو اکاڈمی سے نیشنل حالی ایوارڈ، بھوپال سے مدھیہ پردیش اردو اکاڈمی ایوارڈ، یو۔ پی اردو اکاڈمی سے مولانا ابوالکلام آزاد ایوارڈ، اور بے حساب اِنعامات سے نوازا گیا۔ انھوں نے تقریباً ۳۰ ر نایاب کتابیں اردو ادب کو دیں۔ جو مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی اور انجمن ترقی اردو ہندو پاک سے شائع ہوئیں۔ وہ اگر یہ سب نہ کرتے تو صرف املا ہی ان کو حیات بخشنے کے لیے کافی تھا۔

''بے سند ہوتے ہوئے مستند سمجھے گئے'' اِس مد میں محترم رؤف خیر صاحب سمجھ لیں، جب رشید حسن خاں کی سروس کے لیے دہلی سے ان کے انٹرویو کے لیے کال لیٹر آیا تو وہ گئے ہی نہیں، سوچا گیا: ''ممکن ہے کہ اُن کو کال لیٹر ملا ہی نہ ہو'' دوبارا کال لیٹر جاری کیا گیا۔ رشید حسن خان پھر بھی نہ گئے۔ وجہ دریافت کرنے پر رشید حسن خان نے بتایا: کال لیٹر میں انٹرویو لینے والے کا نام نہ تھا۔ اِس پر یونی ورسٹی میں ان کا انٹرویو لینے کے لیے کوئی تیار نہ ہوا۔ اس کے ساتھ یہ بھی تھا کہ تقرری کے لیے وہ بے سند بھی تھے۔ اس پر یونی ورسٹی کی کمیٹی نے یہ طے کیا: ''اُن کی تقرری کے لیے نہ تو سارٹی فیکٹ کی ضرورت ہے اور نہ ہی انٹرویو کی۔'' یہ سچ ہے کہ ان کے پاس کوئی ڈگری نہ تھی، لیکن برصغیر ہندو پاک کی شاید ہی کوئی یونی ورسٹی باقی ہو جس میں اُنھیں اردو املا، قواعد زبان و شاعری، اصول تحقیق و تدوین، مشرقی شعریات کلاسکی ادب کی تفہیم، تصوّف، متن کی قرأت اور لُغت کی ترتیب و تدوین پر لکچر دینے کے لیے مدعو نہ کیا گیا ہو۔ ہندستان کی مختلف یونی ورسٹیز میں اُنھیں ایم فل اور پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کے مقالات کا ممتحن بنایا جاتا رہا۔ وہ مستندیوں ہی نہیں سمجھے گئے، ان کے کام نے اُن کو مستند کیا۔ رہی مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کے کروڑوں کے نقصان کی بات۔ انھوں نے تو (علی گڑھ تاریخ ادبِ اُردو) میں ہونے والی خامیوں کی اپنے مضمون میں نشان دہی کی تھی اور وہ مضمون ماہ نامہ تحریک دہلی ماہ اکتوبر ۱۹۶۳ء میں شائع ہوا تھا۔ ان خامیوں کو کمیٹی نے محسوس کیا، اسی لیے علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے وائس چانسلر نے اس کتاب کے سبھی نسخے بازار سے واپس لے کر پروجیکٹ ختم کر دیا۔

یہاں یہ بھی کہ مرزا غالبؔ نے 891،شبلی نے 1119،اقبالؔ نے 1450 اور رشید حسن خان نے 1827 خطوط لکھے۔اوروں کے خطوط میں اِدھر اُدھر کا بھی ذکر ہے،لیکن رشید حسن خان کے سارے خطوط ادبی ہیں۔

''پروفیسر گیان چند جین نے رشید حسن خان کو'خدائے تدوین''،پروفیسر رفیع الدّین ہاشمی(لاہور،پاکستان)خاتم المدوّنین)اورشان الحسن حقّی(کراچی ،پاکستان)نے''اردو میں اصولِ تدوین کا مُجدّ د'' کہا ہے۔''تو یہ تھے رشید حسن خان۔

محترم رؤف خیر صاحب کے اِس مضمون کے بارے میں میرے دریافت کرنے پر مدیر احمد نثارؔ صاحب نے بتایا تھا:''مضمون پڑھ کر شائع کیا ہے۔''مضمون سے صاف عیاں ہے کہ رشید حسن خان کے محترم رؤف خیر صاحب کا شکر یہ ادا نہ کرنے سے بھڑک کر بغض وکینہ،حسدوانتقام کی بدبو سے بھبکتا دوسروں کی پگڑی اچھالنے کے لیے محترم رؤف خیر صاحب نے لکھا ہے یہ مضمون۔غیر مطبوعہ کی اشاعت کا عزم رکھنے والے مدیر احمد نثارؔ صاحب نے شائع ہی کیوں کیا مطبوعہ اور ایسا شاطرانہ مضمون؟''مضمون سے چھڑنے والی بحث سے رسالے کی تشہیر کے لیے..؟گروپ بندی کے تحت....؟محترم رؤف خیر صاحب سے ذاتی تعلقات کے بِنا پر....؟یا پھر ایک ڈاکٹر ہونے کی دھمک میں....؟''

حنیف سیّد(آگرہ)9319529720

بھائی عزت مآب جناب احمد نثار صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

ماشاء اللہ آپ کا سہ ماہی کتابی رسالہ جولائی تا ستمبر ۲۰۲۱ء اپنے مقررہ وقت میں قارئین کی خدمت میں حاضر ہے اس عنایت کرم فرمائی اور نوازش کے لئے آپ دعاء کے مستحق ہیں۔آپ کے رسالے سے ذاتی طور پر بالخصوص میں بہت متاثر ہوں کہ اس دور میں جہاں سو صفحے کا رسالہ نکالنا لوگوں پر بہت بھاری پڑتا ہے وہیں آپ تین سو صفحات سے زائد پر مشتمل رسالہ نکالنے میں کامیاب ہیں۔

حسب دستور رسالہ کا آغاز حمد باری تعالیٰ سے ہوا ہے۔حمد پیام سعیدی کی تخلیق ہے اس کی سرخی کا کیا کہنا سیدا لاستغفار سے ماخوذ ہے(اللھم انت ربی خلقتنی و انا عبدک)ترجمہ : اے اللہ تو میرا رب ہے تو نے مجھے پیدا کیا اور میں تیرا بندہ ہوں۔

پوری حمد حمد کے لائق ہے اس شعر میں محمود کا پورا خلاصہ آگیا ہے۔

قدر میں نے تری نہیں جانی
پھر بھی تونے بھرم رکھا میرا

حمد میں انکساری، خاکساری اور عاجزی کے ساتھ اعتراف گناہ اور اعتراف کمی وکوتاہی ہوتی ہے اور اس میں یہ ساری باتیں بدرجہ اتم موجود ہیں۔

حمد باری تعالی کے بعد دوسرے نمبر پر ضیاء فاروقی صاحب کی نعت پاک کو جگہ ملی ہے میرا تو ماننا ہے جس چیز کو نسبت رسول حاصل ہو جائے وہ چیز فانی ہوتے ہوئے بھی لافانی ہو جاتی ہے۔ وہی عظمت اور مرتبہ اس نعت پاک کو بھی حاصل ہے۔

کسی بھی رسالہ یا اخبار کی جان ہے اداریہ اداریہ سے ہی رسالہ کا معیار مرتبہ اور وزن کا پتہ چلتا ہے یہی حال عالمی فلک کا ہے جس طرح سے احمد نثار صاحب کی شخصیت باوزن ہے اسی طرح ان کا اداریہ بھی متوازن ہوتا ہے۔ تین صفحے کے اداریہ میں پہلے کرب والم میں ڈوب کر کورونا کے دورانیہ میں داغ مفارقت دینے والے کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ بیس پچیس ناموں کو باضابطہ گنوایا ہے اس کے بعد کئی قومی مسئلوں کو اٹھایا ہے جو مسلمانوں کے خلاف موجودہ حکومت کرنے کے لئے کوشاں ہے جس میں احمد نثار صاحب نے بڑا اچھا یہ تجزیہ پیش کیا ہے کہ قدرتی وائرس کے مقابلے میں مصنوعی وائرس زیادہ خطرناک اور مہلک ثابت ہو رہا ہے جس میں خاص طور سے ذات پات کی عصبیت سماجی عدم مساوات، طبقاتی استحصال، نسلی وجنسی بھید بھاؤ، مذہبی منافرت اور فرقہ پرستی کے وائرس اور ایک نئی فکری وائرس کا بھی ذکر کیا ہے جو ہمارے علمی تاریخی اور ادبی وراثت کو از سرے نو ترتیب دینے کی کوشش جاری ہے۔

مضامین کے باب میں پروفیسر قدوس جاوید نے مشرف عالم ذاتی کے افسانے اور ناولوں کا بھرپور تجزیاتی مطالعہ مفصل انداز میں پیش کیا ہے جو بڑھنے سے تعلق رکھتا ہے مجھے ایسا لگتا ہے کہ ذوقی صاحب کے انتقال کے بعد یہ پہلا تنقیدی مضمون ہے جو ان کی تخلیقات کا احاطہ کئے ہوئے ہے جو بعد میں مشرف عالم ذوقی صاحب پر کام کرنے والوں کے لئے مدد فراہم کریگا۔ پروفیسر احمد سجاد صاحب رانچی یونیورسٹی سے سبکدوش ہیں ان کی حیثیت استاذالاساتذہ کی ہے وہ ایک طرف جماعت اسلامی کے داعی کبیر ہیں تو دوسری طرف دوادب کے مایہ ناز شخصیت ابولمجاہد زاہد کے آخری شعری مجموعہ ''ید بیضا'' کا مطالعہ پیش کیا ہے خالص اسلامیات کا رنگ لئے ہوئے ہے اس مضمون کو سمجھنے کے لئے کلام پاک پر گہری نظر کی ضرورت ہے لاجواب ہے ڈاکٹر صفدر امام قادری نے سلطان اختر کی غزل کو اپنا موضوع بحث بنایا ہے اس مضمون کو مقالہ کا درجہ حاصل ہے بہت اچھی کوشش ہے۔ تقریباً چالیس صفحات پر محیط ہے کسی رسالے میں ایسے مضمون کا ہونا رسالہ کو چار چاند لگانے کے لئے کافی ہے، ڈاکٹر فخر الکریم نے پریم چند شناسی کے نام سے تحریر پیش کی ہے ''زمانہ'' نے پریم چند نمبر شائع کیا تھا اس نمبر کو پریم چند شناسی میں دستاویزی حیثیت حاصل ہے اسی نمبر کا ڈاکٹر کریم نے نچوڑ اور حاصل عوام کی عدالت میں پیش کیا

ہے نثر میں پریم چند کو وہ مقام حاصل ہے جو شاعری میں غالب کو پریم چند کو جاننے کے لئے یہ مضمون سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس سے مضمون کی گہرائی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

بہر حال احمد نثار صاحب کی یہ کوشش کہ ملک کے قابل قدر اور لائق اعتبار نقاد اور قلم کاروں کو خواہ وہ نثر کے ہوں یا شاعری کے ہوں۔ منتخب کرتے ہیں اگر یہ معیار برقرار رہا تو ہم امید کرتے ہیں کہ ان شاء اللہ رسالہ ترقی کرتا رہیگا۔

ڈاکٹر عبدالمتین، شعبۂ اردو، کوکلا نچل یونیورسٹی، دھنباد

احمد نثار کی عنایت کردہ تحقیقی اور تخلیقی ادب کا ترجمان سہ ماہی رسالہ ''عالمی فلک'' کا تیسرا شمارہ (اپریل تا جون 2021) پیش نظر ہے۔ جریدہ نہایت ضخیم اور خوبصورت ہے جو اپنے مشمولات اور ترتیب و تدوین کے لحاظ سے اعلیٰ و معیاری رسالوں کی صف میں رکھے جانے کے قابل ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ''عالمی فلک'' مدیر موصوف کی مدیرانہ بصیرت کی منہ بولتی تصویر ہے۔ رسالے کے اس سے قبل دو شمارے منظر عام پر آ چکے ہیں۔

پہلا شمارہ یعنی افتتاحی شمارہ (اکتوبر تا دسمبر 2020) جسے ہم موصوف کی صحافتی کارکردگی کا اولین نمونہ کہہ سکتے ہیں۔ 320 صفحات پر مشتمل یہ شمارہ اپنے اندر ۱۷/مضامین، ۱۰/افسانے، ۶/افسانچے، علاوہ ازیں ۲۹/ شعراء کی تخلیقات کے ساتھ مدیر احمد نثار کی غزلیں بھی شامل ہیں۔ انشائیہ، طنز و مزاح کے ساتھ ساتھ دوسری زبانوں کی تخلیقات کو بھی جگہ دی گئی ہے۔ جس میں ھندی ادب کے مشاہیر قلم کاروں کی تخالیق کے ترجمے قابل ذکر ہیں۔ آخر میں تین کتابوں پر تبصرے، مشمولہ مصنفین کی دلجوئی کیلئے ایک گراں قدر کاز سے کم نہیں۔

دوسرا شمارہ (جنوری تا مارچ 2021) کی اشاعت ہے اور اپنی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے مدیر موصوف نے اس شمارے کو بھی 320 صفحات پر ہی محیط رکھا ہے۔ اس شمارے میں نو مضامین اور فکشن کے باب میں ۱۰/ادباء کی تخالیق شامل ہیں۔ علاوہ اس کے منظومات، انشائیہ اور دوسری زبانوں کے تراجم، کتابوں پر تبصرے اور مکتوب کا کالم بھی شامل ہے۔ اداریہ میں مدیر احمد نثار نے اپنے پُرعزم ارادے کو یوں رقم کیا ہے :

> ''ہم اپنی آئندہ اشاعتوں میں اکیسویں صدی میں شعر و ادب کے عصری مسائل کے حوالے سے مکالموں کا سلسلہ شروع کرنے کے بھی خواہشمند ہیں تاکہ ان مکالموں کے حوالے سے ادیب و قاری کے درمیان فکری و نظری تفاعل کی راہ ہموار ہو سکے اور معاصر ادبی جہات کی سمت کے تعین پر ہم غور کر سکیں۔'' ص/11

تیسرا شمارہ گویا تازہ شمارہ بھی اتفاق سے 320 صفحات کی ضخامت سے اٹا پڑا ہے جسمیں حمد باری تعالیٰ (ارشد مینا نگری) اور نعتیں (علی عباس امید اور ظفر اقبال ظفر) کے علاوہ ۸/مضامین اور فکشن کے حصے میں ۱۰/

افسانے اور ایک ناول کا باب شامل ہے۔

مضامین کے باب میں جاں نثار اختر کی شاعری پر علی احمد فاطمی کے چند خیالات حاضر ہیں۔ علی احمد فاطمی اپنی گراں قدر تحقیق میں لکھتے ہیں :

''جاں نثار اختر کی شاعری اور ان کی جاں نثاری اور ان کی یادآوری ایک فطری عمل ہے اور فکری عمل بھی...... ایک ایسی شاعری جہاں سارے تصادمات، تضادات، ابہام منکشف ہوتے نظر آتے ہیں اور غزل کا ساز نالۂ ماتم میں تبدیل ہو کر نالہ اور ماتم دونوں کو ایک نئی شعریات اور جمالیات میں ڈھال دیتا ہے۔'' ص/25

دوسرا مضمون ''ادب کی صنفی شناخت کا مسئلہ'' کے موضوع پر یعقوب یاور کی پُرمغز تحریر سات صفحات پر محیط ہے یہاں یعقوب یاور رقم طراز ہیں :

''فن انسانی کمالات کے شعوری اظہار کا ایک ایسا عظیم اور حیرت انگیز وسیلہ ہے جس کی رسائی اس کے لاشعور تک ہوئی ہے۔ انہیں افہام و تفہیم کی غرض سے الگ الگ ناموں سے موسوم کیا گیا ہے دیکھا جائے تو مختلف فنون کی تشکیل و تسمیہ کا جواز بھی کم و بیش وہی ہے جو ہر انسان کو الگ الگ نام دینے کا جواز ہو سکتا ہے ظاہر ہے اس کا مقصد کسی تخلیق کی انفرادی شناخت کا قیام ہے۔'' ص/30

تیسرا مضمون ڈاکٹر رؤف خیر کا تحریر کردہ ہے۔ موصوف نے یہاں رشید حسن خاں کی ادبی خدمات کا احاطہ مشاہیر کے خطوط کے حوالے سے کیا ہے۔ رشید حسن خاں خدا کو نہیں مانتے تھے۔ جنت سے انکار کرتے تھے۔ صیام و قیام کا مذاق اڑاتے تھے۔ اس سلسلے میں رؤف صاحب لکھتے ہیں :

''خان صاحب خدا کے قائل تو تھے نہیں ساتھ ہی جنت کو بھی غالب کی طرح تفنن طبع کے طور پر نہیں بلکہ سنجیدگی سے خیالی قرار دیتے ہیں'' ص/38

اس کے بعد چوتھا مضمون خورشید اکرام صاحب کی جانفشانی کا ثمرہ ہے جہاں موصوف نے بنگالی زبان کے نوبل انعام یافتہ شاعر، فلسفی اور افسانہ و ناول نگار رابندر ناتھ ٹیگور ''ٹیگور کی کہانیاں: مسرت سے بصیرت تک'' کی روشنی میں مضمون قلم بند کیا ہے خورشید اکرام ادب میں محتاج تعارف نہیں۔ موصوف نے بنگال کی معروف و مقبول شخصیت کو اپنے احاطۂ تحریر میں لائے ہوئے عرض کیا ہے :

''ٹیگور کا شعور انسانی دردمندی کے جذبے سے معمور تھا۔ ٹیگور کے ذہن نے انسانی قدروں کی ایک ایسی وسیع، منصفانہ دنیا قائم کی تھی جس میں اگر ایک عورت کے لئے جگہ تھی تو مرد کیلئے بھی۔ وہ انسان کے جینے کیلئے مناسب دنیا کے خواہاں تھے، ایک شریف اور مہذب سماج کی تشکیل چاہتے تھے۔ محبت اور بھگتی سے بھرے ریاضت سے پُر لیکن مکروریا اور خباثت سے خالی سماج کے تمنائی تھے۔ وہ سماج کو اس کی وسعت اور تنوع کے ساتھ دیکھتے دکھاتے تھے''۔ ص/56

پانچواں مضمون حیدر وارثی کی زندہ جاوید تحریر ہے جس میں انھوں نے صوفیانہ شاعری کی عبقری شخصیت، بیدم وارثی کو موضوع سخن بنایا ہے۔ بیدم تصوف کے ممتاز شعراء میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں جہاں حیدر وارثی کے سلسلے میں موصوف رقم طراز ہیں :

''ان کی شخصیت، تصوف کے جہان میں عبقری کی حیثیت رکھتی ہے۔ انہوں نے تصوف کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ حضرت بیدم وحدۃ الوجود کے سراپا پیکر رہے۔ فقر ان کی شخصیت کا حصہ تھا۔ وہ عشق و محبت کے جذبوں سے معمور رہے ہیں''۔
ص/65

اس کے بعد کے پائیدان پر الیاس احمد گدی کے افسانہ ''شناخت'' پر ایک تجزیاتی مطالعہ شامل ہے'' فائیر ایریا'' کے خالق الیاس احمد گدی بہار کے ہی نہیں بلکہ اردو کے نامور فکشن نگاروں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ غیاث احمد گدی اور الیاس احمد گدی دونوں برادران بہار کے اردو افسانے میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ الیاس صاحب کا یہ افسانہ ''شناخت'' فلمی رسالہ ماہنامہ ''شمع'' دہلی کے کہانی نمبر میں 1980 میں شائع ہوا تھا۔

ساتواں مضمون محمد حنیف خاں کا ''اللہ میاں کا کارخانہ'' کے فنی اوزار ہے اور آخری مضمون بنگال کے نمائندہ افسانہ نگار ''صدیق عالم سے چند سوالات'' پر مشتمل ہے جو انیس صفحات پر محیط ہے جسے پاکستان کی نورینہ اکرم نے رقم کیا ہے۔ انٹرویو کی صورت پیش خدمت ہے جس کے مطالعے سے صدیق عالم کے فن اور ان کی شخصیت کے بعض پوشیدہ حقائق سے روشناس ہونے کا موقع ملتا ہے۔

اس کے بعد فکشن کے باب میں کل ۱۰ افسانے اور احمد صغیر کا ایک ناول ''خواب تماشہ'' کا پہلا باب شامل ہے۔ افسانے کے باب میں سب سے پہلے حسین الحق کا افسانہ ''اندھیرے کی کوکھ سے'' مطالعہ کی دعوت دیتا

ہے۔ حسین الحق اردو کے معروف فکشن نگار ہیں۔ فکشن کی دنیا میں موصوف اپنی الگ طرز تحریر کی وجہ کر پہچانے جاتے ہیں۔ ''اندھیرے کی کوکھ سے'' شمارے میں شامل افسانہ کو ہم حسین الحق کا ایک عمدہ اور نمائندہ افسانہ کہہ سکتے ہیں۔ افسانہ نگار کے ذہنی دریچوں سے جو واقعات وا ہوئے افسانوی شکل اختیار کر گئے۔ افسانہ کیا ہے؟۔ افسانہ دراصل زندگی کی اتار چڑھاؤ کا مفصل بیان ہے۔ موصوف کا یہ افسانہ اسی قبیل کی ایک کڑی ہے۔ افسانے کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے:

> ''مدتوں بعد وہ شہر کے اسٹیشن پر اترا تو گڑبڑا گیا، شک ہوا کہ کسی دوسرے اسٹیشن پر تو نہیں اتر گیا۔ زمین کے ہر حصے کو موزیک سے خوب صورت بنا دیا گیا تھا۔ پہلے صرف ایک ویٹنگ شیڈ ہوا کرتا تھا، اب دونوں طرف دو دو ویٹنگ رومس تھے۔ پل پار کرنے کیلئے خود بخود چلتے رہنے والی برقی سیڑھیاں تھیں، ہر دیوار پر ٹائلس تھے، ایک بڑا سا پارکنگ شیڈ بھی موجود تھا۔ کچھ دور آگے بڑھ کر اسٹیشن کے نام پر نگاہ کی تب اطمینان ہوا کہ ہاں وہ صحیح جگہ اترا۔'' ص/122

تبدیلی یوں تو اس صدی کا مقدر ہے۔ ان تبدیلیوں کو حسین الحق کی جادو بیانی نے حیات جاوداں عطا کر دی۔

جریدے میں شامل دوسرا افسانہ ''سنگھاردان'' کے خالق شموئل احمد کا تازہ افسانہ ''چاک دامنی'' شامل ہے، شموئل احمد کا شمار اردو کے چند معروف افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ زیر مطالعہ افسانہ ''چاک دامنی'' میں نسائی قلم کار پر مرد فن کار کی شدت پسندی کی داستان رقم ہوئی ہے۔ افسانے کا نقطۂ عروج 'امیتابھ بچن اور جیئے بھادوری کی داستان عشق پر مبنی قلم ''ابھیمان'' کی یاد دلاتا ہے لیکن شموئل احمد عصر حاضر کے مشاق قلم کار ٹھہرے لہٰذا انھوں نے یہاں اپنے مخصوص انداز بیان اور منفرد منظر آفرینی کو اپنی دلفریب تحریروں سے افسانے کے سانچے میں ڈھالا ہے موصوف افسانے میں مکڑی کے جالے کا سہارا لیکر اساطیری طرز بیان کی عمدہ مثالیں قائم کی ہیں۔

یوں بھی عورتوں کے باب کا اگر تاریخی پس منظر دیکھیں تو اندازہ ہوگا کہ مردوں کے مقابلے میں ان کی حیثیت حاشیائی رہی ہے۔ معاشرے میں مردوں کی ہی بالا دستی رہی ہے جیسا کہ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ ایک جگہ لکھتی ہیں:

> ''ہندوستان میں صنف نازک سے تغافل پرانی روایت ہے۔ ہندوستانی مردوں نے

زندگی کے ہر ایک شعبے میں اسے پس پشت ڈالا۔اس کی ذہنی قوت کو بھی ترقی نہیں دی۔''

شموئل نے افسانے کے اختتام پر عورت کے جذبۂ ایثار کو نہایت ہی فنکارانہ انداز میں قلم بند کیا ہے ملاحظہ کیجئے افسانہ کا یہ اقتباس :

''طالب مہدی سگریٹ کے کش لینے لگا۔کچھ دیر بعد فرزانہ حمام سے نکلی تو آنکھیں سرخ ہورہی تھیں۔ چہرہ سوجا ہوا تھا۔ وہ خاموشی سے بستر پر آکر لیٹ گئی اور آنکھیں بند کرلیں۔ دھند آہستہ آہستہ نگاہوں میں پھیل رہی تھی ......گھر نہیں ٹوٹے گا......وہ ہمیشہ کے لئے ......مکڑی کے جالے کو ختم کردیگی......فرزانہ نے کھڑکی بند کی ،کونے کا جالہ صاف کیا۔ساری کتابیں اور رسائل الماری سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالے جن میں اس کے افسانے اور تبصرے شائع ہوئے تھے۔انھیں فرش پر یکجا کیا اور آگ لگادی۔''

ص/ 134

یہاں افسانہ نگار کے مرد کردار پر قاری کو غصہ یقیناً آئے گا۔مگر یہی برہمی اور نفرت افسانے کی کامیابی کی دلیل ہے۔

اس کے بعد ثروث خان کا افسانہ ''بوائے فرینڈ'' اپنی جدت طرازی سے قاری کو اپنی طرف کھینچا ہے افسانے کے ابتدائی جملے اگر قاری کو اپنی گرفت میں مقید کرنے میں کامیاب رہے تو آخری قرأت تک قاری اس سے فرار حاصل نہیں کرسکتا۔ اور یہ خوبی ثروث خان کی تحریر میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ افسانے کا کلائمکس پڑھنے والے کو دم بخود کردیتا ہے ملاحظہ کیجئے افسانے کا یہ اقتباس :

''آخر جیسے تیسے زخمی حالت میں، میں نے اپنے بیڈروم کا دروازہ کھولا تو دیکھا، مسند پر کوئی نہیں تھا۔کھڑکی کا ریشمی پردہ ہلکی ہوا سے ہولے ہولے ہل رہا تھا......اندروکرم بے ہوش پڑا تھا،اس کے سر سے خون بہنا جاری تھا۔''ص/ 144

اس کے بعد کے پائیدان پر ''یادوں کے سمندر'' گیا کے معروف فکشن نگار سید احمد قادری کا افسانہ ہے یہاں خان مرزا بہادر کی حویلی کی داستان رقم ہے جو کئی پستوں پر محیط ہے اور زمانے کی گرد و پوش میں دبی ہے۔اس کہانی میں رومان کی تپش بھی ہے اور جھلستی ہوئی زندگی کا اظہار بھی۔ یادوں کے سمندر میں غوطہ زن قاری کو افسانے کی تہہ سے یقیناً آبگینہ ملے گی۔

اس کے آگے صفحات پر احمد صغیر کے ناول ''خواب تماشا'' سے ماخوذ ایک ٹکڑا شامل ہے احمد صغیر اردو ادب میں محتاج تعارف نہیں۔ ذیل کے اقتباس سے موصوف کے فن پر ماہرانہ گرفت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے :

''صائمہ' کیا ہوا...... آپ کا چہرہ اچانک مرجھا گیا۔' آپ کے جانے کے بعد میرے بغل میں ایک لڑکی آکر بیٹھی جو چاٹ کھا رہی تھی وہ مجھے غور سے دیکھتی رہی جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔ پھر اچانک سے اس نے کہا کہ آپ مسلمان ہیں۔ اس لئے آپ کے بغل میں نہیں بیٹھ سکتی اور اٹھ کر چلی گئی۔'' ص/172

چھٹے مقام پر خورشید حیات کا جدید افسانہ ''آدم خور'' مطالعے کے لئے حاضر ہے۔ خورشید حیات ایک کامیاب افسانہ نگار ہی نہیں بلکہ ایک پختہ شاعر اور اعلیٰ معیار کے ناقد بھی ہیں۔ زیر بحث افسانہ ''آدم خور'' جدید لب ولہجہ سے مرصع ایک معیاری افسانہ ہے۔ آج کے معاشرے کی ترجمانی کیلئے موصوف نے علامتوں کا سہارا لیا اور سماج کی جراحی کے عمدہ نمونے پیش کئے۔

اس کے بعد حنیف سید کا افسانہ محور: اپنا اپنا اور سیمیں کرن' پاکسان کا افسانہ' دوآبہ بھی رسالے کو وقار بخشتا ہے۔ فکشن کے باب میں نواں افسانہ ''کٹے ہاتھوں کا سفر'' بنگال کے نمائندہ افسانہ نگار سلیم سرفراز کا شامل ہے۔ سلیم سرفراز کے بیشتر افسانوں کا مقصد سماجی اور معاشرتی زندگی کی تلخ حقیقتوں کو پیش کرنا ہوتا ہے۔ سلیم سرفراز کے یہاں افسانوں میں علامت، موضوع خیال کی وسعت اور ترسیل کا عمدہ وسیلہ نظر آتا ہے۔ ''کٹے ہاتھوں کا سفر'' سلیم سرفراز کا ایک عمدہ اور معیاری افسانہ ہے۔

اس کے بعد اعجاز روشن، پاکستان کا افسانہ ''عوام ایکسپریس'' اور آخری افسانہ ڈاکٹر رشید جہاں انور کا ''زندگی: چائے کی خوشبو'' بھی معیاری افسانے ہیں جس سے رسالے کی اہمیت میں مزید اضافہ ہوتا ہے۔ مشمولہ تمام افسانے اردو ادب میں خصوصاً فکشن کے باب میں گراں قدر اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

منظومات کی فہرست بھی طویل ہے یہاں کل ۲۵ رشعراء کی تخلیقات کو جگہ دی گئی ہے جو ایک انتخاب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اردو کے معروف شعراء کی شمولیت سے رسالہ کافی وزنی ہوگیا ہے۔ علاوہ ازیں جریدے میں سرور حسین کا انشائیہ بعنوان ''دائرہ'' بھی شامل اشاعت ہے۔ دوسری زبانوں کے تراجم بھی اردو قاری کی خدمت میں استفادے کیلئے پیش کئے گئے ہیں۔ تبصرے اور مکتوبات کیلئے بھی مدیر موصوف نے جگہ نکالی ہے۔ مکتوبات جو دراصل رسالے کی قدر و قیمت سے آگاہی کا سبب بنتے ہیں۔ جیسا کہ نذیر فتح پوری کے اس مکتوب سے ظاہر ہے :

”مختلف موضوعات پر نو مضامین شمارے میں شامل ہیں۔ ہر مضمون اپنے آپ میں بھرپور معلومات کا خزانہ سمیٹے ہوئے ہیں۔ افسانے اور ناول بھی عصر حاضر کی نمائندگی کرتے ہیں۔ انشائیہ، ترجمے، تبصرے، منظومات، مکتوبات تمام کے تمام لائق مطالعہ ہیں۔ سابقہ شماروں کی طرح زیر مطالعہ شمارہ بھی وقیع و رفیع ہے۔ مبارک باد۔“ ص/309

ڈاکٹر عشرت بیتاب (آسنسول)

نیک خواہشات کے ساتھ

محمد حدیث

امیر مقامی

جماعت اسلامی، دھنباد

سہ ماہی **"عالمی فلک"**

بہت چنندہ موضوعات شامل کر کے ایک خوبصورت کتاب کی شکل میں جناب احمد نثار دوستوں اور عزیزوں کو پڑھنے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔

اس خدمت کے لئے ناچیز کی طرف سے **نیک خواہشات اور دلی مبارک باد۔**

ڈاکٹر محمد شمشاد عالم (علیگ)

سینئر پرنسپل سائنسداں

Dr. Md. Shamshad Alam

Sr. Principal Scientist

CSIR-CIMFR,

Barwa Road, Dhanbad-826001 (Jharkhand)

Oct. to Dec. 2021 Title Code : JHAURD00107

Quarterly Book Series-5

Aalami Falak

Mohammad Ali Road, City Colony, P.O. 'B' Polytechnic
Dhanbad, Jharkhand-828130 (India)

Editor : Ahmad Nesar ₹ 300/- Sub-Editor : Afreen Fatma

"امتیاز غدر نے مردم شماری کا موضوع اٹھایا تو میں یہ سوچ کر خوش ہو گیا کہ اردو میں کبھی بھی اس موضوع کو برتنے کا خیال کسی کو نہیں آیا۔" "امتیاز غدر نے بستی کے بدنصیب خاندان کا جو المیہ پیش کیا ہے وہ قابلِ تحسین ہے۔" "میں امتیاز غدر کی پہلی کوشش کو سلام کرتا ہوں۔" **مشرف عالم ذوقی**

علی پور بستی

امتیاز غدر

کا ناول
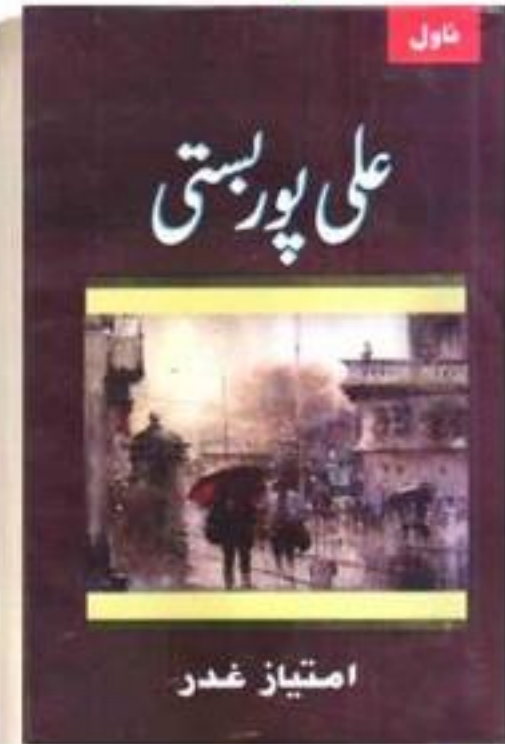
• قیمت : -/300 • صفحات : 205

پیچھے چھوٹتے لوگ

(افسانچے)

• قیمت : 250 • صفحات : 160
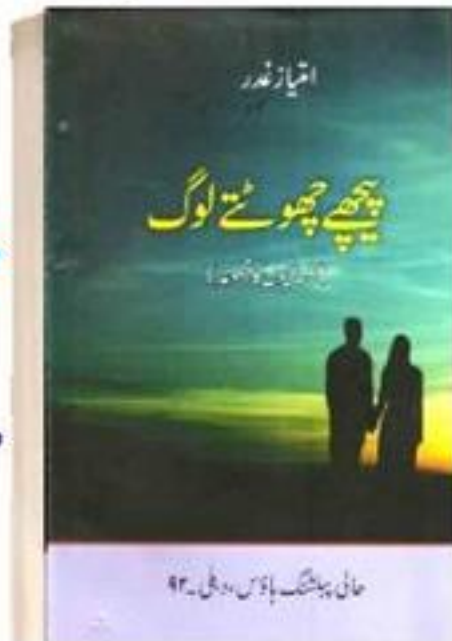
- امتیاز غدر نے علی پور بستی جیسا ناول لکھ کر اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا جواز پیش کیا ہے۔ **سلیم انصاری**
- امتیاز غدر کے افسانچے ہمیں غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں۔ **ڈاکٹر اسلم جمشید پوری**

رابطہ : امتیاز غدر، آزاد نگر، گوموہ، دھنباد، جھارکھنڈ-828401 موبائل : 7033265265

FALAK PUBLICATION
Email : aalamifalak@gmail.com
+91 8409-24-2211
aalamifalak@gmail.com

ISBN 978-81-947181-2-3

خریداری کے لیے اسکین کیجیے